ہفت تماشا

یعنی اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی کی ہندوستانی معاشرت
پر سب سے زیادہ جامع اور نہایت اہم ماخذ کا سلیس اُردو ترجمہ،
مصنفہ دیوانی سنگھ کھتری، ساکن بٹالہ ضلع گورداسپور۔ المعروف بہ

مرزا محمد حسن قتیل

مترجمہ
ڈاکٹر محمد عمر
اُستاد شعبۂ تاریخ، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی،

ناشر
مکتبہ بُرہان، اردو بازار، دلّی ۶

Www.MadaariMedia.Com

دم مدار
بیڑا پار
MADAARI MEDIA
The Silsila e Aaliya Madaariya Social Platform

سلسلۂ مداریہ کے بزرگوں کی سیرت و سوانح
سلسلۂ عالیہ مداریہ سے متعلق کتابیں
سلسلۂ مداریہ کے علماء کے مضامین تحریرات
سلسلۂ مداریہ کے شعراء اکرام کے کلام

حاصل کرنے کے لئے اس ویب سائیٹ پر جایئے

www.MadaariMedia.com

@MadaariMedia
@MadaariMedia
@MadaariMedia
@MadaariMedia

Authority : Ghulam Farid Haidari Madaari

طبع اوّل ۱۰۰۰

اپریل ۱۹۶۸ء

قیمت غیر مجلد

قیمت مجلد 15/-

مطبوعہ

یونین پرنٹنگ پریس ۔ دہلی ۔

جملہ حقوق طبع محفوظ ہیں.

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ
دیباچہ	۷
مقدمہ	۱۱
باب اوّل :-	۵
باب دوم :-	۲۵
باب سوم :-	۳۷
باب چہارم :-	۷۵
باب پنجم :-	۹۵
باب ششم :-	۱۲۹
باب ہفتم :-	۱۷۹

انتساب

اپنے محترم اُستاد

پروفیسر خلیق احمد نظامی کے نام

جن کے فیضانِ نظر سے اس ناچیز پر

تاریخ و تصوّف کے اسرار کھلتے رہتے ہیں۔

خاک نشیں

محمد عمر

پیش لفظ

اس ملک کی تاریخ بلامبالغہ ہزاروں سال پُرانی ہے۔ یہاں کے لوگوں نے زندگی کے ہر ایک شعبے میں قابلِ فخر کارنامے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ صرف تصنیفی میدان ہی کو لیجئے، تو معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندوستان میں علم و ادب کی مختلف شاخوں میں بڑی قیمتی اور بلند پایہ کتابیں لکھی گئیں: مذہب، الٰہیات، ریاضیات، ہیئت، طب، ڈراما، شعر، افسانہ ——— غرض علم کی تمام اصناف میں ایسی ایسی اور اتنی کتابیں دستیاب ہوئی ہیں کہ ساری دُنیا یہاں کے تہذیب و تمدّن اور فنون میں ترقی کا لوہا مان گئی ہے۔

لیکن ان وسیع تحریری سرگرمیوں میں اگر کسی چیز کی کمی ہے، تو سیاسی تاریخ کی۔ تعجب ہوتا ہے کہ یہاں کے باشندوں نے زندگی کے اس حد درجہ اہم حصّے کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ سکندر یونانی کے معاصر حکمران خاندانوں سے قبل کی تاریخ مرتّب کرنے میں ہمیں پُرانوں پر انحصار کرنا پڑا ہے۔ اور پُرانوں کی جو نیم تاریخی، نیم افسانوی، نیم خرافاتی حیثیت ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں ہے۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں ہے کہ پُرانوں میں بہت سے تاریخی واقعات، اُن سے بھی زیادہ غیر تاریخی حالات کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ اسی طرح کئی تاریخی شخصیتوں کے نام کے ساتھ بہت سی غیر تاریخی اور دیومالائی ہستیوں کے نام بھی زیبِ داستان کے لیے شامل کر دیے گئے ہیں۔ اس بے ترتیب انبار میں سے تاریخ اور افسانے کو الگ الگ کرنا .... اُتنا ہی مشکل ہے، جتنا کسی سوکھی گھاس کی کال کوٹھری میں سے سوئی کا تلاش کرنا۔

لیکن یہ بات صرف سیاسی تاریخ کی حد تک درست ہے۔ اگر ہم شاہی خاندانوں اور اُن کے افراد اور اُن کے شجرۂ نسب اور تاریخوں سے قطعِ نظر کرلیں اور صرف تہذیب و

تمدن کی تاریخ مدوّن کرنا چاہیں، تو اس پہلو سے اتنا مواد موجود ہے کہ حیرت ہوتی ہے، انسان کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس میں سے کون کون سی چیز لے لے، اور کسے نظر انداز کر دے۔

اس کے برعکس اسلامی عہد میں سیاسی تاریخ کے سوائے اور کچھ ہے ہی نہیں، مسلمانوں نے اس ملک میں آنے کے پہلے دن سے تاریخ نویسی پر خاص توجہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج ہر ایک مسلمان حکمران خاندان کی مکمل تاریخ دستیاب ہو جاتی ہے۔ عموماً ہر ایک اہم بادشاہ کے عہد میں ایک نہ ایک رسمی یا غیر رسمی مؤرخ ایسا رہا ہے، جس نے اگرچہ اپنے سے پہلے زمانے کے حالات پر بھی کافی توجہ کی، لیکن خاص طور پر معاصرانہ واقعات پوری تفصیل سے قلم بند کر دیے، یہی وجہ ہے کہ اس ایک ہزار برس کے تقریباً ہر ایک واقعے کی تاریخ بقیدِ ماہ و سال محفوظ ہو گئی ہے۔ لیکن یہاں ہم ایک اور حیرتناک حقیقت سے دوچار ہوتے ہیں یعنی مسلمان مؤرخوں نے اپنی تمام تصنیفی صلاحیتوں کو حکمرانوں اور ایوانِ حکومت اور درباری امرا تک محدود رکھا۔ یہ کہیں سے معلوم نہیں ہوتا کہ ان دس صدیوں میں یہاں کے لوگوں کی روزمرّہ کی زندگی کیسی تھی؛ اُن کی خوشی اور غمی کے مواقع پر رسم و رواج کیا تھے؛ وہ کن مسائلِ حیات سے دوچار تھے، اور انھیں حل کرنے کے لیے انھوں نے کیا تگ و دو کی۔ مسلمان مصنّف اِن امور سے متعلق بالکل خاموش ہیں، حالانکہ یہ ناممکن ہے کہ پورے ملک کی زندگی صرف دربارِ شاہی میں محدود ہو کے رہ گئی ہو، اور شاہی محلوں اور امرا کی حویلیوں کے باہر نبضِ حیات نے چلنا بند کر دیا ہو۔

دوسرے لفظوں میں، اگر ہندوؤں نے اپنی تمام توجّہ تہذیب و تمدّن کے بیان پر مرکوز کر دی اور سیاسی تاریخ کو اپنے غور و فکر کا موضوع بنانے کی زحمت نہیں اٹھائی، تو اس کے بالعکس مسلمان مؤرخ دوسری حد پر پہنچ گئے ——— انھوں نے سیاسی حالات کے سوائے کسی اور موضوع کو درخورِ اعتنا خیال ہی نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ اگر اس صورت میں دونوں کے بیانات

اور نتائج نامکمل اور غیر تسلی بخش رہے ہیں، تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ ایسے میں اگر ہمیں ہندوستانِ قدیم کی کوئی قابلِ اعتماد سیاسی تاریخ، یا اسلامی عہد کی کوئی ایسی تمدنی دستاویز دستیاب ہو جائے، جس کی صحت میں کسی طرح کا شبہہ نہیں، تو اس کی اہمیت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ دونوں صورتوں میں یہ بہت بڑے خلا، کو پُر کرنے کا ذریعہ ثابت ہو گی۔

اسلامی عہد سے متعلق ایسی ہی ایک فارسی تحریر مرزا محمد حسن قتیلؔ (ف ۱۷ مارچ ۱۸۱۷ء) کی کتاب ہفت تماشا ہے، جس کا اُردو ترجمہ آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ قتیلؔ ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کا بچپن اور نوجوانی کا ابتدائی زمانہ اسی ماحول میں بسر ہوا۔ عین عنفوانِ شباب یعنی سترہ برس کی عمر میں انھوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد اگرچہ وہ بیشتر اسلامی حلقوں سے وابستہ رہے، لیکن ناممکن ہے کہ اُن کے اپنے خاندان یا ابتدائی احباب کے ساتھ تعلقات بالکل منقطع ہو گئے ہوں۔ اس طرح وہ گویا ہندو اور اسلامی تہذیب کا سنگم بن گئے۔ ان کے علم اور مشاہدے اور غور و فکر کا مرقع ان کی یہ کتاب ہفت تماشا ہے۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قتیلؔ نے جو کچھ لکھا ہے، وہ اپنی تفصیلات میں بے کم و کاست درست ہے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ اس کا اکثر حصہ ضرور صحیح ہے۔ جہاں بھی انھوں نے سنی سنائی باتوں پر اعتماد کیا ہے، ان کا بیان اغلاط سے پاک نہیں، مثلاً سکھوں کے حالات (ص ۵۰-۵۲)، مہربھنگی فرقے کی تفصیلات (۷۰-۷۱) وغیرہ۔ ان فصلوں میں بہت سی باتیں غلط اور محلِ نظر ہیں۔ اس کے مقابلے میں کتاب کا پانچواں اور چھٹا باب جہاں تہواروں، اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے رسوم و رواج کا ذکر ہے، بہت اہم اور گویا پوری کتاب کی جان ہے۔ ان سے اُس زمانے کی معاشرت، عوام کی روزمرہ کی زندگی، ان کے جذبات اور خیالات پر جو روشنی پڑتی ہے، وہ بہت مفید اور کارآمد ہے۔ اس سے ہم اٹھارھویں اور انیسویں صدی کی تاریخ کا بہت بڑا خلا پورا کر سکتے ہیں۔

چونکہ فارسی کا رواج کم ہو رہا ہے۔ اس لیے علمی حلقوں کو مترجم کا شکر گزار ہونا چاہیے

کہ انھوں نے ایسی اہم کتاب کے مطالب کو اُن کے لیے شگفتہ اور رواں دواں اُردو میں سہل الحصول بنا دیا ہے۔

مالک رام

نئی دلّی ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۶ء

مقدّمہ

(الف) حیات وسیرت

مرزا محمد حسن قتیل[1]، اصلاً بٹالہ[2] ضلع گورداسپور (پنجاب) کے کھتری بھنڈاری خاندان سے تعلّق رکھتے تھے[3]۔ ان کا خاندانی نام دیوانی سنگھ تھا[4]۔ شجرہ خاندان جو جناب مالک رام کو اسی دودمان کے ایک رکن سے پہنچا تھا، یہ ہے[5]۔

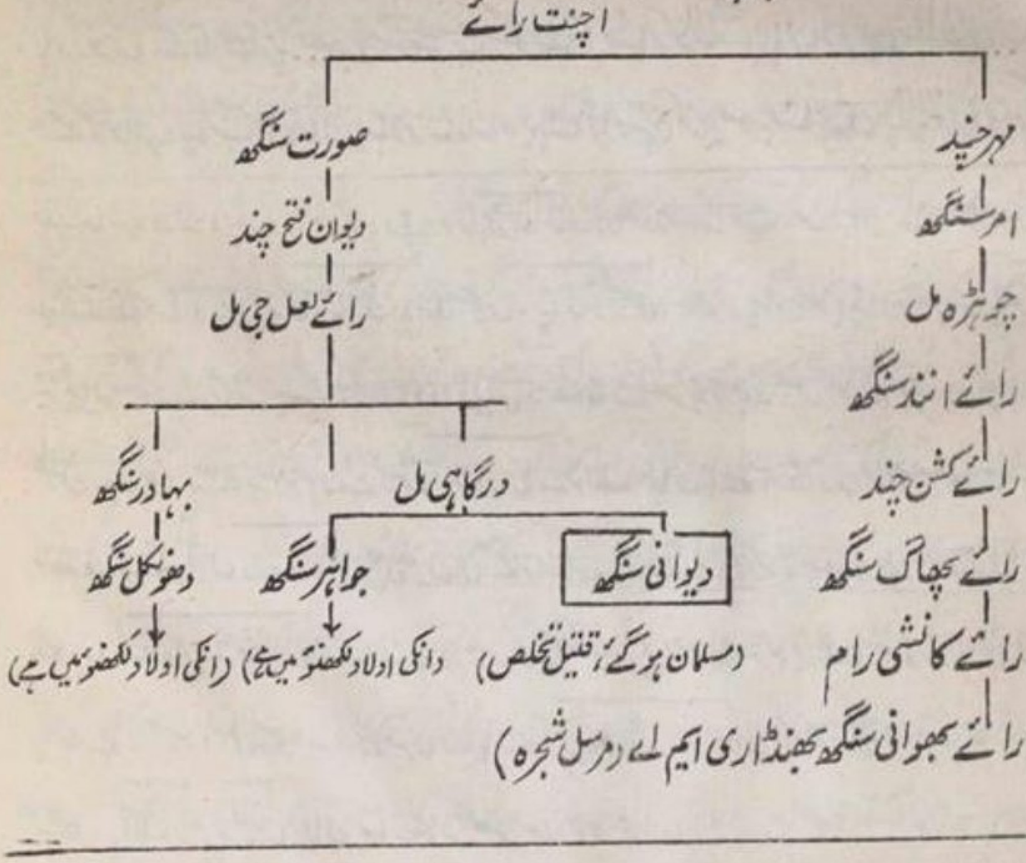

---

[1] ظاہر ہے مرزا لقب تعظیمی کے طور پر اضافہ ہوا ہے۔ یہ قتیل کے نام کے ساتھ کب سے رائج ہوا، کہنا مشکل ہے۔ قتیل کا نام بعض کتابوں میں باختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً: محمد احسن (صحائف شرائف۔ نیز دریائے لطافت بترجمہ: پنڈت کیفی ص ۳۵۹، احمد حسن (قاموس) المشاہیر جلد ۲ ص ۱۴۰) محمد قتیل (خلاصۃ الافکار، ابو طالب اصفہانی۔ قلمی نسخہ۔

(باقی ص ۱۲ پر)

آغا حسین قلی خان عاشقی[۱] نے قتیل کے خاندان اور ابتدائی زندگی کے بارے میں جو معلومات فراہم کئے ہیں۔ وہ قابل قدر ہیں۔ ان کا ملخّص ترجمہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔

"ان کے آباد اجداد قصبہ پٹیالہ (بٹالہ؟) کے رہنے والے تھے جو مشہور مقام پٹیالہ سے مختلف جگہ ہے، ایک زمانہ گزرنے پر ان کے جدّ سومی (صورت سنگھ؟) نے قوم کھتری کے ایک فرد کے ہمراہ، جو ان سے دوستی رکھتا تھا۔ اپنے موروثی مکان کو چھوڑ کر باگپت (باغپت؟) میں نزول کیا، جو جمنا کے پار دہلی سے سترہ کوس کے فاصلے پر ایک شہر ہے، قتیل کے والد اور دادا وہیں پیدا ہوئے۔ جب قتیل کے دادا نے فردوس آرام گاہ (محمد شاہ) کے جلوس کے سترھویں سال (مطابق ۱۱۴۸ھ ۳۶-۱۷۳۵ء) وفات پائی تو ان کے باپ (درگاہی مل) نے باغپت سے نقل مکان کر کے دہلی سے بارہ کوس کے فاصلے پر قصبہ ڈاسنہ میں سکونت اختیار کر لی۔[۲] یہاں دو تین سال ہی گزرے تھے کہ نواب ہدایت علی خان بہادر نے شاہ جہاں آباد پہنچ کر یہ صوبہ مستاجری پر لیا تو اپنی ہم مکتبی نیز

بقیہ حاشیہ صہ۱۱ : پٹنہ و دانش گاہِ دہلی، مرزا محمد حسن خاں (دستور الفصاحت۔ ص ۱۲۱) [۲] وطن میں بھی اختلاف ہے، اُس کی بحث آگے آئے گی۔ بٹالہ کی دوسری شکلیں۔ بٹالی (مصحفی: عقد ثریا ۱/۴۶) پٹیالہ (۶ ب ریاض الافکار) نیز پٹیالہ، "سوائے پٹیالہ مشہور کہ مابین راوی و بیاس از مضافات صوبۂ لاہور متصل امرت سر۔ واقع است (نشتر عشق۔ جلد ۲) [۳] یہ معلوم رہے کہ خلاصۃ التواریخ کے مؤلف سجان رائے بھنڈاری، اور مصطلحات شعراء کے مصنف سیالکوٹی مل وارستہ کا شجرہ بھی قتیل ہی کے خاندان سے ملتا ہے (تذکرۂ سفینۂ ہندی صہ۲۳۶ بعض تذکرہ نگاروں نے وارستہ کو قتیل کا نانا بتایا ہے (انیس العاشقین بحوالہ معاصر ۴) [۴] شجرۂ خاندانی سے یہی نام پہنچا ہے۔ تجنیس خطی کے سبب دوسری روایات: دیوال سنگھ اور دیوانی سنگھ بھی ملتی ہیں

[۵] مالک رام: قتیل پنجابی تھا۔ نگار لکھنؤ جلد ۴۲ شمارہ ۱/

حاشیہ صہ ہذا :۔ [۱] نشتر عشق حصہ ۲ (قلمی) نسخہ بانکی پور پٹنہ۔ بحوالہ معاصر حصہ ۴ تذکرے کے مختصر تعارف کے لیے ملاحظہ ہو۔ دیباچہ دستور الفصاحت۔ [۲] اس کا امکان ہے کہ باغپت اور پھر ڈاسنے میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے باوجود درگاہی مل کی شادی پنجاب میں ہوئی ہو، کیوں کہ قتیل نے ہفت تماشا (باب دوم) میں لکھا ہے کہ "بعضے

(باقی صہ۱۳ پر)

ان روابط قدیم پر نظر کر کے جو سید فیض اللہ خاں اور ان کے دادا کے وقت سے آپس میں چلے آ رہے تھے، ان کے والد (درگاہی مل) کو ڈاسنے سے بلا بھیجا اور "دلجوئی و چارہ سازی" کے ساتھ پیش آئے، ہزار روپیہ (سالانہ) ان کی ذات کا مقرر کر کے اجازت دی کہ اپنے گھر میں بال بچوں کے ساتھ رہیں (یعنی تکلیف نوکری سے معاف رکھا) چنانچہ درگاہی مل کبھی ان کی سرکار میں رہتے تھے، کبھی ڈاسنے چلے جاتے تھے اور فارغ البال زندگی گزار رہے تھے۔ اسی زمانے میں قتیلؔ ۱۱۷۲ھ/۵۹-۱۷۵۸ء[۱] میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ سترہ سال کی عمر تک صرف و نحو و منطق و حکمت و معانی و بیان و بدیع و ریاضی و عروض و عربی و فارسی، کی تحصیل کرتے رہے، آخر شعر گوئی کی طرف میلان ہوا، اور میرزا محمد باقر کرمان شاہ شہید کے شاگرد ہو کر ان سے فیض اٹھایا۔ ان کی صحبت کی برکت سے چودہ سال کی عمر میں مسلمان ہوئے۔ دو سال تک اسے اپنے عزیز و اقارب سے مخفی رکھا۔ آخر جب سترہ سال کی عمر کو پہنچے تو اپنے اسلام کا اظہار کیا، اور مذہب اثنا عشری اختیار کیا اپنے گھر بار سے کنارہ کر کے آزادگی و تجرد کے میدان میں قدم رکھا۔"

قتیلؔ کا وطن اور مولد بھی ایک نزاعی مسئلہ بن گیا ہے، کوئی اسے پٹیالہ سے منسوب کرتا ہے، کوئی پٹیالی ہے، کوئی لاہور سے، کوئی فرید آباد[۲] سے اور کوئی دہلی سے۔ سید اسد علی انوری فرید آبادی نے اپنے ایک مضمون میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ: مرزا قتیلؔ مرحوم کا خاندان ابھی تک فرید آباد میں آباد و خوش حال ہے، یہ کھتری صاحبان قصبے کے معززین میں سے ہیں۔ ان کی دہی گوت

بقیہ حاشیہ ص۱۲: کھتری جو مدت سے پنجاب کی سکونت چھوڑ کر پورب میں رہنے لگے ہیں۔ پنجاب کے کھتری ان کے ساتھ ایک برتن میں کوئی چیز نہیں کھاتے اور ان میں آپس میں رشتہ بھی نہیں کیا جاتا... لہٰذا وہ کھتری جو پنجاب سے پورب کے شہروں میں آئے ہیں، اور یہاں خوشحال زندگی بسر کرنے کے باعث یہیں بس جاتے ہیں، جب ان کا لڑکا جوان ہو جاتا ہے تو شادی کے لیے اسے اپنے وطن کو بھیج دیتے ہیں۔"

حاشیہ صفحہ ہذا: [۱] قدرت اللہ شوق گوپاموی: نتائج الاذکار/۵۷۳ (طبع بمبئی) نیز صدیق حسن خان: شمع انجمن/۳۹۰ (طبع بھوپال) [۲] رام بابو سکسینہ (مرتب) مرقع شعراء (طبع دہلی)

ہے جو قتیل کی بتائی گئی ہے۔ فیض آباد کے کھتریوں سے ان کی اب تک رسم و راہ اور رشتہ داری ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ ان کے پاس قدیم شجرہ موجود ہے۔ جس میں آج تک کے اندراج موجود ہیں، لیکن درگاہی مل والد مرزا قتیل کے آگے کوئی نام نہیں دیا گیا ہے۔ غالباً اس لیے کہ درگاہی مل کے صاحبزادے مسلمان ہو گئے تھے [1]

اس دعوے کی تردید میں ڈاکٹر مختار الدین احمد نے ایک مدلل مضمون لکھا [2] اور مبشیر مطبوعہ و غیر مطبوعہ ماخذ کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالا کہ مرزا غالب سے پہلے کسی نے قتیل کو فرید آباد سے نسبت نہیں دی [3]۔ اور غالب کے بیان کا یہ حال ہے کہ وہ ایک جگہ قتیل کو دہلوی [4] اور دوسرے موقع پر لکھنوی [5] بھی لکھتا ہے، دوسری دلیل یہ کہ کسی قدیم ذریعے سے قتیل کی نسبت وطنی تو کجا فرید آباد میں چند روزہ قیام بھی ثابت نہیں ہوتا [6]

لیکن یہ نزاع اس طرح بھی طے ہو سکتا ہے کہ ہم ان سب بیانات کو متخالف نہ سمجھیں، اور ان کا باہمی ربط تلاش کر لیں۔ میرا خیال ہے کہ قتیل کے آبا و اجداد کا وطن بٹالہ ہی ہے، اور اس کے دادا رائے لعل جی مل وہاں سے نقلِ مکان کر کے نکلے تھے مگر خود قتیل دہلی میں پیدا ہوا [5] جیسا کہ وہ خود کہتا ہے:

گرچہ باشد مولدِ من خاکِ دہلی اے قتیل!
کم کسے چوں من زبرد و ایزداں برخاست است

---

[1] اسد علی انوری۔ قتیل کا وطن، رسالہ نگار (لکھنؤ) جلد ۱۴ شمارہ ۵۔ [2] پہلے یہ غالباً نگار ہی میں چھپا تھا۔ نظر ثانی کے بعد دوبارہ نقوش (لاہور) مارچ ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔ ہمارے پیش نظر نقوش کا ادب عالیہ نمبر ہے۔

[3] ڈاکٹر مختار الدین کا یہ مفروضہ صحیح نہیں۔ کم سے کم ایک نظیر تو موجود ہے، یعنی مرقع شعراء، کا گرد رادر، جو خود کالستھ خاندان سے تعلق رکھتا ہے، قتیل کو فرید آباد کا باشندہ بتاتا ہے (رجوع کنید باں) [4] ملاحظہ ہو۔ مختار الدین احمد و مرتب، احوالِ غالب/۲۰۵، ۲۱۲ (طبع علی گڑھ) [5] اس کا ذکر ڈاکٹر مختار الدین نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے حوالہ نہیں دیا۔ [6] مضمون نگار نے ممکن مراجع سے باعتبار سنین یہ ثابت کیا ہے کہ کس سن میں قتیل کہاں رہا۔ فرید آباد میں

(باقی ص ۱۵ پر)

اس کے خاندان کے کچھ افراد تو بٹالہ میں رہ گئے، کچھ فیض آباد (شاید وہاں سے لکھنؤ) پہنچ گئے۔ اور کچھ نے فرید آباد میں اقامت اختیار کرلی۔ فرید آباد، دہلی کے مضافات میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور اسے دہلی ہی کا ایک حصہ شمار کیا گیا ہے۔ یہی ادعا سید ہاشمی فرید آبادی نے کیا ہے[1]۔ ان کا خیال ہے کہ قتیل کا دہلوی ہونا اور فرید آبادی نہ ہونا ایک دوسرے کے نقیض نہیں ہیں۔

قتیل کے سالِ ولادت میں جھگڑا ہے[2]۔ صحیح یہی ہے کہ وہ ۱۱۷۲ھ/ ۱۷۵۸-۹ء میں پیدا ہوا[3]۔ اور علومِ رسمیہ کی تعلیم کے بعد شروع جوانی میں[4] اپنا آبائی مذہب ترک کر کے، حلقہ بگوشِ اسلام ہوا۔ کہتے ہیں کہ اس کی تعلیم و تربیت مرزا باقر کرمانشاہ متخلص بشہید[5] کے ہاتھوں ہوئی اور انہیں کی ترغیب سے وہ مسلمان ہوا۔ کچھ مدت تک اس نے تبدیلیٔ مذہب کا راز اپنے عزیزوں سے چھپایا، آخر، ۱۷، ۱۸[6] سال کی عمر میں (تقریباً ۱۱۹۰ھ مطابق ۱۷۷۶-۷ء) اپنے نئے عقیدے کا اعلان کر دیا۔ ظاہر ہے اس صورت میں خاندان اور اہلِ خاندان سے بھی معاشرتی تعلق منقطع ہوگیا[7]۔

بقیہ حاشیہ ص۱۴۔ اس کا جانا کسی تحریر سے مستفاد نہیں ہوتا۔ [8] اس کی تائید: بھگوان داس ہندی (سفینۂ ہندی/ ۱۷۲) عاشقی؛ خوب چند ذکا، عبرتی عظیم آبادی، ابو طالب اصفہانی اور گراہم بیل بھی کرتے ہیں۔

حاشیہ صفحہ ہذا:۔ [1] سید ہاشمی فرید آبادی: قتیل کا وطن: رسالہ اُردو سہ ماہی (دہلی) جنوری ۱۹۴۵ء

[2] اسد علی انوری نے فرحتی عظیم آبادی کے تذکرہ شمع انجمن (نایاب) کے حوالے سے "۱۱۶۶ھ" سال ولادت لکھا ہے (نگار جلد ۱۴ ص ۵) [3] نشتر عشق (قلمی) نسخہ بانکی پور۔ بحوالہ معاصر ۴

[4] نشتر عشق (قلمی) بحوالہ معاصر ۴۔ [5] حیرت ہے کہ اٹھارہویں صدی کے بیشتر فارسی تذکروں میں شہید کا حال نہیں ملتا۔ [6] عبرتی: ریاض الافکار (قلمی) ورق ۵۳-الف، "در سن ہفدہ سالگی"، قدرت اللہ شوق نتائج الافکار /۵۷۴ [7] نشتر عشق (قلمی) ج ۲

بقول عاشقی، قتیلؔ نے اثنا عشری فرقے کے عقائد اختیار کیے تھے [۱] یہ کچھ مستبعد نہیں جب کہ وہ محمد باقر شہید کا تربیت یافتہ اور نجف خان ذو الفقار الدولہ کا نوکر تھا [۲] پھر دربارِ اودھ سے توسل پیدا ہوا تو وہاں بھی حکمرانوں کے شیعی عقائد تھے۔ لیکن اس کی تحریروں سے ان عقائد میں غلو کا ثبوت نہیں ملتا [۳] اور اس سے شبہ ہوتا ہے کہ عجب نہیں کہ وقتی مصالح کے پیش نظر قتیلؔ نے اثنا عشری فرقے کے عقائد اختیار کر لیے ہوں، جیسا کہ غلام ہمدانی مصحفی نے بھی نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں کیا تھا [۴] قتیلؔ کے لیے بھی مصحفی نے اشارہ لکھا ہے: بسکہ در عہد نواب وزیرِ مرحوم رواج ایرانیاں بیشتر بود، مشارٌ الیہ ہم دیدہ دیدہ ہمیں مذہب اختیار کردہ" خود قتیلؔ نے بھی ہفت تماشا (باب دوم) میں لکھا ہے کہ "بہت سے لوگ شیعوں کی حکومت ہونے کے باعث تشیع کی طرف جھکتے ہیں"۔

مصحفی کا قول ہے کہ قتیل کی ابتدائی تعلیم فیض آباد میں ہوئی [۵] لیکن تذکرہ نگاروں نے [٦] یہ کہا ہے کہ وہ اسلام قبول کرنے سے پہلے دہلی آیا اور عربی و فارسی کی متداول درسی کتابیں پڑھیں۔

---

[۱] عشقی: ریاض الافکار (قلمی) ورق ۵۳۔ الف [۲] نجف خان غالی شیعہ تھا (ملفوظات شاہ عبد العزیز دہلوی) اور یہ ممکن نہیں تھا کہ اس کے عقیدے سے اختلاف رکھنے والا کوئی شخص اس کے مصاحبوں میں داخل ہو سکے۔ مصحفی اس کے عہدِ وزارت میں گوشہ نشین ہو گئے تھے (تذکرۂ ہندی/ ۲۴۸) میرزا مظہر جان جاناں کی شہادت میں نجف خاں کا ایما بھی شامل ہو یہ کچھ بعید نہیں ہے۔ [۳] اس کی تفصیل کے لیے خود زیر نظر کتاب کے وہ بیانات ملاحظہ ہوں جو مذہب امامیہ اور شیعی رسوم سے متعلق ہیں مثلاً باب اول کا آخری حصہ [۴] مصحفی نے لکھنؤ میں متعہ بھی کیا تھا جسے وہ "محکم تر از نکاح" (مجمع الفوائد) کہتا ہے لیکن اس نے ایک قصیدے میں بظاہر ان عقائد سے اپنی برأت کا اظہار بھی کیا ہے۔ تفصیل یہاں غیر ضروری ہو گی (ملاحظہ ہو۔ ابو اللیث صدیقی: مصحفی اور ان کا کلام / ص ۸۔ ۹۔ [۵] مصحفی: عقد ثریا / ٤٦ "درایامے متعلقانش بجسب آب خورد بفیض آباد رفتہ استقامت گرفتند بر دست مرزا محمد باقر شہید اصفہانی ہیزدہ سالہ بود کہ بشرف اسلام پیوستہ، و در آں ایام ہم درس کتاب از مرزا می گرفت"۔ [٦] شوق، نتائج الافکار / ۲، ۵۷ نیز بھگوان داس ہندی، سفینۂ ہندی / ۱۷۲

قیاس یہ کہتا ہے کہ مصحفی نے خود قتیل سے معلوم کر کے لکھا ہوگا۔ عاشقی کے قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ تعلیم اور تبدیلِ مذہب دہلی میں ہوا[1]۔ قتیل نے اپنی ولادت (۱۱۷۲ھ مطابق ۹-۱۷۵۸ء) سے اسلام لانے تک کا زمانہ بظاہر دو شہروں میں گزارا ہے۔ یعنی دہلی اور فیض آباد میں۔ اس کے بعد ۱۱۹۰ھ / ۷۷-۱۷۷۶ء کے لگ بھگ وہ ذوالفقار الدولہ نجف خان کے لشکر میں شریک ہو کر[2] دہلی و اطراف میں بسر کرتا رہا[3]۔

ظاہراً نجف خاں سے یہ تعلق اس کی موت (۸ جمادی الثانی ۱۱۹۶ھ / ۱۷۸۲ء) تک باقی رہا۔ قتیل اکثر دہلی آتا رہتا تھا۔ چنانچہ ہم اسے ان مشاعروں میں بھی موجود پاتے ہیں[4] جو عہدِ نجف خانی میں مصحفی کے مکان پر ہوتے تھے۔ اسی زمانے میں قتیل نے مصحفی کو فارسی شعراء کا تذکرہ عقدِ ثریا ..... لکھنے کی ترغیب دی[5]، بلکہ کچھ مواد بھی، جو قتیل نے فراہم کر رکھا تھا، یا زبانی یاد تھا تذکرے میں شمول کے لیے لکھوا دیا۔

نجف خاں کے لشکر سے علیحدہ ہو کر قتیل نے لکھنؤ کا رخ کیا، اور پھر اسے اپنا وطن ہی بنا لیا کیونکہ ۱۱۹۸ھ / ۸۴-۱۷۸۳ء سے آخر دم تک وہ لکھنؤ میں رہا۔ چند سفر ضرور پیش آئے، مگر وہ مختصر وقفوں کے لیے تھے[6]۔

<u>۱۱۹۸ھ / ۸۴-۱۷۸۳ء سے ۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۱-۱۸۰۰ء ..... تک کا زمانہ اس نے لکھنؤ میں گزارا ہے[7]، کیونکہ تذکرۂ ہندی</u>

---

[1] عاشقی: نشترِ عشق حصہ ۲ (قلمی نسخہ بانکی پور) بحوالہ معاصر ۴۔ [2] مصحفی: عقدِ ثریا / ۴۶ [3] کیا یہ ممکن نہیں کہ اسی زمانے میں قتیل نے فرید آباد میں کچھ وقت گزارا ہو، نجف خان کا بھیر ڈنبر ان دنوں آگرہ اور دہلی کے درمیان منڈلاتا رہتا تھا۔ [4] مصحفی۔ عقدِ ثریا / ۲ [5] مصحفی۔ عقدِ ثریا / ۲ [6] ان سفروں کا حال مرزا قتیل کے رقعات معدن الفوائد (طبع نول کشور ۱۸۸۱ء)، ہفت تماشا، دیباچہ چمن المعانی (قلمی نسخہ مملوکہ قاضی عبدالودود صاحب پٹنہ۔ حوالہ نقوش ادب عالیہ نمبر) وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً: معدن الفوائد ص ۱۴، ص ۴۹، ۷۰، وغیرہ نیز ہفت تماشا۔ مولف معیار الشعراء (قلمی) کا یہ بیان کہ قتیل "مدتوں ملک اصفہان میں رہا" بظاہر غلط ہے۔ اس کی تصدیق کہ قتیل کبھی ہندوستان سے

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

کی ترتیب کے وقت وہ لکھنؤ میں موجود ہے[۱]۔ یہ زمانہ لازماً ۱۲۰۹ھ/۱۷۹۴-۹۵ء تک کا ہے۔ ابو طالب اصفہانی نے بھی اسے ۱۲۰۷ھ/۱۷۹۲-۹۳ء میں مقیم لکھنؤ بتایا ہے[۲]۔ ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷-۹۸ء میں خود قتیل نے عبدالقادر خاں کے مکان پر خواجہ محمد علی تمنّا سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے[۳]۔ ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰-۰۱ء ... وہ نواب عماد الملک کی ملازمت میں کالپی چلا گیا تھا[۴] جہاں اس کا قیام ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲-۰۳ء تک رہا[۵]۔ ۱۲۲۱-۲۲ھ/۱۸۰۶-۰۷ء میں انشاء اللہ خان انشاء (متوفی ۱۲۳۲ھ/۱۸۱۷-۱۸ء) نے دریائے لطافت لکھی تو اس کا آخری حصہ جو معانی و بدیع سے متعلق تھا، قتیل نے تصنیف کیا[۶]۔

قتیل نے ایک مشاعرے کی روداد خواجہ امانی کو لکھی ہے۔

"احوال مشاعرہ بریں منوال است کہ چوں روز ہائے موسم سرما کم عرست و تا فارغ شدن مردم از طعام و طے کردن مسافت تا ایں جا، و انعقاد پذیرفتن صحبت سہ پہر می زنند، ازیں جہت صحبت دیر دزہ بہ نصف شب کشیدہ۔ جا بجا دروازہ ہا بند شدہ بود۔ خجرۂ میر صاحب با وصف خوش گوئی بدستور بودہ است۔ تمام جسم مبارک ایشاں رعشہ داشت و آواز راہم کسے نمی شنید، لیکن من و خدا کہ غزلہا خوب گفتہ بودند"[۷]۔

بقیہ حاشیہ ص۱۷: باہر گیا ہو۔ کسی ذریعے سے نہیں ہوتی۔ [۷] مصحفی عقد ثریا/۴، مصحفی تذکرۂ ہندی/۱۰۶ (ترجمۂ رند) نیز عقد ثریا/۱۴ (ترجمہ بے تاب)

حاشیہ صفحہ ہذا: [۱] مصحفی۔ تذکرۂ ہندی/ یہ تذکرہ مابین ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء و ۱۲۰۹ھ لکھا گیا تھا۔ درک دیباچہ دستور الفصاحت/۸۴-۸۶) [۲] ابو طالب: خلاصۃ الافکار (قلمی) بحوالہ معاصر ۲ نیز قلمی نسخہ دہلی یونیورسٹی لائبریری۔ [۳] "در سال ہزار و دو صد و دوازدہ بملاقات شریف خواجہ محمد علی تمنّا" ... در لکھنؤ بخانۂ خان صاحب عبدالقادر خان بہادر اتفاق افتاد" عمان المعانی (قلمی) بحوالہ نقوش ادب عالیہ نمبر) [۴] ملاحظہ ہو۔ چار شربت (طبع نولکشور) نیز ہفت تماشا (متن فارسی) طبع نولکشور ۱۸۷۵ء) و صدیق حسن خان۔ شمع انجمن/۳۹۰ (طبع بھوپال) [۵] ہفت تماشا (باب دوم) قتیل نے لکھا ہے کہ وہ عماد الملک کی وفات کے بعد بھی کچھ زمانے تک کالپی میں رہا۔ [۶] دریائے لطافت کا فارسی متن سب سے پہلے مطبع آفتاب عالم تاب مرشد آباد سے ۱۲۶۶ھ

(باقی ص ۱۹ پر)

ظاہر ہے کہ یہ میرؔ کی وفات (۱۸۱۰ء - ۱۲۲۵ھ) سے دو تین سال قبل کی روداد ہے۔ ۱۲۲۹ھ (مطابق ۱۸۱۳-۱۴ء) میں جب عبدالقادر خان غمگینؔ [۱] نے لکھنؤ کا سفر کیا، اس وقت بھی مرزا قتیلؔ محفل سخن میں نظر آ رہے ہیں۔ غمگینؔ نے لکھا ہے:

"روزے در محفل مشاعرہ کہ دراں ایام بخانۂ مرزا جعفر [۲] می بود، رفتم، مرزا محمد حسن متخلص بہ قتیلؔ و مصحفیؔ و میر نصیر دہلوی دراں زمرہ سرکردہ بشمار می آمدند و شیخ امام بخش ناسخؔ را دراں ایام روز افزونی و ناموری دریں کار بود" [۳] ۱۲۳۱ھ (مطابق ۱۸۱۵-۱۶ء) میں دوبارہ کالپی کا سفر کیا [۴]

۲۲ ربیع الثانی ۱۲۳۳ھ [۵] مطابق ۲ مارچ ۱۸۱۷ء روز شنبہ [۶] کو قتیلؔ نے استسقاء [۷] میں مبتلا ہو کر لکھنؤ میں وفات پائی۔ مؤلف صحائف شرائف کا مستخرجہ مادۂ تاریخ یہ ہے [۸]

بقیہ حاشیہ ص ۱۸: میں شائع ہوا تھا۔ انجمن ترقی اردو سے دوبارہ چھپی ہے، پہلی طباعت ۱۹۱۶ء (الناظر پریس لکھنؤ) پر مولوی عبدالحق کا مقدمہ ہے، طبع ثانی (مترجمہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی) ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ [۴] معدن الفوائد/۵۴

حاشیہ ص ہذا: [۱] تفصیل کے لیے رجوع شود: احمد علی شوق: تذکرہ کاملانِ رامپور/۲۳۴-۲۳۵ امیر مینائی: انتخاب یادگار/۲۷۱- امتیاز علی عرشی (دیباچہ) دستور الفصاحت/۹۲۔ [۲] مرزا جعفر، مرزا فخر الدین احمد خان بہادر کا عرف ہے۔ یہ نواب آصف الدولہ کے نائب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں کے بہنوئی تھے۔ شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے۔ ان کے گھر بڑی ستھری محفلیں شاعری کی ہوتی تھیں۔ ان کے بیٹے افتخار الدولہ معین الملک مرزا قمر الدین احمد خاں بہادر صولت جنگ قتیلؔ کے شاگرد تھے (دستور الفصاحت ص ۱۲۰-۱۲۱) نیز ملاحظہ ہو: نجم الغنی۔ تاریخ اودھ (ج ۴) ص ۱۱۴-۱۱۶ و عہد مصحفی۔ ریاض الفصحا/۶۹/۲۵۹۔ وقائع عبدالقادر خانی ج ۲: ۱۳۸-۱۳۹ طبع کراچی) سوانحات اودھ جلد دوم بہ حواشی تذکرہ ابن امین اللہ طوفان۔ از قاضی عبدالودود۔ [۳] روزنامچہ عبدالقادر غمگین رامپوری (قلمی نسخہ کتب خانہ حبیب گنج) اس کی نقل رضا

(باقی ص ۲۰ پر)

طبع من از دوات و کلک گرفت — بہر تاریخ امتحان سخن،
خامہ بنوشت بر سرِ کاغذ — مردہ آہ علیے[۶] زبان سخن (۱۲۳۳ھ)
عسکری مدح او چساں گویم — ہست الکن مرا زبانِ سخن

دوسرے شعر کے دوسرے مصرع میں سر کاغذ (کاف) کے اعداد کا تعمیہ ہے قتیل کے شاگرد خواجہ امانی نے "داد نورے بمزار و بجہاں تاریکی" سے تاریخ نکالی تھی[۱] لیکن اس سے ۱۲۳۱ھ برآمد ہوتے ہیں۔ غالباً اس مصرع اوّل میں تعمیہ رہا ہوگا۔

قتیل کی معنوی اولادیں تو آج بھی زندہ ہیں۔ جسمانی اولاد کوئی نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس نے تمام عمر تجرد و آزادگی میں گزار دی[۲]۔ مختلف شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عاشق مزاج اور

بقیہ حاشیہ ص ۱۱: لائبریری رامپور میں ہے۔ اب کراچی سے اُردو ترجمہ، حواشی کے ساتھ شائع ہو گیا ہے، جسے جناب محمد ایوب قادری نے مرتب کیا ہے۔ [۳] مظہر العجائب / دیباچہ (طبع نولکشور) دیسے قتیل نے اپنی عمر کے آخری پندرہ سال مرزا اسکندر شکوہ کے مختار کار میرزا شجاعت علی خاں کی معیت میں بسر کئے تھے۔ اور ایک مختصر سے وقفے کے لیے وہ کالپی گئے تھے (نشترِ عشق قلمی) [۴] عاشقی: نشتر عشق جلد دوم (بعض تذکروں نے قتیل کا سال وفات ۱۲۴۰ھ بتایا ہے۔ مثلاً نتائج الافکار/۵۷۵، شمع انجمن/۳۹۰ یہ بالکل غلط ہے [۵] عبرتی: ریاض الافکار (قلمی) ورق ۵۳۔ الف نیز زخمی۔ انیس العاشقین (قلمی) بحوالہ معاصر ۴۔ [۶] عاشقی: نشتر عشق جلد دوم۔ تقویم ہجری و عیسوی کی رو سے ۲۳ ربیع الثانی مطابق ۲ مارچ ہوتی ہے لیکن دن دوشنبہ آکر پڑتا ہے۔ تذکرہ میں صریحاً شنبہ آیا ہے۔ [۷] صحائف شرائف (قلمی) بحوالہ معاصر ۴ (۱۰۲) کا ایک مخطوطہ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدرآباد میں بھی ہے، معدن الفوائد کے آخر میں (ص ۴۹) قتیل کی ایک غزل درج ہے جس کا مقطع ہے: "مسلمانان مسلمانش نگوئید" قتیل کا فرایانے ندارد، اس کے دوسرے مصرعے سے کرامت علی اظہر نے تاریخ وفات برآمد کی تھی جسے میرزا صبر علی نے تضمین کیا تھا۔ حاشیہ ص ہذا: [۱] صحائف شرائف حوالہ ماسبق۔ [۲] ابوطالب: خلاصۃ الافکار (قلمی) عاشقی: نشتر عشق ج ۲ "بگردان جہاں دآزادان زماں راطرز مجرّدی و آزادی آموخت" زخمی انیس العاشقین (قلمی) بحوالہ معاصر ۴

اوباش قسم کا انسان تھا۔ اس دور کے آودھ میں طوائف بھی زندگی کے آداب میں جزوِ تکمیل کی حیثیت رکھتی تھی قتیل بھی ان "لولیانِ شوخ" کی عشوہ فروشیوں سے بہرہ اندوز ہوتا تھا عاشقی کہتا ہے "ہمیشہ بایک کس تعلق خاطری دارد وگاہے می شود کہ بریک محبوب اکتفانہ کردہ بادوسہ کس تعلق خاطری دارد" [۱]

اس کے مدفن کا کچھ سراغ نہیں ملتا۔ غالباً حوادث کی آندھیوں نے ایک قلندر کا تبرک سمجھ کر آزادوں میں بانٹ دیا۔

مختلف تذکروں کے مطالعے سے قتیل کی سیرت کی جو تصویر بنتی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ آزادمنش قلندر وضع [۲]، سادہ طبیعت [۳]، موٹا جھوٹا کھانے والا [۴]، عاشق مزاج [۵] خوش طبع، حریف وظریف، یارباش، ہشاش بشاش، اور سیر وسیاحت کا دلدادہ انسان تھا۔ اس نے اسباب دنیا کبھی فراہم نہیں کیا [۶] حتیٰ کہ گھربار اور بیوی بچوں کی قید سے بھی آزاد رہا۔ اس کی ایک قلمی تصویر بھی دستیاب ہوگئی ہے [۷]

(ب) تصانیف

قتیل کی تصانیف تعداد میں خاصی ہیں؛ اس کی آزادی اور قلندری کو دیکھتے ہوئے حیرت ہوتی ہے کہ بایں ہمہ بے پروائی یہ سب آخر لکھی کیسے گئیں۔

مخزن الغرائب کے مؤلف کا بیان ہے کہ "فقیر کسے را در لطافت طبع وجودت ذہن و استقامت عقل ولزوم قناعت وتجرد وتفرد خوش گزرانیدن مانند ایشان ندیدہ ام۔ وگاہے تلاش دنیا نکردہ۔ خانہ بدوش، قلندرانہ بہ لباس کم بہا زیست می نماید۔ ہرگز در بند گنجی نبودہ

---

[۱] عاشقی۔ نشتر عشق ج ۲۔ [۲] احمد علی: مخزن الغرائب و عاشقی: نشتر عشق بجو المعاصر ۲
[۳] عاشقی۔ نشتر عشق ج ۲ [۴] احمد علی۔ مخزن الغرائب (قلمی) [۵] بھگوان داس: سفینۂ ہندی/۱۷۲
[۶] عبرتی: ریاض الافکار نیز احمد علی۔ مخزن الغرائب [۷] رجوع: مرقع شعرا (شائع کردہ رام بابو سکسینہ)

از علاقۂ دنیا تا دوات و قلم کہ از لازمۂ اہلِ علم است ہمراہ خود ندارد، ایں ہمہ بے تعلقی از لاچاری (نمیست) بلکہ باستغنائے طبع است، اکثر بزرگان مثل ... نواب آصف الدولہ مرحوم و دیگر عزیزان درصدد تربیت او درآمدہ اند و او سرباز زدہ وتن بکرہ و فرندادہ روّیہ کہ اختیار نمودہ ازاں برنگشتہ۔[۱]

قلندری کا یہ حال تھا کہ " نہ التفات بر قلم تراشیدن دارد نہ بر قط زدن، ہنگام تحریر اگر نوک قلم می شکند بہ ہماں قلم دہ خطی می نویسد، و خدمت لفافہ تعلق بہ حاضرین دارد۔ الی یومنا ہذا بہمیں نمط زندگی می کند ...[۲]

اسی لاابالی پن کی وجہ سے قتیل نے کبھی اپنا کلام بھی یکجا کر کے نہیں رکھا۔ عاشقی کا بیان ہے کہ اس کا " دیوان غزل و جنگ نثر قریب پانزدہ ہزار بیت " تھا[۳] مگر اس کے پاس کبھی کچھ نہیں رہا۔ دوست اور شاگرد جوڑتے رہتے تھے۔

شاعری اور انشا پردازی کے جو رائج الوقت معیار تھے ان پر قتیل کو حاکمانہ قدرت حاصل تھی۔ احمد علی الہاشمی کا بیان ہے کہ " از علم (کذا) متداولہ بہرہ وانی و از فنونِ شاعری نصیبۂ کافی دارد و در عروض و قافیہ و تاریخ و لغت و انشا، و در فہم و فراست و دقتِ طبع دریں زمان عدیل و نظیر خود ندارد "[۴] اور بقول عاشقی " امروز در ہندوستان کسے ہم زبان آں جناب نیست "[۵]

نظم و نثر میں اس کی ماہرانہ چابک دستی کی دو مثالیں عاشقی نے لکھی ہیں جن کا ملخص یہ ہے۔

---

[۱] احمد علی الہاشمی: مخزن الغرائب (قلمی) بحوالہ معاصر ۴، (اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ حبیب گنج علی گڑھ میں ہے) [۲] آغا حسین قلی خان عاشقی: نشتر عشق جلد ۲ (قلمی) بحوالہ معاصر ۴۔ [۳] نشتر عشق حصہ ۲ بحوالہ معاصر ۴۔ [۴] مخزن الغرائب (قلمی) بحوالہ معاصر ۴۔ [۵] نشتر عشق حصہ دو، بحوالہ معاصر ۴۔

۱۔ ایک بار مرزا جعفر کے لڑکے کی شادی کے موقع پر شہر کے لوگوں کو شرکت مجلس کا دعوتی رقعہ بھیجنے کی خدمت قتیلؔ کے سپرد کی گئی دعوت کے رقعے کا مضمون ہوتا ہی کیا ہے مگر انھوں نے دو دن میں سو رقعے مختلف الفاظ و عبارت میں لکھ کر پیش کیے اور کہا کہ اگر ایک ہفتے کی مہلت مل جائے تو ایسے ہی آٹھ سو رقعے اور لکھ سکتا ہوں۔"

۲۔ ایک بار سعادت یار خان رنگینؔ لکھنؤ سے واپسی میں مجھ سے ملنے آئے اور قسم کھا کر بیان کیا کہ ایک بار انشاء اللہ خاں مرحوم نے جو مرزا کے دوستوں میں تھے اور آپس میں ہنسی مذاق بھی ہوتا تھا۔ دو تین دن میں بڑے غور و تامل کے بعد دو تین فقرے بے نقط نثر کے لکھ کر قتیلؔ کو خط بھیجا۔ اگلی صبح کو جب قتیلؔ سے ملاقات ہوئی تو انشاؔ نے کہا[۱] "دیکھا میں نے کیسا بے نقط رقعہ لکھا تھا؟ تم اس کا جواب نہیں دے سکتے۔ قتیلؔ نے "فی الفور قلم اٹھایا

[۱] کچھ شاعرانہ چشمک اور معاصرانہ رقابت، کچھ انشاؔ کی کٹ کھنی طبیعت۔ قتیل کو بھی باوجود دوستی ریک جہتی کے رگید نے سے نہ چھوڑا اور معمولی اعتراضوں پر اس کی ہجویں لکھ ڈالیں۔ "یک روز بعد نماز ظہر بتلاوت قرآن مجید مشغول بودم آں روز مرزا قتیل ہم درخانۂ من مہمان بود؛ چونکہ تلاوت کردہ بودم، لفظ مَعنا را خواندم، مرزا قتیل لفظ معنا را شنید و گفت معنا یعنی بسکون عین خوب است کہ قاعدہ عربی معنا است، فوراً ابیات گفتم:

کہے جو کہ قتیل صحیح ہے وہ، کہ وہ کھتری ہے اور گدھے کی ہے دُم
کہے وہ جو خدا مَعنا سو غلط، نہ طریق رشاد کو کیجیے گم
مع ہو جو مضاف تو عین کو جزم اجی کیوں ہو بھلا وہ کہو مجھے تم
تو مثالیں غلط ہوں یہ سب مَعَطے معہا مع من معنا مَعکُم

(ملاحظہ ہو مرزا عسکری: کلام انشاء، شائع کردہ ہندوستانی اکادمی الٰہ آباد، ۱۹۵۲ء)

ایک اور موقع پر قتیلؔ سے لفظ ہجر کے مفتوح یا مکسور ہونے پر بحث ہو گئی تو انشاء نے طویل رقعہ لکھ ڈالا۔

اور قرآن کی جو سورتیں اسے یاد تھیں ان کی بے نقط تفسیر لکھنی شروع کر دی اور " در عرصہ یک نیم پاس " نہایت روانی و سلاست کے ساتھ فیضی کی سواطع الالہام سے بہتر عبارت لکھ ڈالی ۔[1]

یہ واقعہ لکھ کر عاشقی کہتا ہے کہ اسے مبالغہ یا جانب داری نہ سمجھنا، حقیقت یہ ہے کہ فیضی تو موجود ہے کوئی اکبر نہیں رہا۔ ظہوری آج بھی زندہ ہے مگر برہان الملک جیسا قدر دان کمال نہیں ہے ۔

یہ صحیح ہے کہ قتیل زبان عربی و فارسی و ترکی سے واقفیت رکھتا تھا۔ عاشقی کا بیان ہے کہ وہ عربی اور ترکی میں بات چیت کر سکتا تھا[2] احمد علی کہتا ہے کہ " مہارت کلی " حاصل تھی۔[3] مصحفی[4] اور احمد علی[5] نے فن تاریخ میں اس کی دسترس اور قوتِ حافظہ کی بھی تعریف کی ہے۔ زود گوئی کا یہ عالم تھا کہ " دو ساعتِ نجومی "[6] میں سو شعر کہہ ڈالتا تھا۔

بقیہ حاشیہ ص ۲۳ -

انیسا مشفقا نہ بندہ نوازا	لِمَ حَرَّرتنی قولاً ثقیلا ۔ ۔ ۔
تجھے کہتی تھی دنیا قاف معنی	تو کیوں کر بن گیا مجنوں کا ٹیلا
وہ حجرا ہے جو مجبوراً کے ہمراہ	سو ہے حطی ہی ہاں مرزا قتیلا
ولے جو اِن قوی کے ہے آخر	وہ مہجوراً ہے ہنوز سے خلیلا

لیکن ہجو کا چسکا جب منہ لگ جاتا ہے جنگل سے چھوٹتا ہے، انشار کو اس میں معذور ہی سمجھنا چاہیے۔

(سبحان قلی بیگ سے ان کے معرکے کا حال معدن الفوائد ص ۱، پر ملاحظہ ہو)

[2] عاشقی: نشترِ عشق حصہ ۲ بحوالہ معاصر حصہ ۴ (یہ بیان مبالغے سے خالی نہیں ہے) [3] عاشقی: نشترِ عشق حصہ ۲ معاصر ۴ ۔ [4] مخزن الغرائب ج ۲ (قلمی) بحوالہ معاصر ۴ ۔ لیکن یہ کہنا یقیناً مبالغہ ہے ۔ [5] عقد ثریا ۴۶/۴ [5] مخزن الغرائب ج ۲ (قلمی) بحوالہ معاصر ۴ [6] مخزن الغرائب جلد ۲ بحوالہ معاصر ۴ ۔

[7] قتیل نے اردو نثر میں بھی کچھ لکھا تھا، اس کے کچھ اردو خطوط معدن الفوائد (نسخہ قلمی) میں بھی شامل ہیں۔

(باقی ص ۲۵ پر)

قتیل کی تصانیف کا مختصر خاکہ یہ ہے:

(۱) دیوان فارسی: یہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے، اس کے قلمی نسخے ہندوستان کے مختلف کتاب خانوں میں پائے جاتے ہیں اشعار کی مجموعی تعداد پانچ ہزار کے لگ بھگ ہے۔

(۲) چار شربت: یہ قواعد فارسی، مصطلحات، زبان دانی اور محاورۂ اہلِ فارس میں ہے اس کی تالیف کا زمانہ غالباً ۱۲۲۸ھ ہے، محمدی پریس لکھنؤ سے شائع ہو چکی ہے۔

(۳) نہر الفصاحت: یہ مختصر رسالہ قواعد زبان فارسی اور اصول بلاغت و انشار وغیرہ میں ہے اور غالباً پہلی بار رجب ۱۲۷۰ھ میں مطبع مصطفائی کانپور سے شائع ہوا تھا (تعداد صفحات ۳۸)

اس کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر امان علی کا بڑا لڑکا میر محمد حسین جب شجرۃ الامانی کے مطالب پڑھ چکا اور اسے انشار کا ذوق پیدا ہوا تو میر امان علی نے فرمائش ...

بقیہ حاشیہ ص۲۴: جن کا ہم آگے ذکر کریں گے۔ ان کے علاوہ دریائے لطافت میں اردو نثر کے نمونے، خصوصاً ضلع جگت کا بے مثال نمونہ (ملاحظہ ہو دریائے لطافت اردو ترجمہ ص ۳۷۹) وغیرہ ہیں۔ البتہ اردو شاعری میں کوئی مستقل کارنامہ نہیں ہے۔ ایک شعر رعایت خاں ناصر نے اپنے تذکرے میں درج کیا ہے (تذکرہ ناصر، قلمی، بحوالہ معاصر ۴) اور تین شعر نسخہ دلکشا جلد ۱ (مخطوطہ بانکی پور) میں دیے گئے ہیں (معاصر ۴) اس میں سے ایک دریائے لطافت کی مثالوں سے ماخوذ ہے۔ (ملاحظہ ہو ص ۳۷۵) چار شعر مرقع شعراء سے ملتے ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے ؎

اس زلف کی کیا بات ہے آدھی اِدھر آدھی اُدھر
پھیلی یہ کالی رات ہے آدھی اِدھر آدھی اُدھر

اسی مضمون کا ایک شعر:

ہوا ہے مانگ میں دل گم مرا، میں ڈھونڈھوں کدھر
کہ آدھی رات اِدھر ہے اور آدھی رات اُدھر

تقریباً نصف درجن شاعروں سے منسوب ہے (ملاحظہ ہو: نقوش، جون، ۱۹۵۷ء)

کی کہ اب ایک ایسا رسالہ لکھو دو جو ان مطالب پر مشتمل ہو جو شجرۃ الامانی میں نہیں ہیں۔ چنانچہ قتیلؔ نے یہ نہر الفصاحت لکھی۔ اسے دس موجوں (فصول) میں تقسیم کیا۔ وہ اس کتاب کا نام محمد حسینؔ کی رعایت سے منافع الحسینیہ بھی تجویز کرتا ہے۔

موج اوّل : در تعلیم بعضے چیزہا کہ ترک آں واجب و مستحسن است۔ (خصوصاً ہندوستانی فارسی کے نقائص اور وہ الفاظ و محاورات جو ہندی قواعد اور ہندوستانی مزاج کے نمونے پر بنائے گئے ہیں)

موج دوم : دربیان استعمال افعال

موج سوم : دربیان واجبات و مستحسنات

موج چہارم : در زوائد واجبی

موج پنجم : دربیان مرکبات

موج ششم : دربیان مقدّرات و محذوفات

موج ہفتم : در علم بیان

موج ہشتم : در ذکر زبان فارسی۔

موج نہم : دربیان فرق در اشعار متقدمین، و متاخرین و نثر ہندیان و اہل زبان

موج دہم : در تعلیم طریق تحریر نثر

۴۔ معدن الفوائد یا رقعات مرزا قتیلؔ، خواجہ امام الدین امامی شاگرد قتیلؔ نے ۱۲۳۲ھ ۱۸۱۶-۱۷ء میں اپنے موسومہ رقعات جمع کیے تھے۔ اس میں بہت سی کار آمد باتیں[1]

[1] اس میں حمد کا حصہ عربی میں، نعت کا ترکی میں، منقبت کا فارسی میں اور تعریف اصحاب اردو میں لکھا گیا ہے۔ چار زبانوں میں اسے تقسیم کرنے کا سبب بظاہر یہ تھا کہ خواجہ امامیؔ نے ان ہی چاروں زبانوں میں قتیلؔ کے رقعات بھی فراہم کیے تھے، لیکن مطبوعہ نسخے میں صرف فارسی رقعات چھپے ہیں۔ معدن الفوائد کے دو قلمی نسخے پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب لکھنوی کے پاس ہیں۔ ان میں پانچ خط اردو زبان میں بھی ہیں۔

(باقی ص ۲۷ پر)

قتیل کی زندگی اور اس کے معاصرین کی بابت معلوم ہوتی ہیں۔ یہ کتاب مطبع نولکشور سے ۱۸۸۱ء میں چھپی تھی۔

(۵) شجرۃ الامانی۔ یہ میر امان علی کی فرمائش پر ان کے بیٹے میر محمد حسین کے لیے لکھا گیا تھا۔

(۶) ثمر البدائع = یہ بھی فارسی بلاغت اور فن انشا سے متعلق ہے۔ ۱۲۶۳ھ میں مطبع محمدی لکھنؤ سے شائع ہو چکی ہے۔

(۷) مظہر العجائب = یہ ۱۲۳۱ھ / ۱۶-۱۸۱۵ء میں کالپی میں لکھی تھی اور مطبع نولکشور سے شائع ہو چکی ہے۔

(۸) حدیقۃ الانشا = یہ ہماری نظر سے نہیں گزری۔ یہ بھی علم نہیں کہ چھپی تھی یا نہیں۔

(۹) دریائے لطافت : میر انشاء اللہ انشا، (متوفی ۱۲۳۳ھ / ۱۸-۱۸۱۷ء) کی تالیف ہے، جو ۱۲۲۳ھ / ۱۸۰۹ء میں لکھی گئی۔ اس کا آخری حصّہ جو معانی و بیان و بدیع و عروض و منطق سے متعلق تھا۔ قتیل نے لکھا ہے۔ یہ حصّہ مطبوعہ کتاب (مترجمہ برجموہن دتاتریہ کیفی طبع انجمن ۱۹۳۵ء کے صفحہ ۳۵۹ سے شروع ہوتا ہے۔

(۱۰) ہفت تماشا = یہ قتیل کی زندگی کے آخری ایام کی تصنیف ہے، اور اپنے موضوع کے لحاظ سے نہایت اہم کتاب ہے۔ یہ مارچ ۱۸۷۵ء میں مطبع نولکشور سے چھپی تھی۔ اس کے مطالب کا تعارف یہاں قدرے تفصیل سے کرایا جائے گا۔

۳

(ج) ہفت تماشا ہفت تماشا، قتیل کی تصانیف میں سب سے اہم اور قابلِ قدر کتاب ہے۔ اس کی شان نزول قتیل نے دیباچہ میں یوں بیان کی ہے۔

حاشیہ بقیہ ص ۲۶ : انہیں ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے مختصر تمہید کے ساتھ شائع کر دیا تھا (ملاحظہ ہو نور الحسن ہاشمی مرزا قتیل کے غیر مطبوعہ اردو خطوط، رسالہ نیا دور جلد ۱۹، شمارہ ۲، جون ۱۹۶۴ء) مطبوعہ نسخے میں فارسی رقعات کی تعداد ۱۸۲ ہے، ان میں کہیں کہیں نثر کی عبارت بھی فارسی کے ساتھ آگئی ہے۔

"محمد حسن قتیل کہتا ہے کہ نواب سعادت علی خاں کے عہد میں[۱] مرزا محمد حسین کربلائے معلّیٰ سے لکھنؤ تشریف لائے تو محمد آفرین علی خاں کے توسط سے حضور پُرنور نے صندوق نقرہ کے ساتھ انھیں ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱-۱۲ء میں پھر واپس بھیجا۔ میں ان کے محامد آقا محمد صادق خاں صفاہانی اور آقا ابوالحسن خاں قزدینی کی زبانی سن چکا تھا۔ اور ان دونوں کے ذریعے سے وہ بھی مجھ سے غائبانہ متعارف تھے۔ اسی وسیلے سے دو تین مرتبہ ان کی خدمت میں عریضہ بھیجا اور اس کا جواب پایا۔ انھوں نے حکم دیا کہ میں ہندوؤں کا احوال اور اس فرقے کے رسوم۔ نیز قدیم مسلمانوں کے اوضاع و اطوار اور نومسلموں کے حالات لکھوں، چنانچہ میں نے تعمیل ارشاد کی اور اس کا نام ہفت تماشا رکھا۔[۲]

بظاہر مرزا محمد حسین نے اس کتاب کی فرمائش یوں کی ہوگی کہ قتیل خود ایک معزز ہندو گھرانے سے علاقہ رکھتا ہے۔ ہندوستانی دیومالا اور رسوم مذہبی سے اچھی طرح واقف اور مع ہذا فارسی انشاپردازی پر قادر ہے۔ وہ ایک ایسی کتاب لکھ سکے گا جس سے تازہ وارد ولایتی حضرات کو ہندوستان کے مذاہب اور مختلف فرقوں کے رسوم و عقائد سمجھنے میں مدد مل سکے۔ لیکن نہ مرزا محمد حسین نے سوچا ہوگا، نہ مرزا محمد حسن قتیل نے کہ آنے والے زمانے میں یہ ایک اہم تاریخی و معاشرتی دستاویز بن جائے گی۔

اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے ہندوستان کی معاشرت پر اس کتاب میں اتنا قابلِ قدر مواد محفوظ ہے، جو اس عہد کی اور کسی کتاب میں نہیں ہے۔ اس کی مدد سے اس عہد کے شمالی ہند کی سوسائٹی کا پورا مرقع تیار ہو سکتا ہے۔

---

[۱] نواب سعادت علی خاں ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۸ء کو وسادہ آرائی ریاستِ اودھ ہوئے اور ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء تک مسند نشین رہے۔ ملاحظہ ہو۔ نجم الغنی: تاریخ اودھ جلد چہارم ص ۱ تا ۱۰۸

[۲] دیباچہ ہفت تماشا صفحات ۲ تا ۵ (یہ لفظی ترجمہ نہیں ہے۔ مطالب کی تلخیص ہے)

اس میں، جیساکہ نام سے ظاہر ہے، سات تماشے (یعنی ابواب ہیں:

پہلا باب = سمارتکوں (یعنی اہلِ تقلید) کا مذہب اور اس کے بارے میں تحقیقات

دوسرا باب = انسان کی آفرینش کا بیان

تیسرا باب = ہندو فرقوں کے عقائد

چوتھا باب = ہندوؤں کے متبرک دنوں اور تہواروں کا بیان

پانچواں باب = ہندوؤں کے رسوم و رواج

چھٹا باب = ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرت اور رسوم و رواج

ساتواں باب = بعض عجائب و غرائب

اِن ابواب میں ہندوستانی دیومالا کی روایات، جہلاء اور عوام کے عقائد، عوامی رسمیں نذر و نیاز، باہمی روابط، یا خود قتیل کی زندگی اور ذہنی افتاد سے متعلق کارآمد معلومات ملتے ہیں۔ قتیل کے بارے میں مشہور ہے کہ اثنا عشری تھا، لیکن اس کا بیان ملاحظہ فرمائیے "ایرانی ان کو امام زین العابدین (علیہ السلام) بھی کہتے ہیں مگر یہ بالکل غلط ہے کیونکہ امام حسین علیہ السلام کے ساتھیوں میں امام قاسم کے سوا کسی شخص میں اتنی لیاقت نہیں تھی کہ اسے امام کہا جائے اور محرم میں سیاہ لباس پہننے کی جو ایرانیوں کی رسم ہے۔ اس کا بانی یزید تھا اور زین العابدین ہر سال محرم میں امام حسین علیہ السلام کی یاد میں رویا کرتے تھے اور رونا خدا کی مرضی کے خلاف ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مرضی سے ان کو شہادت کے اس مرتبے پر فائز کیا جو کسی شخص کو نصیب نہیں ہوا، لہٰذا کس بات پر رونا!"[1] (تماشائے اوّل)

قتیل کی اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ محض اندھے تقلیدی عقائد ہی نہیں رکھتا تھا

---

[1] یہاں شیعہ حضرات کا یہ عقیدہ ذہن میں رہے کہ: "مَنْ بَکیٰ أَوْ أَبْکیٰ أَوْ تَبَاکیٰ وَجَبَتْ لَهُ الجنّة"، یعنی جو رو دیا یا جس نے رُلایا، یا رونے کی صورت ہی بنائی اس پر جنت واجب ہو گئی۔
قتیل نے جو کچھ لکھا ہے یہ عقیدہ اہلِ تشیع کے سراسر خلاف ہے۔

بلکہ بہت سے امور میں اس کی آزادانہ رائے تھی، جو اس نے عقلی دلائل کی روشنی میں قائم کی تھی۔ ایسی آرا کے اظہار میں وہ پوری بے تکلفی سے کام لیتا ہے حتیٰ کہ خود کھتری گھرانے سے تعلق رکھتے ہوئے بھی وہ یہ لکھتا ہے کہ "اس زمانے میں اصیل النسل کھتری روئے زمین پر باقی نہیں رہے ہیں اور جس قدر بھی ہیں وہ لوگ برہمن کے نطفے سے ہیں۔ کیونکہ اس جماعت کے مردوں کے قتل کے بعد ان کی بچی ہوئی عورتوں کو پرس رام نے اپنے بھائیوں کے حوالے کر دیا تھا اور ان کے بطن سے جو اولاد وجود میں آئی وہ برہمن کے بجائے کھتری کے لقب سے ملقب ہوئی (تماشائے اوّل)

اس عہد کی معاشرت میں شرافت اور حسب نسب کے معیار بہت سخت اور تقلیدی قسم کے تھے۔ ایک تو مسلمانوں میں پہلے ہی سے عرب کے تفاخر نسبی کا اثر تھا۔ پھر ایرانی حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے تو وہ بھی کسی سے کم نہ تھے۔ انھوں نے عربوں کے نسب میں بھی کیڑے نکال دیے، چنانچہ خلفائے عباسیہ کے زمانے میں جب عربوں کے خلاف شعوبیہ تحریک نے زور پکڑا تو متعدد کتابیں مثالب العرب (عربوں کی برائیاں) کے موضوع پر وجود میں آگئیں[1]

اگر عرب اپنی نسل اور نسب پر اتراتے تھے تو عجم والے بھی اپنی شوکتِ باستان پر نازاں تھے، یہ دونوں اثرات لے کر مسلمان ہندوستان پہنچے۔ تو یہاں کے باشندے ان سے بھی ایک قدم آگے نظر آئے یعنی انھوں نے پوری انسانیت کو اونچ نیچ کے خود ساختہ معیاروں سے تقسیم کر رکھا تھا۔ اور خود خلاصۂ کائنات بنے بیٹھے تھے۔ یہاں پیشہ وروں کی بڑی جماعت "شودر" کا درجہ رکھتی تھی۔ اہل ہند نے مسلمانوں کو بھی شودروں کی صف میں جگہ دی[2]۔ چونکہ اسے مذہبی عقیدے کے طور پر اختیار کیا گیا تھا۔ اس لیے مسلمانوں نے کبھی اپنی اس عزت افزائی

---

[1] تفصیل کے لیے: محمد بنیہ حجاب۔ مظاہر الشعوبیۃ فی الأدبِ العربی (مصر ۱۹۶۱ء) نیز احمد امین۔ ضحی الاسلام۔ [2] ملاحظہ ہو۔ ہفت تماشا (باب دوم)

پر ہندوستان والوں سے تعارض نہیں کیا، اور اسی حیثیت میں رہنا منظور کرلیا۔ نسل انسانی کی یہ تحدید اور ذاتوں کی تنگ نظری کے ساتھ تقسیم۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے قدم جمانے میں یقیناً بہت معاون ہوئی ہوگی[۱] چنانچہ انھیں شودروں کے ایک بڑے طبقے کی ہمدردی حاصل ہوگئی جنھیں ابھی تک سوسائٹی نے بنیادی معاشرتی حقوق سے بھی محروم کر رکھا تھا۔ مساوات کا سبق انھوں نے پہلی بار مسلمانوں سے پڑھا اور اس کا آنند محسوس کیا۔ اگرچہ یہاں کے "ذات پات" کے تصورات سے خود مسلمان بھی کسی نہ کسی درجے میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس عہد کے مسلمانوں میں بھی نسب کے ساتھ حسب (پیشے) پر بہت مبالغے کے ساتھ زور دیا جاتا تھا۔ اگر کسی ایسے خاندان کا شخص ترقی کر کے سماجی امتیاز حاصل کرلے جس کے رشتے دار مثلاً کلال رہے ہوں، (جن کا حسب یہ تھا کہ یا تو بادشاہ کی ذاتی خدمت سے متعلق ہوتے تھے، یا فراش اور حاجب وغیرہ ہوتے تھے، یا شراب کشید کرنے اور بیچنے کا کام کرتے تھے، یا بہت ہی غریب ہوئے تو پانی بھرتے تھے) تو وہ اپنے خاندان کو چھپانے لگتا تھا۔ مثلاً مصحفی کلال فرقے سے تعلق رکھتا تھا[۲] اس نے

---

[۱] ELLIOT & DOWSON VOL. 11 (INTRODUCTION BY PROF HABIB)

متی کلال کا واقعہ ذہن میں رہے جو شاعر تھا اور جہانگیر کا حاجب بھی تھا۔ اس نے نورجہاں سے منت کر کے سفارش کرائی کہ شہنشاہ میرے کلام کو شرف سماعت فرمائیں۔ جہانگیر نے اسے موقع دیا جب اس نے یہ شعر پڑھا:

مئی بہ گریہ سرے دار دائے نصیحت گر ‌ ‌ ‌ کنارہ گیر کہ امروز روز طوفان است

تو جہانگیر نے اسے پڑھنے سے روک دیا اور طنزاً کہا کہ پیشے کی رعایت یہاں بھی نہ چھوڑی؟

(سرخوش: کلمات الشعرا ص ۱۰۹)

[۲] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ راقم الحروف کا مضمون "ذکر مصحفی" مطبوعہ رسالہ برہان دہلی ۱۹۵۷ء۔

اپنے ہم چشموں سے اپنے خاندان کا حال تابمقدور مخفی رکھا اور ایک موقع پر عبدالقادر رامپوری کو یہ اطلاع دی کہ میں بلّم گڈھ میں پیدا ہوا تھا[1] مگر میرا خیال ہے کہ اس نے مصلحتاً غلط بیانی سے کام لیا۔ اس لیے کہ عبدالقادر رامپوری امروہے کے خاندانوں سے ذاتی طور پر واقف تھا اور وہ ایک زمانے میں امروہے کا تھانے دار بھی تھا[2] اسی طرح میر سیادت کے مدّعی ہیں۔ ممکن ہے کہ ماں کی طرف سے وہ فاطمی ہوں مگر ان کے ہم عصروں[3] نے ان کے حسب پر ایسا طعن کیا ہے جس سے شبہ ہوتا ہے کہ ان کے خاندان میں کسی وقت نان بائی کا پیشہ ہوتا تھا۔ قتیل نے اس کے زمانے کے ان تصوّرات کو قدرے تفصیل سے

---

[1] وقائع عبدالقادر خانی (اُردو ترجمہ) ج ۲ ص ۱۶۱ [2] وقائع عبدالقادر خانی (اردو ترجمہ) ج ۲۔ص ۹۹ [3] مثلاً میر کی آپ بیتی ۹۸/۰ نیز دلی کالج میگزین (میر نمبر) مرتبہ راقم الحروف، صفحات ۲۸، ۵۵، ۵۶، (کلیاتِ میر میں بھی ایسے اشعار مل جاتے ہیں جن میں سیادت کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ میر نے اپنے سوتیلے بھائی محمد حسن کے نام کے ساتھ کہیں "میر" نہیں لکھا۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید ان کی ماں فاطمی ہوں، مگر اپنے باپ کو بھی وہ "میر محمد علی" لکھتے ہیں۔ میر کی آپ بیتی (طبع اوّل/۹۱)

مثلاً سودا کا یہ قطعہ:

بیٹھے تنورِ طبع کو جب گرم کر کے میر ۔۔۔ کچھ شیرمال سامنے کچھ نان کچھ پنیر
میری کے اب تو سارے مصالح ہیں مستعد ۔۔۔ بٹیا تو گندنا ہے اور آپ کو نھ میر

(آبِ حیات طبع دہم/۲۰۴)

یا قائم چاند پوری کے دیوان (قلمی نسخہ انڈیا آفس لندن) میں یہ رباعی ملتی ہے:

روٹی کے لیے کہائے تم بھڑجی میر ۔۔۔ کہیے تو بجا ہے آپ کو خبز خمیر !
پر میر ہوتے یہ اس طرح کے جیسے ۔۔۔ ساگوں میں ہے کوتھ میر راگوں میں ہمیر

خود میر نے بھی ذکرِ میر میں کبود جامہ کے سیرابہ پز (نہاری فروش) کا قصہ عجیب رمزیہ انداز میں بیان

(باقی ص ۳۳ پر)

پیش کیا ہے، اور بظاہر وہ ان مروّج اقدار کا مخالف نہیں۔ ہمدرد ہے۔

وہ کہتا ہے کہ "بعضے امیر مرثیہ خوانوں کو بھی محرم کے سوائے اپنی مجلس میں بٹھانے کے لائق نہیں سمجھتے"۔ ۱؎ حالانکہ محرم کے دنوں میں ان روضہ خوانوں کی بڑی آؤ بھگت کرتے تھے۔

سمارتکوں کے بیان میں قتیل نے یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ ان کی بت پرستی ایسی نہیں ہے کہ وہ بتوں کو خدا یا خدا کا مظہر سمجھتے ہوں ...... عقیدہ خواص ہی قابل اعتبار ہے ...... لیکن اس فرقے کے عوام یقیناً بتوں کو خدا سمجھتے ہیں" ۲؎

اس کے بعد فرقۂ چارواگ کا ذکر ہے، جو عبادت بدنی و مالی کا معتقد نہیں ہے، یہ مسئلہ مسلمانوں میں بھی نزاعی رہا ہے۔ چنانچہ سر سید احمد خاں نے اس سلسلے میں متعدد مضامین لکھے ہیں۔ وہ بھی عبادت بدنی کے قائل نہیں تھے۔ پھر سراوگی کا بیان ہوا ہے۔ جس کے ہاں اہنسا کا عقیدہ نہایت مضحک صورت اختیار کر گیا ہے۔ آج بھی یہ بات غور و فکر کا سنجیدہ موضوع ہے کہ ہمارا ملک، جہاں ایسے لوگ بھی آباد ہیں جو "جیو ہتیا" سے بچنے کے لیے ناک پر کپڑا باندھتے ہیں اور جو نظریاتی حیثیت سے دنیا کے تمام ممالک سے زیادہ عدم تشدد کا حامی ہے، اعداد و شمار کی روشنی میں یہاں کے باشندے دنیا کے سب سے زیادہ متشدد ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان نظریات پر اتنے مبالغے سے زور دینے کا مقصد بھی یہی ہے کہ ہندوستانی باشندوں کو اپنے اس امتیاز کا احساس رہا ہے حال ہی میں ایک روسی پروفیسر نے ایسے اعداد و شمار پیش کیے تھے جن میں بتلایا گیا تھا کہ ہندوستان میں عوامی بلووں کا سالانہ اوسط دنیا کے دوسرے سب ممالک سے

بقیہ حاشیہ ص ۳۲: کہا ہے۔ اگرچہ کوئی دستاویزی ثبوت ملنا مشکل ہے۔ لیکن میرا خیال یہی ہے کہ میر کے خاندان میں کچھ لوگ اس پیشے سے متعلق رہے ہوں گے۔

حاشیہ ص ہذا: ۱؎ ہفت تماشا (باب دوم) ۲؎ مرزا مظہر بھی ان صوفیا میں ہیں جو ہندوؤں کی بڑی جماعت کو "مشرک" نہیں سمجھتے (کلمات طیبات مکتوب چہارم و ہم)

زیادہ ہے۔ ایسی ہی بات ایک مستشرق نے ایرانیوں کی نسبت لکھی ہے کہ فارسی میں اخلاقی شاعری کی جتنی مقدار ہے اور جس بڑی تعداد میں اخلاقیات پر کتابیں لکھی گئی ہیں، اور ان میں جابجا سچائی۔ راستی اور ایمانداری کی تبلیغ میں جو مبالغہ کیا گیا ہے اس کا سبب یہی ہے کہ ایرانی باشندوں میں ان صفات کا دوسری سب قوموں کی نسبت بہت زیادہ فقدان ہے۔

ممکن ہے یہ تاریخی عمل ہو یا سیاسی اور اقتصادی صورتِ حال کا ردِّ عمل، یا جغرافیائی اثرات کا کرشمہ، کہ ہندوستانی فلسفے کے تمام مذاہب عدم تشدد کی کیلی پر گھومتے ہیں۔ اب ہمارے زمانے میں گاندھی جی بھی اِن نظریات میں اتنے متشدد تھے کہ انھوں نے ایک بار دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں یہ بیان دے دیا تھا کہ ہمارے ملک پر اگر جاپان نے حملہ کیا تو ہم سرحد پر ہار لے کر کھڑے ہو جائیں گے۔ اور ان کا استقبال کریں گے! ان کا مطلب یہ تھا کہ ہم اہنسا کی پالیسی پر بدستور قائم رہیں گے۔ مولانا آزاد کا بیان ہے کہ انھوں نے گاندھی جی کے اس بیان پر احتجاج کیا اور اس کی تردید شائع کرائی تھی [1]

مسلمانوں کے زمانۂ اقتدار میں، عالمی قانون کا تقاضا تھا، کہ محکوم قومیں ان کے قریب آنے کی کوشش کریں، کلچر سے بڑھ کر یہ بات مذہبی عقائد تک پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ اسی کتاب میں آپ حسینی برہمنوں کا حال دیکھیں گے [2] کہ انھوں نے اپنا ناتا کس طرح واقعاتِ کربلا سے جوڑ دیا ہے۔ یا جے پور کے اولوالعزم مہاراجہ کا رشتہ یوں قائم کیا ہے کہ ان کے اجداد نوشیروانِ عادل کی نسل سے تھے اور "راجپوتوں سے ہمشیر زادگی کا رشتہ ثابت کرتے ہیں اور اسے حضرت شہر بانو کے واسطے سے کہتے ہیں جنھیں حضرت علی اصغر کی عجمی والدہ سے

---

[1] AZAD: INDIA WINS FREEDOM: PP. 31، 39.

[2] اس فرقے کے لوگ خال خال ہیں، ان کی خصوصیت یہ تھی کہ ہندوؤں کے آگے کبھی دستِ سوال دراز نہیں کرتے۔ مسلمان جو کچھ دیتے ہیں اس پر بسر اوقات کرتے ہیں

* * *

نسبت ہمشیرزادگی تھی ... ... یہ راجپوت نوشیرواں عادل کی نیک نامی اور اسلام کے طنطنے پر نظر رکھتے ہوئے اس فرضی قرابت کا اقرار کرتے ہیں اور اسے آخرت کا سرمایہ سمجھتے ہیں۔[1]

ایسی روایات بھی زبان زد ہوجاتی تھیں کہ کربلا میں حضرت حسینؑ کی حمایت کرنے کے لیے ہندوستان سے ساہس رائے نامی ایک شخص بھیجا گیا تھا۔ پریم چند نے اسے اپنے ڈرامے کربلا کا کردار بنا دیا ہے۔[2] تاریخی اعتبار سے تو یہ سب خرافات ہیں، لیکن ایسی روایتوں کے بین السطور میں ہم بہت کچھ پڑھ سکتے ہیں۔

اسی ذیل میں شنوی فرقہ بھی آتا ہے، جس کا ذکر قتیلؔ نے باب دوم میں کیا ہے۔ "ان کی عادت ہے کہ رمضان کا چاند دیکھ کر عید تک خوب نمازیں پڑھیں گے۔ ہندو مذہب کے برت بھی رکھیں گے۔ محرم میں تعزیہ داری کریں گے اور کالکاجی کے میلے میں جاکر کالکا مندر کے سامنے ناچیں گے بھی۔ متھرا اور بندرابن میں آرتی اور اشلوک پڑھیں گے۔ گائے اور سور کے گوشت سے پورا پورا پرہیز کریں گے، وغیرہ۔ ان کے نام مسلمانوں جیسے ہی ہیں۔ قتیلؔ نے ان کی ابتداء کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ انھوں نے جبر و اکراہ سے اسلام قبول کیا ہوگا[3] اور بعد میں ان کے لیے ہندوؤں میں بھی گنجائش نہیں رہی۔ مجبوراً آدھا تیتر آدھا بٹیر ہوکر رہ گئے۔ یا پھر شک اور جہالت میں گرفتار ہیں۔" یہ اسباب بھی ہو سکتے ہیں؛ لیکن میں اس کی تعبیر یوں کروں گا کہ ہندو معاشرے میں انصاف اور سماجی مساوات نہ ملنے

---

[1] ہفت تماشا (باب دوم) [2] ملاحظہ ہو: "پریم چند کے ڈرامے"، از راقم الحروف (مشمولہ دید و دریافت) نیز زمانہ کانپور پریم چند نمبر [3] قتیل نے چھٹے باب میں یہ بھی لکھا ہے کہ ڈولے کی رسم جو اکبر کے زمانے سے شروع ہوئی۔ جبر و اکراہ کی وجہ سے تھی ممکن ہے۔ ابتدا میں ایسا ہی ہو، لیکن یہ رسم تو بہادر شاہ ظفر کے عہد تک نبھائی گئی ہے۔ جس غریب کا اختیار اپنے اوپر بھی نہ رہا تھا۔ میں اسے مخلوط کلچر کی دین سمجھتا ہوں۔ اس میں سیاسی قوت یا بالادستی کے خوف کو کچھ دخل نہ تھا۔

⁂ ⁂ ⁂

کی وجہ سے انھوں نے اسلام قبول کیا، چونکہ ان کو اتنی تعلیم نہ مل سکی کہ وہ اپنے ہزاروں برس کے خرافاتی تصوّرات اور تہذیبی و سماجی معمولات کو بھی بدل سکیں۔ اس لیے انھوں نے مذہبی عقیدوں میں لچک پیدا کرلی۔ یعنی ان کا مذہب اسلام رہا اور تہذیب ہندو۔ آج بھی ہندوستان کے بیشتر دیہاتوں میں ایسے لوگ مل جائیں گے جو باعتبار خاندان مسلمان ہیں۔ لیکن تمام تر ہندو مذہب میں رنگے ہوئے ہیں [۱] خصوصاً ان علاقوں میں جو مسلمانوں کے تہذیبی اور علمی مراکز سے دور جا پڑے ہیں، جیسے راجستھان، گجرات، مدھیہ پردیش وغیرہ۔ یہ لوگ صحیح معنوں میں دو مختلف تہذیبوں کے سنگم کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اس سے غرض نہیں کہ یہ نمونہ اچھا ہے یا اسے مذموم سمجھا جائے۔

فینٹن نے لکھا ہے کہ ہندوؤں کے اور فرقے بھی ایسے ہیں جو مسلمانوں کے رہن سہن اور خوراک اور پوشاک کو پسند کرتے ہیں اور ان کی گفتگو سے متاثر ہو کر یا اہلِ اسلام کی شان و شوکت دیکھ کر متحیر ہو جاتے ہیں اور جوق در جوق صوفیوں کی اطاعت میں آجاتے ہیں۔ ان میں بہت سے لوگ شیعوں کی حکومت ہونے کے باعث تشیع کی طرف جھکتے ہیں۔ یہ الزام تو بہت پرانا ہو چکا کہ اسلام تلوار کے ذریعے پھیلا، ہندوستان کی حد تک تو یہ بہت آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مغلوں کی شائستگی اور کلچر کی برتری نے یہاں کی قوموں کو تبدیل مذہب پر آمادہ کیا۔ اس کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہوگی۔

فینٹن نے انگریزوں کے ملکی نظم و نسق کی تعریف کی ہے۔ اس سے بالواسطہ دیسی

---

[۱] اسلام کے ہر دور میں اور ہر علاقے میں یہ ہوا ہے کہ تبدیل مذہب کرنے والے اپنا تہذیبی اور تاریخی سرمایہ لے کر اسلام میں داخل ہوئے اور پھر انھوں نے اسلامی عقائد و تصورات کو ان سے مسخ یا متاثر کیا ہے۔ اس کا نہایت دل چسپ تجزیہ پروفیسر احمد امین المصری نے اپنی کتاب فجر الاسلام اور ضحی الاسلام میں کیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد اشرف کی آپ بیتی بھی ملاحظہ فرمائیے۔ جو نقوش (لاہور) کے آپ بیتی نمبر میں شامل ہے۔

انتظام کی خرابیوں کا علم ہوتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ شاہی دقتوں میں اکثر سنیاسیوں اور بیراگیوں میں کشت و خون ہوتا تھا مگر اب "صاحبان عالی شان انگریز بہادر کے نظم و نسق کی وجہ سے یہ لوگ سر نہیں اٹھا سکتے ۔۔ ۔۔ ۔۔ یہ رعب خداداد ہے ورنہ اتنی بڑی جماعتوں سے کسی قدیم عادت کا چھڑا دینا محالات میں سے تھا۔ ؎۱

دوسرے موقع پر اس نے انگریزی ڈاک کے نظام کی تعریف کی ہے، اور یہ لکھا ہے کہ اس میں خط ہرگز گم نہیں ہوتا، دیسی ڈاک میں ضائع ہو جاتا ہے "خطِ احدے در ڈاک انگریزی تلف نمی شود اگر مکتوب الیہ کہ خط برائے اوست ہم بجائے حرکت کند باز خط را ضائع نمی کنند یا بمکتوب الیہ می رسد، اگر در ہماں قرب وجوار تردد دارد، والّا بہر کہ نوشتہ است واپس می دہند۔ بخلاف ڈاکِ جناب عالی کہ ہمیشہ در چہار خط دو خط بباد می رود ؎۲

اس طرح ناگے سنیاسیوں کا بیان پڑھ کر یہ سمجھ میں آجائے گا کہ امرائے ریاست ان لوگوں کو اپنے مقاصد کے لیے کیوں ملازم رکھتے تھے، مثلاً شجاع الدولہ کی سرکار ہی میں کئی سو ناگے ملازم تھے ؎۳

بید انتیوں کے ذیل میں قتیلؔ نے صوفیا کا بھی ذکر کیا ہے اور کہتا ہے کہ "تحفہ اثنا عشریہ کے مصنف مولوی عبدالعزیز کے والد شاہ ولی اللہ محدث اپنی تصنیف موسومہ بہ نور العین فی تفضیل الشیخین میں لکھتے ہیں کہ علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہ نے اس جماعت کو قتل کر دیا تھا۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ وہ لوگ باطل کے پیرو تھے۔ کیونکہ علی کا انھیں قتل کرنا اس جماعت کے عقائد کے باطل ہونے کی قوی دلیل ہے۔ اصل خواہ کچھ ہی ہو اس کا مفہوم یہی ہے جو میں نے لکھا ہے" ؎۴

؎۱ ہفت تماشا (باب دوم) ؎۲ معدن الفوائد /۱۱ ؎۳ نجم الغنی: تاریخ اودھ جلد دوم۔
؎۴ ہفت تماشا (باب دوم)

صوفیا کے بارے میں قتیل کی رائے سنی سنائی معلوم ہوتی ہے وہ محی الدین ابن عربی کی فصوص الحکم کے حوالے سے لکھتا ہے کہ "اس جماعت کا ہر فرد اپنے تئیں خدا سمجھتا ہے" یہ غلط محض ہے، اسی طرح یہ قول کہ "صوفیوں کے اعمال وہی ہیں جو بیدانتیوں کے اعمال ہیں" بہت عامیانہ انداز کا ہے۔ فلسفہ بیدانت کا اثر ہندوستانی صوفیا کے افکار پر ضرور پڑا ہے۔ لیکن اس میں بہت زیادہ مماثلت مغلوں کے دور میں پیدا ہوئی۔ اسی فکری ارتباط کا نتیجہ دارا شکوہ کی مجمع البحرین[۱] ہے۔ اس سے پہلے صوفیا کے عقائد (خصوصاً مغلوں سے ماسبق عہد میں) ایرانی اثرات کے حامل تھے، انہیں بیدانتی نہیں کہا جا سکتا۔ قتیل نے چشتی سلسلے کے بارے میں یہ کہا ہے کہ "رقص و وجد جو چشتیہ سلسلے میں رائج ہے انھوں نے بیراگیوں سے سیکھا ہے کیونکہ وہ لوگ بھی اکثر بتوں کے سامنے رقص کرتے تھے"۔ یہاں بھی قتیل نے سطحی معلومات پر بھروسا کیا ہے۔ ایران میں تو بیراگی نہ تھے، وہاں رقص و سماع کا ذکر حافظ شیرازی ہی کے بیشتر اشعار میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً

بہیں کہ رقص کناں می رود نالۂ چنگ
کسے کہ اذن نمی داد استماع سماع

اسی طرح وہ بعض خرافی روایات کی تطبیق پر قیاس کرتا ہے۔ مثلاً ایک قصہ سکھدیو اور جنک مس کا بیان کر کے لکھتا ہے کہ میں نے کسی کتاب میں یہی قصہ چشتیوں کے پیشوا ابراہیم آدہم سے منسوب دیکھا ہے۔ اس قسم کی روایات، کرامات، یا خرافی حکایات کسی فیصلے کا مدار نہیں ہو سکتیں۔ یہ تو اسلام اور یہودیت و عیسائیت میں بھی مشترک ہیں[۲]

---

[۱] دارا شکوہ: مجمع البحرین، مرتبہ محمد محفوظ الحق۔ طبع کلکتہ ۱۹۲۹ء۔ [۲] ڈاکٹر رادھا کرشنن نے ہندو فلسفہ و تہذیب کے اثرات سے بحث کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہندوستانی رسوم و عقائد سے مسلمانوں کے دوسرے فرقوں کی نسبت شیعہ سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ انھوں نے غالباً رسوم تعزیہ داری پر قیاس کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

(باقی ص ۳۹ پر)

غرض کہ صوفیا کے بارے میں قتیل نے جو کچھ لکھا ہے اس میں تین باتوں کو خاص طور سے ملحوظ رکھا جائے۔ اوّلاً یہ کہ وہ صوفیانہ سوپرچیاس کرتا ہے، ثانیاً اسے تصوّف کا نہ عملی تجربہ ہے نہ کتابی علم ہے، سوم یہ کہ وہ بہرحال شیعہ ہے اور شیعوں کے زمانۂ اقتدار میں تصوف کے خلاف جو ذہن پیدا ہو گیا تھا۔ اس کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اس نے جو کچھ لکھا ہے اس کا معتد بہ حصّہ قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ اگر اعتراض کا رخ تصوف سے ہٹ کر محض بناوٹی صوفیوں اور تصوف کی قبیح رسوم و عقائد کی طرف ہو۔ لیکن اسے بے دلیل اور علی الاطلاق رد کرنا، سوائے مذہبی تنگ نظری کے کچھ نہیں ہو سکتا۔

اس سے قطع نظر ان مماثل حکایتوں میں جو ہندوؤں کے اوتاروں اور مسلمانوں کے صوفیوں سے منسوب کر دی گئی ہیں، ہندوستانی فکر اور اسلامی تصوف ایک دوسرے سے قریب آتے ہوئے تلاش کئے جا سکتے ہیں اور ان کا گہرا مطالعہ ہمیں بعض اچھے علمی نتائج تک پہنچا سکتا ہے۔

باب چہارم میں ہندوستانی تہواروں کا ذکر ہے۔ اس کے مطالعے سے واضح ہو گا کہ اپنی حکومت کے زمانے میں مسلمان یہاں کے تہواروں میں عام طور سے حصّہ لیتا تھا۔ نہ صرف بادشاہ اور امراء ہندوستانی تہوار مناتے تھے۔ جن کی تفصیلات تاریخ کی کتابوں میں مل سکتی ہیں بلکہ عوام بھی پورے جوش و خروش سے شرکت کرتے تھے، اگرچہ ان کے بعض رسوم و اعمال اسلامی عقائد کے صریحاً خلاف نظر آتے ہیں۔ مثلاً دسہرے کے بعد ہندو عوام میں نیل کنٹھ کے دیدار کا رواج ہے، اکثر مسلمان بھی اس میں ان کے مقلد تھے[1] اسی طرح ہولی مسلمانوں میں بھی کھیلی جاتی تھی۔ نیز دیوالی کے سلسلے میں مسلمانوں کے رسوم کا

حاشیہ ص ۳۸: RADHAKRISHNAN: EASTERN PHILOSOPHY AND WESTERN THOUGHT. (OXFORD, UNIVERSITY, 1964.)

حاشیہ ص ہذا: [1] ہفت تماشا (باب چہارم)

[2] ہفت تماشا (باب چہارم)

جو بیان قتیلؔ نے کیا ہے وہ خاص طور سے توجہ کے لائق ہے۔ انگریز بہادر نے اپنے سیاسی مقاصد کے لیے اس اتحاد و ارتباط میں رخنے پیدا کر دیے اور ہولی کا رنگ مسلمانوں پر ڈالنا خلاف قانون بنا دیا[۵] تا آنکہ مسلمان رفتہ رفتہ ہندوستانی تہواروں سے دست کش ہو گئے۔

لیکن اس بیان کو حجت بنا کر یہ نہ کہا جائے کہ اب ان روایات کو زندہ کرنے میں کیا مانع ہے۔ کیونکہ آج ہندوستانی مسلمانوں کا موقف اس زمانے سے قطعاً مختلف ہے۔ اب سیاسی مصالح سامنے آتے ہیں اور صدیوں کی بنی ہوئی خلیج ایک دن میں پاٹی نہیں جا سکتی۔ اپنی غلطی کا اعتراف اور دوسروں کی کوتاہی سے درگزر کرنے کے لیے بڑی عالی ظرفی اور بلند حوصلگی کی ضرورت ہے، ان سب کے ماسوا آج ہندوستان کا طبقہ اکثریت احساس برتری میں مبتلا ہے، اور اس کا ردّ عمل مسلمانوں پر لازماً احساسِ کمتری کی شکل میں ہو رہا ہے۔ اس لیے موجودہ حالات میں یہ بہت دشوار ہو گیا ہے کہ ایک بڑا طبقہ مخلوط تہذیب کو نظری اور عملی سطح پر برابر جھٹلاتا رہے۔ پھر بھی اقلیت سے یک طرفہ تعاون حاصل رکھے۔ ماضی کی ان شیریں روایات کو زندہ کرنے کے لیے دونوں فریقوں کو اپنی ذہنی سطح میں بہت کچھ فراز پیدا کرنا ہوگا۔

ہندوستانی تہواروں کے بیان میں یا ہندوستانی شادی بیاہ کی رسموں میں عرسوں، میلوں، ٹھیلوں، نذر نیاز اور ایسی ہی دوسری معاشرتی چیزوں میں یہاں کے مسلمانوں نے ہندو طرز معاشرت کا کتنا گہرا اثر قبول کیا، اس کا بیان تاریخ کی کتابوں میں جا بجا ملے گا اور اس کتاب میں یکجا بہت کچھ مل جائے گا لیکن ان باتوں کا تعلق زیادہ تر عوام سے یا متوسط طبقوں سے ہے۔ اعلیٰ فکری سطح پر بھی ہمیں اس تہذیبی اختلاط کی شہادتیں مل سکتی ہیں۔ خصوصاً صوفیانہ افکار کے وسیلے سے عجمی اور ہندی اثرات اسلامی فکر تک بہت آسانی سے پہنچ گئے تھے۔ پھر بھی جس چیز نے ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی اور فکری انفرادیت

---

[۵] ہفت تماشا (باب چہارم)

کو برقرار رکھا، وہ دو نمایاں باتیں تھیں۔ ایک تو اسلامی فقہ کی جامعیت اور زندگی کے تمام مسائل و معاملات کا احاطہ، یعنی مسلمان ملوک اور امرا، اپنے غلط اعمال کی بھی فقہی تاویل و توجیہہ تلاش کرتے تھے اور اپنے تئیں اسلامی فقہ کی گرفت سے آزاد نہیں سمجھتے تھے[۱] پس یہ تو ممکن تھا کہ وہ جس مسلک میں اپنے لیے عملی سہولت دیکھیں اسے اختیار کرلیں، لیکن اسلام نے جس طرح نکاح، طلاق، بیع و شریٰ اور مذہبی فرائض کی شرعی حد بندی کر دی تھی۔ اس کا لازمی تقاضا تھا کہ وہ بحث بڑھتے بڑھتے جزئی مسائل تک پہنچ جائے۔ تعبیر کی غلطی نے ہمیشہ ہر فلسفے کو مسخ کیا ہے۔ یہاں بھی یہ آزادی "حلتِ غراب" کی بحثوں تک پہنچی۔ لیکن مجھے سر دست صرف اس مسئلے سے سروکار ہے کہ فقہی حد بندیوں نے مسلمانوں کی معاشرتی انفرادیت باقی رکھنے میں غیر معمولی رول ادا کیا ہے۔

دوسری خصوصیت مسلمانوں کی تہذیبی برتری تھی۔ وہ اپنی میراث میں عرب و عجم کی ہزار دو سال کی تاریخ اپنی پشت پر لے کر آئے تھے اور انھیں اس کی ضرورت نہیں تھی کہ نشست و برخاست کے معمولی آداب سے لے کر مہمات مسائل تک کہیں بھی وہ دستِ نگر رہے ہوں۔ خود ایرانیوں اور ترکوں کی تہذیبی میراث اتنی قیمتی تھی کہ نہ صرف مسلمانوں کے معاشرتی

---

[۱] تاریخ کی کتابوں میں اس کی بہت دلچسپ مثالیں ملیں گی، ازاں جملہ وہ واقعہ یاد کرنا چاہیے جو ملا عبدالقادر بدایونی نے اکبر کے درباری فقہا کے سلسلے میں لکھا ہے کہ اس نے سوال کیا بیک وقت کتنی عورتوں کو نکاح میں رکھنا جائز ہے۔ فقہا نے تین سے اٹھارہ تک مختلف عدد بتائے۔ آخر بدایونی نے کہا کہ "متعہ امام مالک اور شیعہ علمار کے نزدیک مباح، امام شافعی اور امام اعظم کے نزدیک حرام ہے۔ جب مالکی مذہب کا قاضی اس کا حکم باضابطہ صادر کر دے تو اس وقت امام اعظم کے مذہب میں بھی باتفاق مباح ہو جاتا ہے"۔ بادشاہ نے فرمایا ہم قاضی حسین عرب مالکی کو قاضی بناتے ہیں، اور قاضی یعقوب کو آج سے معزول کرتے ہیں۔ اسی وقت قاضی حسین کو وکیل بنایا گیا اور اس نے متعہ کے جواز کا فتویٰ دیدیا۔ (بدایونی: منتخب التواریخ، اردو ترجمہ/ ۴۳۸-۴۳۹)

تقاضوں کی تکمیل کر سکے بلکہ دوسری اقوام کے لیے بھی نمونہ بننے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

ہندوستان کی معاشرت کا بیان پہلی بار قدرے تفصیل سے بابر نے اپنی توزک میں کیا ہے۔ اس سے یہ دیکھنا چاہیئے کہ مغل شائستگی نے یہاں قدم جمائے اور شیوع حاصل کیا تو ہندوستانی سوسائٹی کا کیا رنگ تھا۔ ایک تو حاکمانِ وقت کی تہذیب اور فیشن قدرتی طور پر سند اور نمونہ بن جایا کرتا ہے۔ دوسرے یہاں کی تہذیب کمتر ہونے کے ساتھ بہت ہی محدود طبقے میں سمٹی ہوئی تھی۔ اس لیے پہلی بار تہذیبی قدروں کی تعمیر مسلمانوں ہی کے دور میں ہوئی۔ یہ تہذیب کیا تھی؟ اسے چند لفظوں میں بتانا مشکل ہے۔ اس کتاب کے سوا شرر کی کتاب "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" بھی ذہن میں رکھیے تو زیادہ واضح تصویر ذہن میں آسکتی ہے۔

مسلمانوں کے اثر سے یہاں کے ہندو شرفا کی خواتین نے بھی پردہ شروع کر دیا تھا اور وہ اس میں مسلمانوں سے زیادہ اہتمام کرنے لگے تھے۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنی خود نوشت میں لکھا ہے کہ ان کے بچپن تک بنگال کی شریف ہندو عورتیں اتنا سخت پردہ کرتی تھیں کہ انھیں گنگا اشنان کرنا ہوتا تھا تو پالکی میں سوار ہو کر جاتی تھیں جس پر چاروں طرف سے پردہ پڑا رہتا تھا، اور انھیں پالکی سمیت دریا میں غوطہ دیا جاتا تھا۔[1] فیبتل نے بھی لکھا ہے کہ اٹھارھویں صدی میں معیار تہذیب و شرافت یہ تھا کہ مسلم تہذیب سے کتنی مماثلت ہے "جن ہندوؤں کو مہذب مسلمانوں کی صحبت میں رہنے کا اتفاق ہوا ہو، یہ دستور ہے کہ لڑکا صبح کو بیدار ہو کر اپنے والد کو سلام کرتا ہے۔ چاہے وہ ایک ہی کمرے میں سوئے ہوں اور ان میں تربیت یافتہ لڑکے اپنے باپ کو "آپ" سے مخاطب کرتے ہیں۔ ... اس گروہ کے اکثر لوگ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی

---

[1] Krishna Kirpalani: Rabindranath Tagore: A Biography. (London, 1962) P. 18.

کے نام کی ہنسلی اپنے بچوں کے گلے میں ڈالتے ہیں اور ان کی نیاز کا کھانا پکواتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر لوگ شیعی عقیدے کی طرف مائل ہو کر اپنے بچوں کے نام کا تعزیہ مسلمانوں کے گھروں سے اٹھواتے ہیں۔ کچھ لوگ صوفیوں کے عقائد کی پیروی کر کے اپنے بھائیوں سے چھپ کر، مسلمانوں کو عرس کے لیے روپیہ دیتے ہیں، اور کسی چشتیہ، قادریہ، یا سہروردیہ سلسلے کے بزرگ کا عرس کراتے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ اپنی عورتوں کو پردے میں بٹھاتے ہیں اور مسلمانوں کی تقلید میں انھیں چوپالے کی سواری میں اپنے رشتہ داروں کے ہاں بھیجتے ہیں،، لے

اس کتاب میں فضیل نے ہندوستانی فرقوں کی ان رسموں کا بیان بھی کیا ہے جو پیدائش سے موت تک انجام پاتی ہیں۔ انھیں اس نظر سے دیکھنا چاہیے کہ تہذیبی اختلاط کے اس دور میں یہ رسوم مسلمانوں کی زندگی میں کہاں تک اثر انداز ہوئیں۔ یہ مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

دنیا میں جہاں کہیں اقتصادی تقسیم ناہموار رہی ہے اور عام لوگوں کو اپنی ضروریات زندگی میں دوسروں کا دست نگر رہنا پڑا ہے۔ وہاں علم بھی سمٹ کر محدود ہوا ہے، اور اس کے نتیجے میں توہم پرستی وضعیف الاعتقادی نے عوام کو زندگی کی ہفت خواں طے کرنے میں بڑی مدد دی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ عقل کی روشنی میں انسان اتنا کرب آفریں سفر طے کر سکے۔ یہ توہمات ہی ہیں جو دکھی انسانوں کو کارزار حیات سے نکال لے جاتے ہیں " ایک بڑی طاقت پر ان کا غیر متزلزل اعتقاد ہی انھیں اپنے سماج کی زور آور قوتوں کے مقابلے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔ ہفت تماشا میں آپ کو ہندوستانی عوام کی سچی تصویر نظر آئے گی۔ جہاں شیخ سدو، شاہ مدار، سیتلا دیوی سب اپنی اپنی نبرد آزمائی میں مصروف ہیں۔ شاہ مدار کی چھڑیاں بڑی دھوم سے منائی جاتی تھیں، دور و نزدیک سے

لے ہفت تماشا (باب پنجم)

لاکھوں انسان قافلہ در قافلہ چلتے تھے اور ہفتوں تک جشن رہتا تھا "چھڑیوں" کی وجہ تسمیہ غالباً یہی تھی کہ یہ قافلے جھنڈیاں اور علم لے کر چلتے تھے جو "شاہ مدار کے جھنڈے" کہلاتے تھے۔ اور میرا خیال ہے کہ ہندوستانی شعبدے بازوں کو، یا ان لوگوں کو جو بندر، بھالو وغیرہ نچاتے ہیں، مداری بھی اسی لیے کہا جاتا ہے۔ شاہ مدار کے مریدوں میں اکثریت ایسے ہی جہلا کی تھی کہ وہ سال بھر تک محنت کر کے جو کچھ کماتے تھے اسے ایک ہی ہفتے میں شاہ مدار کے نام پر لٹا دیتے تھے۔ اسی لیے اُردو میں کہاوت "مرتے کو ماریں شاہ مدار" آج تک چلی آتی ہے۔

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ میر حسنؔ نے دہلی سے لکھنؤ کا سفر انھیں مداریوں کے قافلے کے ساتھ کیا تھا اور اس جلوس کا انھوں نے اپنی مثنوی میں[۱] ذکر کیا ہے۔ ان کی مثنوی کا تہذیبی پس منظر تفصیل سے سمجھنے کے لیے بھی اس معاشرت کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

سخی سرور یا سرور سلطان وغیرہ کے بارے میں ٹمپل نے اپنی کتاب میں تمام خرافی حکایات کو جمع کر دیا ہے، وہاں تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔[۲]

دوسری بات جس پر میں زور دینا چاہتا ہوں یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دورِ حکومت میں ہندوستانی فرقوں کے مذہبی معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کی، حتیٰ کہ ہندوؤں نے مذہبی عقیدے کے طور پر انھیں "راکشس" اور "شودر" سمجھا تو اس پر بھی قناعت کر لی، ایسا ہی معاملہ دوسرے رسوم و عقائد کا تھا، جن میں ایک ستی کی رسم بھی ہے۔ انگریزوں نے بعد میں راجا رام موہن رائے کی تحریک پر اسے خلافِ قانون قرار دیا اور بڑی کوششوں سے

---

[۱] میر حسنؔ۔ گلزارِ ارم (مجموعۂ مثنویاتِ میر حسن۔ نول کشور ۱۹۴۵ء) ص ۱۳۶-۱۴۰ [۲] اس کا اُردو ترجمہ "حکایاتِ پنجاب" کے نام سے تین جلدوں میں چھپ چکا ہے۔ اسے مجلس ترقی ادب لاہور نے چھاپا ہے۔

اس قبیح رسم کو بند کیا۔ لیکن مسلمانوں نے اپنے دورِ حکومت میں اس کی قباحت کو اپنی مذہبی رواداری کی بنا پر برداشت کر رکھا تھا۔ آج جبکہ تاریخ کی الٹی تعبیر کرنے کی ہوا چل رہی ہے۔ اسے بھی مسلمانوں کے نسق کی کمزوری سمجھا جائے گا۔ ٹیلن نے ستی کی رسم کا جو بیان کیا ہے وہ غور سے پڑھنے کے قابل ہے:

"ستی کا جلوس حاکم وقت کے دروازے کے سامنے سے نکلتا ہے، کبھی کبھی حاکم بھی اس میں شریک ہو جاتا ہے۔ یہ بات داخلِ آئین ہے کہ چاہے حاکم ہندو ہو یا مسلمان وہ ستی کے جلنے سے پہلے، اس کی خواہش کے مطابق روپیہ دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ اگر وہ دیکھتا ہے کہ ستی روپیہ لینے کے لیے راضی نہیں ہوتی تو مجبوراً گھر واپس ہو جاتا ہے۔ ستی کے جلوس کے ساتھ نوبت بجانے کا حکم بادشاہوں اور امرار کی طرف سے ہے، جب ستی لکڑیوں کے انبار پر بیٹھ کر اپنے شوہر کے سر کو اپنے زانو پر رکھ لیتی ہے تو اس وقت بھی حاکم یا بادشاہ کی طرف سے کوئی شخص جا کر اس سے آئندہ زمانے کا حال پوچھتا ہے تاکہ بادشاہِ وقت اور اس کی بیوی کے حق میں اس کی زبان سے دعائے خیر نکلے۔

ظاہر ہے کہ ستی اگر جان بچا کر بھاگ نکلے تو اس کی بقیہ زندگی موت سے بدتر گزرتی ہے، جس شے پر اس کی چھایا پڑ جاتی تھی اسے بھی ناپاک سمجھا جاتا تھا، ایسی صورت میں اگر مسلمان بادشاہ اپنے اختیارات حکومت سے کام لے کر ستی کو غیر قانونی قرار دے بھی دیتے تو برادری اور سماج میں اس غیر منصفانہ سلوک پر کس طرح پابندی لگا سکتے تھے؟ اور اس زمانے کے جاہل عوام اس کی تعبیر یہی کرتے کہ مسلمان حاکم ہمارے مذہبی امور میں بے جا مداخلت کر کے ہمارے دھرم کو نشٹ کرنا چاہتے ہیں اس سے دلوں میں گرہیں پڑ جاتیں اور حکومت کرنا مشکل ہو جاتا۔

شادی کی رسمیں،، دوسری تمام رسموں سے زیادہ مسلمانوں میں مقبول ہوئیں۔ آج بھی شمالی ہندوستان کے مسلمان گھرانوں میں شادی کے موقع پر یہی تماشا ہوتا ہے۔ جو

قتیلؔ نے ہفت تماشا میں لکھا ہے۔

ڈاکٹر محمد عمر جو جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کے شعبۂ تاریخ میں استاد ہیں، اور پروفیسر شیخ عبد الرشید اور پروفیسر خلیق احمد نظامی کی نگرانی میں اٹھارھویں صدی کی ہندوستانی معاشرت پر تحقیق کر کے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند لے چکے ہیں ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس کتاب سے کہنگی اور گمنامی کی گرد جھاڑ کر، اسے دوبارہ نئے لباس میں جلوہ گر کیا اور معاشرتی تاریخ پر کام کرنے والوں کو اس کی اہمیت سے روشناس کرایا ہے جس زمانے میں یہ کتاب لکھی گئی تھی اس وقت فارسی ہندوستان کی سرکاری زبان تھی اور تصنیف و تالیف یا علمی مباحث کا ذریعۂ اظہار بھی۔ اسی لیے انشاؔ نے اردو زبان کے قواعد کی کتاب بھی فارسی میں لکھی اور یہی سبب ہے کہ شعرائے اُردو کے بیشتر تذکرے فارسی میں لکھے گئے ہیں۔ اب زمانے کی روش بدل گئی ہے۔ علوم مروّجہ بھی وہ نہیں رہے جو پہلے معیار علم و فضل سمجھے جاتے تھے۔ فارسی زبان کی کتابوں کے مخاطب بھی تعداد میں کم رہ گئے ہیں۔ چنانچہ عوام سے سروکار نہیں، خواص بھی جو کچھ لکھتے ہیں، اس میں فارسی مآخذ سے ان کی بے خبری بہت اکھرتی ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ فارسی اور عربی سے عالمانہ واقفیت کے بغیر لکھی ہی نہیں جا سکتی۔ لیکن یہ بھی اس عہد کی ستم ظریفی ہے کہ فارسی سے کامل بے اعتنائی کے باوجود لوگ ازمنہ وسطیٰ پر وثوق کے ساتھ گفتگو کر لیتے ہیں۔

ہفت تماشا اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے شمالی ہندوستان کی معاشرت کے سلسلے میں بنیادی ماخذ ہے، اس سے بے نیاز ہو کر کوئی مورخ نہیں گزر سکتا، لیکن میں نے زمانۂ حال میں عزیز احمد کی کتاب STUDIES IN ISLAMIC CULTURE IN INDIAN ENVIRONMENT: کے سوا کسی اور کتاب کے مصادر میں ہفت تماشا کا نام نہیں دیکھا۔[۱]

---

[۱] حال ہی میں ڈاکٹر محمد حسن کی کتاب "دلستان دہلی کا تہذیبی و فکری پس منظر"، لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے۔

(باقی ص ۴۷ پر)

حالانکہ جتنا مواد اس میں ہے وہ اس کی کسی ہم عصر کتاب میں شاید ہی یک جا مل سکے۔

زمانہ کی ضرورت اور کتاب کی اہمیت کا لحاظ کرکے، اس کا اُردو ترجمہ شائع کیا جا رہا ہے۔ انگریزی اور ہندی زبانوں میں بھی اسے منتقل کر دیا گیا ہے اور وہ تراجم اس کے بعد شائع ہوں گے۔ اُمید ہے کہ اس کتاب کے نئے روپ سے اس کے افادے کا نطاق وسیع تر ہو جائے گا۔ اور اب ہند ایرانی معاشرت یا مغل شائستگی کے بہت سے پہلوؤں پر نئے انداز اور نئی تعبیروں کے ساتھ گفتگو کی جا سکے گی۔

کسی زبان کی کتاب کو دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کے لیے بعض بنیادی شرائط کی تکمیل ضروری ہے۔ سب سے پہلے تو مصنف اور اس کے عہد کی تہذیب و روایات کے پس منظر سے واقفیت ہو، ورنہ انجام یہ ہوتا ہے کہ سر جادوناتھ سرکار جیسا عالم اور مؤرخ اورنگ زیب کے آخری زمانے کے اس خط کو جس میں اس نے خدا سے توبہ و انابت کی ہے اور خسران دنیا و آخرت کا ذکر کیا ہے یہ کہہ کر پیش ۵؎ کرتا ہے کہ خود شہنشاہ کا مجرم ضمیر اُسے آخر عمر میں ملامت کرتا تھا اور وہ گناہوں کے بوجھ سے دبا ہوا اپنے ماضی کے افعال پر شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ اب سرکار کو یہ کون سمجھائے کہ اورنگ زیب کا وہ خط "مجرم ضمیر" کی کراہ نہیں ہے، بلکہ ایک نہایت متقی اور صالح مسلمان بھی، جس کی ساری زندگی کامل زہد و ورع میں گزری ہو، آخری وقت میں ایسی ہی باتیں لکھے گا۔ مسلمان کا ایمان ہمیشہ خوف و رجا کے درمیان رہتا ہے۔ وہ کبھی اپنے اعمالِ صالحہ پر اس پندار میں مبتلا نہیں ہو سکتا کہ میرے لیے نجات یقینی ہے اور میں خدا کے برگزیدہ بندوں میں شامل ہو گیا ہوں۔

بقیہ حاشیہ ص ۲۷، (دانش محل لکھنؤ، ۱۹۶۴ء) اس کے مصادر کی فہرس بھی ہفت تماشا سے خالی ہے لیکن مصنف نے بعض امور کا تجزیہ نئے تقاضوں کو ذہن میں رکھ کر کیا ہے، ان کی رائے سے اکثر اختلاف ہونے کے باوجود یہ کتاب قابل قدر ہے۔

حاشیہ ص ہذا: ۵؎ Sarkar: Short history of Aurangzib (1930) PP 384-385. نیز ملاحظہ ہو: شبلی: اورنگ زیب پر ایک نظر (علی گڑھ ۱۹۲۴ء) ۱۶-۹۸/

چونکہ ڈاکٹر محمد عمر نے اس عہد کی معاشرت پر تحقیقی کام کیا ہے جس زمانے میں ہفت تماشا لکھی گئی ہے، اس لیے وہ تاویل و تعبیر کی کسی ایسی غلطی کے مرتکب نہیں ہوئے ہیں۔ انھوں نے کتاب کا ترجمہ اس دور کے سیاق و سباق کو ذہن میں رکھ کر کیا ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ دونوں زبانوں پر قدرت حاصل ہو۔ مترجم کو اس کا دعویٰ تو نہیں ہے، لیکن اصلاً قدرت و مہارت کی ضرورت اس زبان پر ہوتی ہے جس میں ترجمہ کیا جائے۔ پھر تو اگر مصنف کا مفہوم بھی گرفت میں آگیا ہے تو بعض اوقات اصل سے زیادہ بلیغ انداز میں مترجم کے قلم سے ادا ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھیے تو جناب محمد عمر نے اس ترجمے پر واقعی بہت محنت کی ہے۔ انھوں نے خواہ مخواہ لفظی ترجمہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اور یہ محض مرادی بھی نہیں ہے بلکہ جہاں اسلوب واداس میں جیسی سہولت دیکھی اسے اختیار کر لیا ہے۔

تراجم کے بارے میں ایسی رائیں علی العموم اصل سے مقابلہ کیے بغیر ظاہر کر دی جاتی ہیں۔ لیکن میں اپنی رائے ذمہ داری کے ساتھ ظاہر کر رہا ہوں اس لیے کہ میں نے پورے ترجمے کا مقابلہ اصل فارسی متن سے کیا ہے اور جہاں کہیں مناسب سمجھا ہے ترمیم بھی کی ہے۔

نثار احمد فاروقی

۸ر اپریل ۱۹۶۸ء
دہلی کالج ۔ دلّی ۶

ہفت تماشائے مرزا قتیل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(خدا کی حمد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت کے بعد)[1] محمد حسن مشہور بہ قتیل صاحبانِ حریم فضل و کمال کی خدمت میں گذارش کرتا ہے کہ یمین الدولہ ناظم الملک سعادت علی خاں بہادر مبارز جنگ کے عہد میں مرزا محمد حسین کربلائے معلیٰ سے لکھنؤ میں تشریف لائے جو اثنا عشریوں کی کثرت کے باعث رشکِ شیراز و صفاہان ہے۔ اور نواب حضور کے خرچ پر محمد آفرین علی خان کے توسط سے چاندی کے صندوق کے ساتھ جو نواب وزیر کے ایما سے بنایا گیا تھا اُسی ارضِ مقدس کی طرف ۱۲۲۶ھ میں مراجعت کی۔ اگرچہ آقا محمد صادق خاں صفاہانی اور آقا ابوالحسن خاں قزوینی کی زبانی میرے اشعار اُن کے متبرک کانوں تک پہنچ چکے تھے نیز اُن کے مناقب و فضائل میرے گوش نواز ..... ہوئے تھے اور اسی وسیلے سے دو تین مرتبہ اُن کی خدمت میں عریضہ بھیجے اور ان کی طرف سے جواب پا کر تازگیٔ دل و قوتِ روح کا سامان ہوا تھا لیکن ان کی خدمت میں کبھی نیاز حاصل نہیں ہوا۔ ممکن ہے آئندہ یہ سعادت نصیب ہو۔ انھوں نے مجھے حکم دیا کہ ہندوؤں کا احوال اور اُن کی رسموں کا بیان اور ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرت، خواہ وہ قدیمی مسلمان ہوں یا نو مسلم ہوں، تحریر کروں۔ ہر چند میں شیخ ابوالفضل یا فیضی جیسی عبارت آرائی

---

[1] یہاں ہفت تماشا کے دیباچے کی تلخیص پیش کی گئی ہے۔ غیر ضروری تفصیلات اور آداب و القاب حذف کر دیے ہیں۔

تو نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن دوستوں کی مروّت اور چشم پوشی پر نظر کر کے یہ حنظل اس نبات کے سامنے اور یہ خزف ریزے اُن جواہرات کے مقابلے میں پیش کر دیے ہیں اور اِس کتاب کا نام ہفت تماشا رکھا ہے۔ یہ کتاب جو اللہ کے بندوں کے عجیب و غریب حالات کا ایک شہر ہے۔ یہ تماشے محض تفریحِ طبع کے لئے دیکھنے چاہئیں۔ چونکہ اہلِ ولایت ہندی الفاظ سے واقف نہیں ہیں۔ اس لئے ہر لفظ کی حرکات بیان کر دی گئی ہیں۔ لیکن بعض الفاظ کی تشریح بے موقع تھی اُنھیں چھوڑ دیا گیا ہے۔ پڑھنے والوں کو چاہیئے کہ اُنھیں ذہن میں رکھیں تاکہ اُن کا بعد میں علم ہو جائے۔ عالی فطرتان بلند نظر سے امید ہے کہ جہاں وہ اس چمن کی سیر کر کے خوش وقت ہوں وہیں اس کے کانٹوں پر بھی نظر کریں اور اس کی خامیوں کی اصلاح کر دیں۔

تماشائے اوّل :۔ مذہب سمارتگان کا بیان اور اُن کے بارے میں بعض تحقیقات۔

تماشائے دوم :۔ انسان کی پیدائش اور اُن کی تقسیم فرقوں میں اور ملتوں کا اختلاف اور معتقدات کی تحریف۔

تماشائے سوم : اُن ہندوؤں کے معتقدات کا بیان جو اپنی شریعت کے دائرے سے باہر ہیں۔

تماشائے چہارم : ایّامِ متبرکہ یعنی ہندوؤں کے متبرک دنوں اور تہواروں کے بیان میں۔

تماشائے پنجم : ہندوؤں کی رسمیں۔

تماشائے ششم : ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرت اور آئین۔

تماشائے ہفتم : احوالِ عجیبہ کے بارے میں۔

پہلا باب

مذہبِ سمارتگان کا بیان اور ان کے بارے میں بعض تحقیقات

سمارتکیوں کا مذہب

واضح رہے کہ ہندو تاریخ کی کتاب کو پران کہتے ہیں۔ اور آدی پران میں جو کہ پرانوں میں سب سے پہلا تھا، لکھا ہے کہ مخلوق کے وجود میں آنے سے پہلے پانی کے سوا کچھ بھی نہ تھا، وہ ذات جو تمام قیود سے آزاد اور بے شبہ و بے نمون ہے، انسان کی صورت اختیار کر کے شیش ناگ کی پشت پر خوابِ وحدت میں مصروف تھی۔ شیش، ایک سانپ کا نام ہے، جسے "گاوِ زمین" کا حامل بتایا جاتا ہے۔ ہندی زبان میں ناگ، سانپ کو کہتے ہیں اور شیش اس سانپ کا عالم ہے۔ وہ سانپ قدیم الایام سے پانی میں رہتا تھا، اور اب بھی اسی کے اوپر ہے۔ گویا ذات مجرد (خداوندی) شیش کی صورت میں مذکورہ سانپ کی پشت پر سوئی ہوئی تھی کہ دفعتہً اس شخص کی ناف سے نیلوفر کا ایک پھول نکلا۔ اور اس پھول سے ایک آدمی برآمد ہوا، جس کے ایک سے زیادہ سر، ہاتھ اور بازو تھے۔ اس انسان کو جو نیلوفر کے پھول سے برآمد ہوا تھا، برہما کہا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اجسامِ فلکی سے موالیدِ ثلاثہ تک تمام موجودات کا خالق برہما ہے، اور اس فرقہ کے بعض علماء آسمانوں کے وجود کے قائل نہیں ہیں اور بعضوں کے نزدیک عقل اوّل، نفس فلکی اور لوحِ محفوظ سے بھی برہما ہی مراد ہے۔ برہما کی عمر کی مدت چند سال قرار دیتے ہیں۔ ہر سال تین سو ساٹھ دن کا ہوتا ہے اور ایک دن کی کیفیت یہ ہے کہ زمانے کو چار

جگوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

زمانے کی تقسیم

اوّل ستجگ اس کی مدت سترہ لاکھ اور اٹھائیس ہزار سال ہے اور جو لوگ اس دور میں پیدا ہوں اُن کی عمر ایک لاکھ سال ہوتی ہے اور اس دور کے آدمیوں کو صداقت اور باہمی محبت کی وجہ سے بادشاہ کی ضرورت پیش نہیں ہوگی۔ اور ہر ایک شخص اپنے طور پر زندگی بسر کرے گا۔ اس دور کے خاتمہ پر، ترتیا نام کا دوسرا زمانہ شروع ہوگا۔

ترتیا اس دور کے تمام آدمیوں کی عمر دس ہزار سال ہوگی، اور خود یہ زمانہ بارہ لاکھ ۹۶ ہزار سال کا ہوگا، جو زمانۂ اول کی مُدت کا تین ثلث $\frac{3}{4}$ ہوتا ہے۔ اُس کے بعد، **دُواپر** نام کا زمانہ وجود میں آئے گا۔ اس دور کی مُدت آٹھ لاکھ چونسٹھ ہزار سال ہوتی ہے، جو زمانۂ ثانی کی مُدت کا دو ثُلث ($\frac{2}{3}$) اور زمانۂ اوّل کی مدت کا نصف ہے۔ اور اس زمانے میں پیدا ہونے والوں کی عمر ہزار سال بتائی جاتی ہے۔ اور جب دواپر کا زمانہ ختم ہوگا تو کلجگ شروع ہوگا۔

کَلجگ بعضے اسے کرُجگ کہتے ہیں۔ (کلجگ اور کرُجگ دونوں صحیح ہیں کیونکہ ہندی میں رے، اکثر لام، سے بدل جاتی ہے لیکن کلجگ باشندگانِ شاہجہاں آباد کی بولی ہے اور کرُجگ قدیم ہندوؤں اور دہقانوں کی زبان ہے۔ اگرچہ باعتبارِ صحت کرُجگ سے مغلوب ہے۔)

مختصر یہ کہ اس دور کی مدّت چار لاکھ بتیس ہزار سال بتلاتے ہیں جو دورِ اوّل کی مدّت کا ایک چوتھائی ($\frac{1}{4}$) زمانۂ ثانی کا ایک تہائی ($\frac{1}{3}$) اور زمانۂ سوم کی مدّت کے نصف ($\frac{1}{2}$) کے برابر ہوتی ہے۔ اور اس دور میں پیدا ہونے والے لوگوں کی عمر، سو سال یا اس سے

کچھ کم یا زیادہ شمار کرتے ہیں۔ موجودہ زمانہ کلجگ کا دور ہے۔ پس اس حساب سے ان چاروں زمانوں کی مجموعی مدت عمر تینتالیس لاکھ بیس ہزار سال ہوتی ہے۔ جب یہ چاروں زمانے ختم ہوں گے تو کہتے ہیں کہ ایک چوکڑی ختم ہوئی کیوں کہ یہ چار چیزوں کے مجموعے کو چوکڑی کہتے ہیں۔ جب اس مدت کے حساب سے ستر چوکڑیاں ختم ہوں گی تو اُن کی مجموعی مدت برہما کی عمر کے ایک دن کے برابر ہوگی۔ اسی حساب سے برہما کی عمر کے سو برسوں کا زمانہ متعین کیا جاسکتا ہے اور کتابوں میں یہ بھی لکھا ہے: اور سب لوگ اس پر متفق ہیں کہ جب تک زمانہ میں ایک برہما موجود رہتا ہے، دوسرا برہما وجود میں نہیں آتا۔ جس وقت وہ برہما مر جاتا ہے اس کی جگہ دوسرا کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کے مرنے کو پرلے کہتے ہیں اور جب کوئی چیز باقی نہ رہے تو اس کو مہاپرلے کہتے ہیں۔ پرلے کے معنی قیامت کے ہیں اور مہا کے معنی بزرگ۔ لہٰذا مہاپرلے قیامت کبریٰ کے مترادف ہوا۔ اُن کے خیال کے مطابق یکے بعد دیگرے اتنی تعداد میں برہما وجود میں آئے ہیں کہ اُن کا شمار ممکن نہیں لیکن گفت و شنید کے ذریعہ یہ کہا جاتا ہے کہ اب تک ایک ہزار برہما وجود میں آکر معدوم ہو چکے ہیں اور اب ایک ہزار ایکویں برہما کا زمانہ ہے جس کی عمر کے پچاس سال اور آدھا دن گذر چکا ہے اور مذکورہ فرقہ کے محققین کا قول ہے کہ منسا دیوی نامی ایک عورت ہے، جس کے بطن سے برہما کی ولادت ہوئی اور اُس عورت کے دو فرزند اور تھے جن میں سے ایک کا نام بشن اور دوسرے کا مہادیو تھا۔

کہا جاتا ہے کہ جو کچھ برہما نے پیدا کیا، اور پیدا کر رہا ہے یا آئندہ پیدا کرے گا، اس کے فنا اور زوال کا محافظ بشن ہے۔ اور مہادیو، جس کے معنی بزرگ ولی کے ہیں۔ ہندوؤں میں یہ بات مشہور ہے کہ وہ کامل فقیروں اور بے مثل عابدوں میں سے تھا اور ہمیشہ ایک بیل پر سوار ہوتا تھا جس کا نام نادیا ہے۔ حالتِ خواب میں اُس کی ایک آنکھ چالیس چالیس لاکھ سال تک بند رہتی ہے۔ قدرتِ الٰہی سے وہ تمام موجودات کو فنا کرنے کے لئے وجود میں آیا ہے اور اُس کی بیوی کا نام پاربتی ہے۔ قوتِ شہوانی کے برانگیختہ ہونے کی حالت میں وہ پاربتی کے سامنے

رقص کرتا اور بین بجاتا تھا۔

بین | ہندوستان کا ایک قدیم ساز ہے اور یہ ساز اس طرح بنایا جاتا ہے کہ سوکھے دو گول کدوؤں میں دو طرف سے سوراخ کر کے اُن میں ایک لکڑی جوڑتے ہیں اور (اس) لکڑی کے اس سرے سے اُس سرے تک لوہے کے تار باندھ کر بجاتے ہیں۔ مشہور ہے کہ یہ ساز مہادیو نے ایجاد کیا تھا، اور اس سے اچھا آج تک کسی نے نہیں بجایا۔ علاوہ ازیں مہادیو کو علمِ موسیقی اور رقص کا پیشوا بھی مانا جاتا ہے۔

مسلمان اور مہادیو | بعض بے علم اسے آدم صفی اللہ مانتے ہیں، اور بعض ملائے مکتب وار جو ہندو بچوں کو تعلیم دینے میں وقت صرف کرتے ہیں یا بے علم مسلمان بھی اس عقیدے کی تائید کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ جب یکے بعد دیگرے سو برہما مر جائیں گے تو اس کی عمر میں سے ایک دن کم ہوگا اور جب ہزار بشن مر جائیں گے تو مہادیو کی عمر کا ایک دن گذرے گا۔ اور اسی حساب سے بشن کی عمر سو سال مانی گئی ہے اور مہادیو کی عمر بھی اتنی ہی ہے۔ یہ اہلِ تقلید کا مذہب ہے جنھیں سمارتک کہتے ہیں۔

سمارتک کے معنی متشرع ہوئے۔ یعنی جو ہندوؤں کے اہلِ شریعت کی طرح عبادت کرتا ہے اور حلال سے رغبت اور حرام سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری چار کتابوں کے علاوہ جو چار بید کے نام سے موسوم ہیں، کوئی دوسری کتاب الہامی اور آسمانی نہیں ہے۔ اُن کی دلیل یہ ہے کہ بندے اور خالق کے کلام میں فرق ہونا ضروری ہے۔ پس لامحالہ خدا کا کلام مخلوق کی زبان سے الگ کسی زبان میں ہوگا۔ جیسے ہمارے ویدوں کی زبان ہے جو بظاہر کسی شہر یا گاؤں کے لوگوں کی زبان نہیں ہے۔ اس کے برخلاف قرآن کے الفاظ اہل عرب کی زبان پر جاری ہیں۔

ایک دن راقم الحروف ایک مجلس میں موجود تھا۔ ایک ہندو لڑکا کوئی کتاب لایا۔ میں نے

پوچھا، کون سی کتاب ہے ؟ اُس نے جواب دیا کہ شاہ جہاں بادشاہ کے عہد میں اُن کے بڑے لڑکے داراشکوہ کی فرمائش سے کسی شخص نے اہلِ ہند کی کتب مذہبی میں سے ایک کتاب کا ترجمہ کیا تھا۔ یہ نسخہ وہی ہے۔ میں نے کہا کہ کیا دو تین دن کے لئے اپنے پاس رکھنے کو تم مجھے یہ کتاب دے سکتے ہو یا نہیں۔ اس نے کہا لے جائیے فقیر نے گھر لاکر یہ کتاب شروع سے آخر تک پڑھی۔ جب مذکورہ بالا مقام کا مطالعہ کر رہا تھا، میرے گھر میں آگ لگ گئی۔ میں نے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر یہ عبارت لکھ کر اُس کتاب میں رکھ دی اور کتاب مالک کو واپس کر دی۔

شاہ جہاں آباد کے لڑکوں کی ایجاد کردہ زبان

شاہجہاں آباد کے شوخ لڑکے ہمیشہ نئی زبانیں ایجاد کر کے آپس میں بات چیت کرتے ہیں اُن کے علاوہ جنھوں نے اِن بچّوں سے یہ زبان سیکھی ہو، کوئی دوسرا شخص اس سے آگاہ نہیں ہو سکتا اگر کبھی کسی زبان کا عدمِ اشتہار، دوسری زبانوں پر اس کی فوقیت کا باعث ہو سکتا ہے تو شاہ جہاں آباد کے لڑکوں کی یہ اختراعی زبان فارسی اور عربی سے جو کہ مروجہ اور مشہور ہیں بہتر اور اشرف ہوئی۔ مگر ایسا نہیں ہے کیوں کہ ان زبانوں کو لڑکے ایجاد کرتے ہیں اور دوسرے لوگ جلدی سیکھ جاتے ہیں۔ مگر عربی اور فارسی بغیر طابع کی یاوری کے حاصل نہیں ہوتی۔ پس جس زبان کا جلدی سیکھ لینا بچوں کے لئے ممکن ہے، اُس زبان پر کیسے فضیلت حاصل ہو سکتی ہے۔ جو بڑی عرق ریزی سے حاصل ہوتی ہے۔ وہ بھی تائید آسمانی ہو تو، ورنہ نہیں! اس صورت میں دوسری زبانوں پر سنسکرت کی ترجیح، بلا مرجّح ہوئی۔ کیا عجب ہے کہ چند خسران مآل لوگوں نے آپس میں متفق ہو کر ایک زبان اختراع کر لی ہو اور احمقوں کو گمراہ کرنے کے لئے آپس میں چند کتابیں لکھ ڈالی ہوں۔

قرآن کی فضیلت

قرآن کی فضیلت دوسری کتابوں پر ظاہر ہے۔ یہی دلیل کافی ہے کہ زمانۂ حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عربی نثر و نظم کی کوئی تصنیف فصاحت و بلاغت میں قرآن کو نہیں پہنچتی۔ ثابت ہو گیا کہ مذکورہ کتاب انسانی کلام نہیں ہے۔

سنسکرت | ایک قدیم زبان ہے جس میں ہندوؤں کے بید لکھے ہیں۔

بید | ہندوؤں کی کتاب ہے جس پر سب لوگ اعتقاد رکھتے ہیں اور اُن کے عالم کو اس فرقہ کا پیشوا سمجھا جاتا ہے۔

عقائد کے اعتبار سے سمارتک فرقے کی تقسیم | مختصر یہ کہ سمارتکوں کا فرقہ مذہب اسلام کے سنیوں اور اثنا عشریوں کے مانند ہے۔

اور بقیہ فرقے اسلام کے دوسرے فرقوں کے مشابہ ہیں لیکن اس فرقے کے آزاد خیال لوگ جنھیں عقل و حکمت سے بھی کچھ بہرہ ہے، ان میں دو طرح کے عقائد ہیں۔ ایک تو یہی عوام والا، جس کا ذکر کیا گیا ہے اور دوسرا عقیدہ خواص کا ہے، وہ اس طرح ہے کہ اُن کے اعتقاد کے مطابق تحقیق و تدقیق کے بعد باری تعالیٰ کی ذات اور صفات میں کوئی شے شریک و سہیم نہیں اور نہ کبھی تھی۔ اُن کا کہنا ہے کہ وہ ذاتِ باری، انسان کی عقل اور اوحام کے احاطہ سے باہر ہے اس کا وجود جمیع اشیاء پر مقدم ہے۔ اور کسی شے کا اس کی ذات پر اطلاق جائز نہیں۔ منسا دیوی سے اس کی قدرتِ کاملہ مراد ہے۔ اور عام لوگوں کو سمجھانے کے لئے اسے یہ نام دیا گیا ہے اور منسا دیوی کے تین لڑکوں (برہما۔ بشن اور مہادیو) سے وہ تین قوتیں مراد ہیں جو اس قدرتِ کاملہ میں جمع ہیں۔ پہلی قوت چیزوں کے ایجاد کرنے کی ہے جسے برہما سے تعبیر کرتے ہیں دوسری قوت اشیائے موجودہ کی حفاظت، جسے بشن سے منسوب کیا جاتا ہے اور تیسری قوت ہر شے کو فنا کرنے کی ہے۔ جس کے لئے مہادیو شہرت رکھتا ہے۔

اوتار | مختصر یہ کہ سمارتکوں کا عقیدہ ہے کہ بشن مختلف شکلوں اور صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے اور ہر صورت کو ہندی زبان میں اوتار کہتے ہیں، اور عربی زبان میں اوتار کے معنیٰ مظہر کے ہیں چوں کہ ہندوؤں کا مذہب تصوّف کے تابع ہے اس لئے ہر صورت کو خدا کا مظہر بلکہ خدا سمجھتے ہیں۔ از آں جملہ متذکرہ صورتوں میں پہلی صورت ماہی کی ہے جس کو مچھاوتار کہتے ہیں یعنی مظہرِ حق ماہی کی شکل ہیں، کیونکہ قدیم ہندی زبان میں مچھ کے معنیٰ ماہی کے ہیں۔ اور

اوتار کے معنی ظاہر ہیں۔ اور اس شکل میں ظاہر ہونے سے بشن کی غرض یہ تھی کہ تمام آبی جانوروں کی حفاظت کی جائے۔ دوسرا کچھ اوتار۔ یعنی خدا کا مظہر، کچھوے کی شکل میں۔ ہندی میں کچھوے کے لئے کچھ آتا ہے۔ اس صورت میں ظہور پذیر ہونے کی غرض و غایت وہی تھی جو ماہی کی شکل میں ہونے کی تھی، سوم، سور (خوک) کی شکل میں ظہور، جسے بیراہ اوتار کہتے ہیں۔ ہندی زبان میں بیراہ، سور کو کہتے ہیں۔ چہارم۔ نرسنگھ اوتار، نرسنگھ کے معنی شیر نر کے ہیں۔ اس صورت میں ظاہر ہونے کی غرض و غایت جنگل کے جانوروں کی نگہبانی ہے۔

راقم الحروف کہتا ہے کہ جنابِ اقدس الٰہی کا ان صورتوں میں ظہور بھی ایک عجیب عقیدہ ہے (اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا مِنْ کُلِّ بَلَاءِ الدُّنْیَا) شاید صوفیۂ صافیہ کے نزدیک اس طرح کے اقوال صداقت سے قریب ہوں۔ میں نے ایک کتاب میں دیکھا کہ ایک متکلم کسی صوفی سے ملا۔ آپس میں مباحثہ ہونے لگا۔ متکلم نے کہا کہ جب تم باری تعالیٰ کے موجودات میں حلول کرنے کے قائل ہو تو کتے اور سور کے بارے میں تمہارا کیا عقیدہ ہے۔؟ اس نے کہا۔ دونوں ذاتِ باری کے محل (ظہور) ہیں۔ متکلم بگڑ کر کہنے لگا وائے اِس خدا پر جو کتے اور سور کی جون میں آجائے۔ صوفی نے جواب دیا کہ وائے اس خدا پر جو سور اور کتے کی جون میں نہ آسکے۔ اور ایک صوفی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کوئی مسلمان اس کے پاس غلاظت لے کر آیا اور کہا "میں تمہارے لئے کھانا لایا ہوں۔ اس ولی کامل نے سور کی شکل اختیار کی اور اس غلاظت کو نوش کر لیا۔ اس فرقے کے پیرو اسے مقرب خدا اور اس کی اس حرکت کو خوارق میں سے سمجھتے ہیں۔

پنجم۔ دامن اوتار، دامن کے معنی ایک کوتاہ قد آدمی کے ہیں۔ کہ شاہ جہاں آباد کی ہندی زبان میں اسے بونا کہتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ بشن ایک برہمن گھر میں جو ہندوؤں میں شریف ترین ذات ہے، پیدا ہوا تھا۔ اس ظہور کی غرض نوعِ انسانی کی حفاظت اور ہدایت تھی کیوں کہ اس فرقے کے بعض علمائے

اکابر کا مقولہ ہے کہ جب تک عابد و معبود کے درمیان ایسی متوسط صورت ان اوصاف سے ظاہر نہ ہو کہ ظاہر میں وہ انسانی صورت میں ہو۔ مگر اصل میں اس کے افعال، افعالِ الٰہی اور خدا کی قوت و قدرتِ کاملہ اس میں نمایاں ہو، اس وقت تک بندے کا خدا کی حقیقت کو پہنچنا ممکن نہیں۔ لہٰذا افرادِ بشری کی تکمیل کے لئے اوتار وجود میں آئے۔ یہ سبب نہ تھا کہ بعض لوگ رتبۂ عقلی میں ترقی کر کے اوتار بن گئے ہوں۔

ششم۔ پرسرام اوتار۔ (پرسرام) بھی برہمن کا لڑکا تھا۔ اور اپنے زمانے میں سب کھتریوں کو اس وجہ سے قتل کر دیا تھا کہ اس فرقے کے ایک شخص نے اس کے باپ کو قتل کیا تھا۔ کھتری ہندوؤں کا ایک فرقہ ہے جس کی تفصیل اس کے بعد لکھی جائے گی۔ بعض محققین کے قول کے مطابق اس زمانے میں اصیل النسل کھتری روئے زمین پر باقی نہیں رہے ہیں۔ اور جس قدر بھی ہیں وہ لوگ برہمن کے نطفے سے ہیں۔ کیوں کہ اس جماعت کے مردوں کے قتل کے بعد اُن کی بچی ہوئی عورتوں کو پرسرام نے اپنے بھائیوں کے حوالے کر دیا تھا اور اُن کے بطن سے جو اولاد وجود میں آئی وہ برہمن کے بجائے کھتری کے لقب سے ملقب ہوئی۔ لیکن نطفہ کے اعتبار سے یہ لوگ قدیم کھتریوں سے شریف تر ہیں۔ اور ہندوؤں میں یہ قاعدہ ہے کہ آدمی کی شرافت کا تعلق ماں کے بطن سے ہے باپ کے نطفے سے نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک مسلمان عورت کے بطن سے متولد ہندو لڑکا مسلمان ہے نہ کہ ہندو۔ ایک شریف ہندو کے نطفے سے ایک رذیل عورت کے بطن سے متولد لڑکا لازمی طور پر رذیل ہے نہ کہ شریف۔

ہفتم رام اوتار۔ ولد راجہ جسرت۔ جس کا پایۂ تخت اودھ تھا۔ اڑیسہ سے سندھ تک کا علاقہ اُس کے زیرنگیں تھا۔ اُڑیسہ ایک شہر کا نام ہے، جو ہندوستان کی سرحد پر اور دریائے شور کے قریب واقع ہے۔ کہا جاتا ہے کہ راجہ جسرت (قوم کا) کھتری تھا۔ وہ اپنی تین بیبیوں پر بہت عنایت کرتا تھا اُن میں سے ایک کا نام کوشلیہ تھا اور رام اُسی کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ دوسری کا نام کیکئی تھا، جس کا بیٹا بھرت تھا اور تیسری عورت کے بطن

سے دو لڑکے جڑواں پیدا ہوئے تھے ان میں سے ایک کا نام ستر گن اور دوسرے کا لچھمن تھا۔ ہندوؤں میں یہ بات مشہور ہے کہ لچھمن رام سے ایسی محبت کرتا تھا جو سوتیلے بھائیوں میں بہت کم پائی جاتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ رام اور پرسرام کی باہم ملاقات ہوئی تھی۔ یہ بات اس عقیدہ کو باطل کرتی ہے کہ پرسرام کی روح رام کے بدن میں حلول کر گئی تھی۔ چونکہ ملاقات کے وقت دونوں اوتاروں میں کشتی واقع ہوئی اور رام کی طاقت پرسرام پہ غالب آگئی۔ پرسرام حیرت میں پڑ گیا۔ کیوں کہ ہندوؤں کے مذہب میں انسانی طاقت اوتار کی طاقت پر غالب نہیں آسکتی چوں کہ اُسے پہلے سے ہی اس بات کا علم تھا کہ اس کے بعد رام نامی خدا کا اوتار ظاہر ہوگا۔ پرسرام نے عاجز ہو کر پوچھا کہ شاید رام نامی اوتار کا ظہور ہو چکا ہے اور ایسا گمان ہوتا ہے کہ تم ہی رام ہو۔ رام نے اس کا اقرار کیا۔ پرسرام نے معذرت پیش کی اور ہنومان۔ جس کو ہندو خاصانِ درگاہِ الٰہی میں سے سمجھتے ہیں۔ ایک بندر کا نام ہے جو رام کے ساتھ گھومتا تھا۔ القصہ رام ریاضت کرنے والا اور عفت شعار انسان تھا۔ صرف ایک عورت کے علاوہ جس کا نام سیتا تھا، اُسے کسی دوسری عورت سے کوئی سروکار نہ تھا۔

آٹھواں اوتار کشن تھا۔ اس کو کنہیا بھی کہتے ہیں۔ اس کے والد کا نام باسدیو اور ماں کا نام دیو کی تھا۔ باسدیو بھی کھتری تھا۔ چوں کہ ابتدا میں جسودھا (نند کی بیوی) نے جو ایک اہیر عورت تھی اسے دودھ پلایا تھا اور اسی قوم میں پرورش ہوئی تھی اور وہیں پلا بڑھا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کشن اہیر تھا لیکن یہ خیال غلط محض ہے۔ جسودھا، کنہیا کی دایہ تھی اور نند اس کے شوہر کا نام تھا۔

اہیر — اور اہیر ہندوؤں کا ایک پنچ فرقہ ہے۔ اس فرقے کے لوگ گائیں اور بھیڑیں چراتے ہیں ان کا دودھ دوہتے ہیں اور دودھ مکھن، دہی وغیرہ حلوائیوں کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں۔

گھوسی اسی فرقے کی طرح ایک فرقہ مسلمانوں میں ہے جسے گھوسی کہتے ہیں۔ یہ لوگ مذکورہ بالا اشیاء کے علاوہ پنیر بھی بیچتے ہیں۔ اہیروں کے برخلاف جو پنیر کی تجارت نہیں کرتے۔

ابتدا میں کنہیا بہت حسین، خوش اندام اور گورے رنگ کا تھا مگر آخر میں سانپ کے ڈس لینے کی وجہ سے سیاہ فام ہو گیا تھا لیکن اُس کی سیاہی بھی ایسی خوش ترکیب تھی کہ دلوں کو موہ لیتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اہیر قوم کی خوب صورت اور نوجوان عورتیں دہی اور مسکہ لے کر اس راستے پر جہاں کرشن مرلی بجاتا تھا آیا کرتی تھیں اور اُس کے ساتھ چہلیں اور چھیڑ چھاڑ کرتی تھیں۔ بعض لوگ کرشن کے بارے میں فسق کا خیال بھی کرتے ہیں مگر بعض لوگ اسے معصوم مانتے ہیں۔ فرقۂ ثانی کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ بذاتِ خود ان عورتوں کی طرف مائل اور راغب نہیں ہوتا تھا بلکہ یہ عورتیں اُس کے راستے پر خود بخود آجایا کرتی تھیں۔ یعنی بچپن میں جب وہ اپنی دایہ کے کہنے پر گائیں چرانے جایا کرتا تھا تو عورتیں خود اُس کے پیچھے پیچھے آتی تھیں۔ اِس دایہ کے گھر میں اس کی پرورش فلاکت اور ناداری کی وجہ سے نہیں ہوئی تھی بلکہ اپنے ماموں (کنش) کے ڈر کی وجہ سے جو اس عہد کا راجہ تھا اور نجومیوں کی زبانی اس نے سُن رکھا تھا کہ اس کا بھانجہ اُس کے قتل کا باعث ہوگا۔ لہٰذا وہ برابر اس خیال میں رہتا تھا کہ جب اُس کی بہن کے اولاد ہو تو وہ اُسے قتل کر ڈالے۔ چوں کہ کنہیا کی ماں کو بھی اس بات کی اطلاع مل چکی تھی۔ اس نے اپنے بھائی کے خوف سے نومولود کرشن کو خفیہ طریقے سے اِس دایہ کے سُپرد کر دیا تھا۔ تاکہ وہ اپنے گاؤں میں لے جا کر اس کی پرورش کرے اور یہ ظاہر کرے کہ یہ لڑکا اسی کا ہے۔ اور

مُرلی بانس کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے جس میں سُوراخ کر کے اُسے بجاتے ہیں۔ اس کی آواز بہت دلپذیر اور خوش آیند ہوتی ہے۔ کنہیا اس ساز کو خوب بجاتا تھا۔ کنہیا کے ماموں کا پایۂ تخت متھرا تھا۔ متھرا سے دو کوس کے فاصلے پر گوکل نامی ایک بڑا قصبہ ہے جسے بندرابن کہا جاتا ہے۔ یہ دونوں شہر یعنی بندرابن اور متھرا جمنا کے کنارے واقع ہیں اور یہ دونوں مقام کنہیا کے عشرت کدے ہیں۔

بن — بندرابن اور متھرا کے درمیانی میدان کو ہندوبن کہتے ہیں۔ ہندی میں بن کے معنی میدان اور صحرا کے ہیں۔ لیکن یہ معنی محض لغوی ہیں۔ کیونکہ ہر میدان اور صحرا کو بن نہیں کہہ سکتے اور ہندوؤں کی اصطلاح میں بن خاص طور سے اُسی مقام کے لئے استعمال ہوتا ہے کیونکہ جب کوئی یہ کہتا ہے کہ میں "بن" جانے کا ارادہ رکھتا ہوں تو یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ متھرا اور بندرابن جاتا ہے۔ دوسرے جنگل تو وحشت ناک اور ڈراؤنے ہیں مگر یہ جنگل ہنود کے مذہبی عقیدہ کے مطابق تازگی رُوح اور شگفتگی دل کا باعث ہے اور جس علاقے میں یہ جنگل واقع ہے اُسے برج کہتے ہیں۔ یہ سارا علاقہ خاکِ عشق اور زمینِ محبت تصور کیا جاتا ہے۔ مذکورہ بالا دو مقاموں کے علاوہ اور بھی دو جگہیں کنہیا کی عشرت گاہیں ہیں۔

گوردھن اور برسانہ۔ یہ دونوں مقام بھی بن کہلاتے ہیں مگر یہ برج کی جان ہیں۔ برسانہ رادھا کا مسکن و مولد ہے، جو کنہیا کی محبوبہ اور معشوقہ تھی اور اس پر عاشق بھی تھی۔

اس طائفہ کی روایاتِ متواترہ کے مطابق کنہیا کی ایک ہزار چھ سو گوپیاں تھیں۔

اس کی ایک کرامت یہ تھی کہ اگر کوئی کنہیا کی صورت کا مشتاق ہوتا اور وہ اُس کی کسی گوپی کے گھر جاتا تو کنہیا کو وہیں پاتا۔ اگر ہزار اشخاص جُدا جُدا ہزار گوپیوں کے گھروں میں جاتے تو وہ لوگ اس کو ہزار جگہ پاتے۔ مختصر یہ کہ اس اوتار کے زمانے میں رس بہت تھا۔

رس — ہندی زبان میں مرد و زن کی ملاقات کی لذت کو کہتے ہیں۔ یہ تو اصطلاحی معنی ہیں، ورنہ رس کے لغوی معنی محض لذّت کے ہیں۔ یہ کچھ مرد اور عورت ہی پر موقوف نہیں ہے اور برج کی ہندی زبان (جسے بھاکا بھی کہتے ہیں) کے اشعار رادھا اور کنہیا کے ذکر سے مملو ہیں اور ان اشعار میں عشق کا اظہار عورت کی طرف سے ہوتا ہے کیونکہ شعر تین حالتوں سے خالی نہیں ہوتا۔ یا تو اس میں عشق کا بیان ہوگا مرد کی جانب سے عورت کے لئے۔ یہ عربی زبان کے لئے مخصوص ہے۔ یا اس کے برعکس ہوگا، اور یہ ہندوستان والوں کا شیوہ ہے۔ یا مرد کی طرف سے اظہارِ عشق مرد کے لئے ہوگا جو عجم کے باشندوں کا طریقہ ہے

چنانچہ فارسی اشعار میں بھی بات پائی جاتی ہے۔ ہندوستان میں اس طرح کے اشعار دو قسم کے پائے جاتے ہیں۔ اگر دو مصرعوں کے ہیں تو ان کو "دوھا" کہتے ہیں اور اگر چار مصرعوں کے ہیں تو ان کو کبت کہا جاتا ہے اور اس زبان کے شاعر کو کب (کوی) کہتے ہیں ان اشعار میں عمدہ مضامین، معانی نغز، عجیب وغریب استعارات و تشبیہات پائی جاتی ہیں۔

ریختہ

یہ ریختہ سے الگ ہے۔ کیوں کہ شاہجہاں آباد کی زبان میں شاعری کو ریختہ کہتے ہیں۔ اس میں اکثر اشعار عربی و فارسی الفاظ پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ریختہ میں بھی معشوق مرد ہے عورت نہیں ہے اور یہ شاعری فارسی بحروں پر مبنی ہے۔ اسی مناسبت سے اسے ریختہ کہا جاتا ہے۔

گوکل جمنا کے اُس پار واقع ہے۔ چوں کہ کنہیا نے گوکل میں پرورش پائی تھی، اس وجہ سے اس کا ذکر بھی بھاکا شاعری میں پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ برج کی زمین میں داخل نہیں ہے ہندوستان کے بعض نادان لوگ اس خیال کے تحت کہ کنہیا بہت دنوں تک برج میں رہا تھا، یہ خیال رکھتے ہیں کہ گوکل بھی برج میں شامل ہے مگر اس فرقہ کے بعض محققین کا، جنھوں نے اپنی تمام عمر کتب بینی میں صرف کی ہے، یہ خیال ہے کہ دنیا میں کنہیا کے آنے کا مقصد دھرتی (زمین) کو آدمیوں کے بوجھ سے ہلکا کرنا تھا۔ کہتے ہیں کہ زمین نے بہت زیادہ بوجھل ہو جانے کی وجہ سے فریاد کی تھی۔ لہٰذا کنہیا وجود میں آئے اور پانڈ کے راجہ کی اولاد کو وبدراشت کی اولاد سے لڑا کر دھرتی کو سبکدوش کر دیا۔ پانڈو ہندوستان میں کھتری قوم کا ایک راجہ تھا۔ اس کی عورت کا نام کنتی تھا۔ یہ کنتی، کنہیا کی پھوپھی تھی۔ اس کے بطن سے چار لڑکے پیدا ہوئے اُن میں پہلے اور سب سے بڑے کا نام کرن تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ بہت شجاع اور سخی تھا چنانچہ سخی راجاؤں کو ہندوستان میں آج تک "اپنے وقت کا کرن" کہتے ہیں۔ دوسرا جدھشٹر۔ تیسرا بھیم، اُس کو جسمانی طاقت اور قوت میں پہلوانوں کا سردار سمجھتے ہیں اور چوتھا ارجن، وہ بھی بہت دلاور تھا۔ اُس کی تیر اور کمان مشہور ہے۔ قدیم ہندی میں ارجن کے تیر کو "ارجن

بان" کہتے ہیں۔ راجہ پانڈو کی دوسری بیوی کے بطن سے دو لڑکے اور تھے۔ ایک کا نام نکل اور دوسرے کا نام سہدیو تھا۔ کنہیا کی سوتیلی بہن ارجن کی بیوی تھی جس کا نام درو پدی تھا

ہندوؤں میں قیودِ رشتۂ شادی

آج کے برخلاف اس زمانہ میں ماموں کی لڑکی سے شادی کرنا ہندوؤں میں معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔ اب تو ماموں، چچا، خالہ، اور پھوپھی کی لڑکیوں بلکہ ایک ہی نسبی سلسلہ کی لڑکی سے شادی کرنا بہن کی طرح حرام سمجھتے ہیں۔

اور درو پدی جو کنہیا کی بہن اور ارجن کی بیوی تھی اُسے ضرورت کے وقت ارجن کے تمام بھائی خواہ سگے ہوں یا سوتیلے (سوائے کرن کے جو اُن سے علیحدہ زندگی بسر کرتا تھا) اپنے استعمال میں لاتے تھے اور اُن کے مذہب میں یہ عمل بُرا نہیں تھا۔

ہندوؤں اور مسلمانوں میں پردے کا رواج

اور ان کے مذہب میں پردہ کا رواج بھی نہیں ہے بلکہ ان ہی پر کیا موقوف ہے اسلام کے علاوہ کسی مذہب میں بھی عورت مرد سے منہ نہیں چھپاتی۔ لیکن چوں کہ شریف مسلمانوں میں عورت کا بے پردہ ہونا بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا اسلامی ملکوں میں دوسرے مذاہب کے شرفا بھی اپنی عورتوں کو پردہ میں بٹھانے لگے۔ پردے کے علاوہ غیرت و حمیّت بھی اہلِ اسلام پر ختم ہے۔

ہندوؤں میں رقص و سرود کی اہمیت

ہندوؤں کے مذہب میں رقص اور سرود کو عبادت میں شمار کرتے ہیں اور بڑے بڑے ذی عزّت راجاؤں کی لڑکیاں بھی ہمیشہ رقص کی تعلیم حاصل کرتی تھیں اور ان کے لڑکے ساز بجاتے تھے مردوں کا رقص کرنا بھی معیوب نہیں تھا یہی حالت ہندو فرقہ کے علاوہ دوسرے فرقوں کی تھی لیکن ہندو فنِ موسیقی اور رقص میں مہارت رکھتے ہیں۔ دوسرے فرقے کے لوگ اس فن میں ناقص اور اناڑی ہیں یعنی دوسرے لوگ بھی اگرچہ گانا بجانا تقلیداً سیکھتے ہیں تاکہ امراء کی

محفلوں میں اپنی عورتوں اور لڑکیوں کو نچوائیں اور خود بھی ناچیں۔

مہابھارت

الغرض راجا پانڈو کے مذکورہ لڑکوں اور اُس کے چھوٹے بھائی کے درمیان، جو بصارت سے محروم تھا، اختلاف پیدا ہوا تو کنہیا نے راجہ یدھشٹر اور اس کے بھائیوں کو (راجا کے سوا) جنگ پر آمادہ کر دیا (وہ خود اس جنگ میں شامل نہیں ہوا) اس جنگِ عظیم کو ہندی میں مہابھارت کہتے ہیں۔

مغل فرماں روا اکبرِ اعظم کے وزیر ابوالفضل اور اس کے بڑے بھائی فیضی فیاضی نے، نیز دوسرے انشا پردازوں اور سوانح نگاروں نے، اس فرقے کے رہنماؤں کی زندگی بہت عمدہ پیرائے میں فارسی زبان میں لکھی ہے۔ چوں کہ شیخ فیضی کے غلو کے باعث شیخ عبدالقادر بدایونی نے جو اس سے عداوت رکھتا تھا، ہندی کی کتابوں کے ترجمے کو، جو بادشاہ کے حکم سے ہوا تھا، اُس کے کافر ہونے کی دلیلِ قوی قرار دے کر اس پر کئی بہتان لگائے ہیں۔ اور تاریخ بدایونی میں، جو اُس کا سرمایۂ حیات ہے، فیضی کو ذلیل و رسوا کیا ہے اب میں اپنے اصلی مقصد کی طرف رجوع ہوتا ہوں۔

دھرراشٹ، راجہ پانڈو کا برادرِ اعیانی ہے۔ اُس کے دو نامور فرزند تھے ایک جرجودھن، جو لشکر کا سردار تھا۔ دوسرا دساسن۔ پانڈو کا بڑا لڑکا کرن بھی جسے سورج کا بیٹا کہتے ہیں، اپنے چچازاد بھائیوں کے ساتھ شریک ہوگیا۔ سورج کی اولاد میں مشہور ہونے کا سبب یہ ہے کہ راجا پانڈو آخر میں قوتِ باہ سے محروم ہوگیا تھا۔ تو اس کی بیوی کنتی، اپنے شوہر کے حکم سے دیوتاؤں کے پاس چلی گئی تھی۔ دیوتاؤں کا مفہوم درگاہِ الٰہی اور صاحبِ کرامت کو کہتے ہیں۔ اور ہندوؤں کے نزدیک فضیلت صرف انسان تک ہی محدود نہیں بلکہ حیوانات، نباتات، جمادات اور ستاروں میں بھی یہ صفت ہو سکتی ہے۔ اس تعریف کے بعد یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ جب سورج نے کنتی سے ہم بستری کی تو اس سے جو اولاد ہوئی اس کا نام کرن رکھا گیا ارجن کا باپ بھی ایک باعظمت دیوتا تھا۔ پانی، ہوا، آسمان، دیو اور پریاں

اُس کے فرماں بردار ہیں۔ وہ ہمیشہ آسمان میں رہتا ہے۔ جس مجلس میں اس کے سامنے پریاں رقص کرتی ہیں اُسے ہندی میں " اندر کا اکھاڑا " کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب ارجن دُشمن کے لشکر پر تیر پھینکتا تھا تو کمان سے تیر کے نکلتے ہی مخالف فوج کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا تھا اور موسلا دھار بارش بڑے بڑے اولوں کے ساتھ پڑنے لگتی تھی۔ جدھشٹر کے باپ کا نام دھرم تھا۔ دھرم کا لغوی مفہوم اعتقاد راسخ "پاس سخن" اور "خیر" ہے، ہندوؤں کے نزدیک ہر چیز دراصل حق اور صاحب کرامت ہائے بزرگ ہے۔ چاہے وہ کنکر پتھر ہی کیوں نہ ہو یا ٹا ہم کی اختراع ہو۔ قصہ مختصر یہ کہ دونوں لشکر اٹھائیس چھاؤنی پر مشتمل تھے۔ جر جودھن کے لشکر کی دس چھاؤنی اور اٹھارہ چھاؤنی جدھشٹر اور ارجن کے لشکر کی تھیں لیکن راجا جدھشٹر بذاتِ خود جنگ کرنے کے لئے نہیں گیا۔ اُس نے ارجن کو لشکر کا سپہ سالار اور صلح و جنگ کا مختار بنا دیا تھا۔ ایک چھوٹی (چھاؤنی) چھیانوے (۹۶) کروڑ آدمیوں کی ہوتی ہے اور ہندوؤں کے حساب سے کروڑ سولاکھ کے برابر ہے اور لاکھ سو ہزار کے۔ غرض دونوں لشکر باہم جنگ کر کے ختم ہو گئے۔ اس معرکہ میں کنہیا، ارجن کا رتھ بان تھا۔ رتھ ہندوستان کے قدیم راجاؤں کی سواری ہے زیادہ تر سردار رتھ پر سوار ہو کر جنگ کرتے ہیں۔ اور فارسی زبان میں بان محافظ کو کہتے ہیں۔ جیسے باغبان، دربان، پاسبان وغیرہ ہیں۔ (   ) اس زمانے میں تجارت پیشہ ہندو یا مہاجن اور صراف وغیرہ اپنی سواری کے لئے رتھ ورنہ چوپالہ رکھتے ہیں ہندوستان کے امرا نے اتنے بڑے بڑے رتھ بنائے ہیں کہ اُن میں بیلوں کے بجائے ہاتھیوں سے کام لیتے ہیں۔ اور جے نگر کا راجہ ہر قسم کے چارپایوں کو رتھ میں جوتتا ہے۔ حتیٰ کہ بھیڑ اور بکری کو بھی نہیں چھوڑتا تھا۔ کہتے ہیں کہ اُس نے ایک بڑی رتھ بنوائی تھی جسے ۶۴ گھوڑے کھینچتے تھے اور رتھ کے اندرونی حصے کو اُس نے اپنے اور خادموں وغیرہ کے لئے الگ الگ تقسیم کر دیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے دالان میں دیواریں وغیرہ بنا لیتے ہیں۔ اس نے رتھ میں بھی دیواریں لکڑی اور رسّی کی مدد سے بنا لی

تھیں۔ اُن پر پردے چڑھا دیئے تھے۔

غرض یہ کہ کنہیا جو ارجن کا رتھ بان تھا وہ اس طرح نہیں تھا جیسے دوسرے رتھ بان اپنے آقاؤں کے ملازم ہوتے ہیں بلکہ وہ اُس کا پیرو مُرشد تھا۔ اور کنہیا کے قدموں کی خاک کو ارجن اور اس کے بھائی آنکھوں سے لگاتے تھے۔ لیکن چونکہ ارجن کا بڑا بھائی کرن فریقِ مخالف یعنی جرجودھن سے ملا ہوا تھا۔ اور کوئی شخص اُس کے تیر کی تاب نہیں لاسکتا تھا اسلئے طرفِ ثانی کے تیر سے ارجن کی حفاظت کے لئے کرشن کنہیا رتھ بان کی جگہ بیٹھ گئے تھے چنانچہ جب کرن تیر پھینکتا تھا تو ارجن کا رتھ چار قدم پیچھے ہٹ جاتا تھا اور جس وقت ارجن تیر چلاتا تھا کرن کا رتھ بہتّر (۷۲) قدم پیچھے ہٹ جاتا تھا۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق اس رتھ پر کنہیا کے بیٹھنے۔ رتھ کی بناوٹ اس طرح کی ہوتی ہے کہ پتلی لکڑیوں سے جو خوب اچھی طرح تراش خراش کر کے تیار کی جاتی ہیں، ایک برجی بناتے ہیں۔ پھر اُس پر بانات یا ریشمی کپڑا منڈھ دیتے ہیں اور نچلے حصے کو، جو بیٹھنے کے لئے مخصوص ہوتا ہے، ریشم کی رنگین ڈوریوں سے یا بید سے بُن دیتے ہیں۔ اور تین طرف چھوٹے چھوٹے دروازے چھوڑ دیتے ہیں یعنی دائیں، بائیں اور سامنے کی طرف لیکن پچھلے حصے کو، جہاں رتھ سوار کے بیٹھنے کیلئے تکیہ ہوتا ہے، رسّی یا ریشمی کپڑے کے پردے سے ڈھک دیتے ہیں تاکہ گرنے کا خدشہ نہ رہے۔ اس برجی کو اُن دو گول لکڑیوں کے پہیوں کے ڈھانچے کے وسط پر رکھ کر مضبوطی سے باندھ دیتے ہیں۔ (پہیوں کا) یہ ڈھانچہ اس طرح تیار کیا جاتا ہے کہ دونوں پہیوں کو، جن کے درمیانی حصے میں سوراخ کر کے لکڑی کے ایک گول دُھرے پر، جس کے دونوں سروں پر لوہے کے ٹکڑے لگے ہوتے ہیں اس طرح ملحق کر دیتے ہیں کہ اُن میں سے ایک پہیہ بائیں جانب اور دوسرا دائیں جانب ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف ایسا نہیں ہوتا کہ ایک پہیہ آگے اور دوسرا پیچھے ہو اور اس پورے ڈھانچے کو ماہی پشت نما چیز پر رکھ دیتے ہیں جو پتلی لکڑیوں سے تیار کر کے چمڑے سے منڈھی ہوتی ہے، اور ان دونوں دائیں بائیں پہیوں کے پیچھے مذکورہ پہیوں کی شکل کا ایک دوسرا ڈھانچہ

لگاتے ہیں تاکہ چار پہیے ہو جائیں۔ اور بعد ازیں اس چمڑے سے منڈھے ہوئے اُس ماہی پشت نما ڈھانچے کو اُس پر اس طرح جماتے ہیں کہ ایک سرا آگے کی طرف اور دوسرا سرا پیچھے کی جانب ہو۔ شیار کی مانند اس ڈھانچے کے اگلے حصے میں ایک جُوا ہوتا ہے کہ صاحبِ رتھ کی سواری کے وقت رتھ بان اس میں دو موٹے تازے بیل جوت دیتا ہے اور راستے پر ہانک دیتا ہے۔ بس یہ تمام بھار اُن دونوں بیلوں کی گردن پر ہوتا ہے۔ بے چارے صاحبِ رتھ کو منزل تک پہنچاتے ہیں اور رتھ بان کے علاوہ جس کی نشست گاہ، پتلی لکڑیوں سے تیار کردہ اور چمڑے سے منڈھے ہوئے ڈھانچے پر ہوتی ہے۔ رتھ میں تین آدمی بڑے آرام سے بیٹھتے ہیں۔) کی برکت سے اتنا فرق رہ گیا تھا ورنہ کرن تو ارجن کو ایک ہی تیر میں مار ڈالتا، اور کرن کی تیر اندازی کا یہ کمال ہے کہ وہ کرشن کے ہوتے ہوئے بھی جو خدا کا اوتار اور خدائی صفات والا تھا کرن کا تیر اپنا اثر دکھا جاتا تھا۔

جگناتھ اور صالح بیگ مُغل کا قصہ

یہ داستان تو ختم ہوئی اب یہ سنیئے کہ جب کنہیا کا انتقال ہوا تو جگناتھ پیدا ہوا جو اس زمانے کے تمام اوتاروں کا پیشوا اور مالک تھا اور اس کی زیارتگاہ اڑیسہ میں سمندر کے کنارے پر واقع ہے۔ اگرچہ اس مندر میں اکثریت ہندو خدمت گاروں کی ہے لیکن تمام دروازوں کی کنجیاں مغلوں کے قبضہ میں رہتی ہیں اور قصہ تواتر کے ساتھ سنا گیا ہے کہ کسی زمانہ میں صالح بیگ نامی ایک مغل ایران یا توران کی ولایت سے اڑیسہ میں وارد ہوا۔ چونکہ وہ نہایت مفلس اور مفلوک الحال تھا، رات کو بھوکا سویا۔ صبح کو سیر کرتا ہوا اُس مندر کے قریب جا پہنچا اور لوگوں سے پوچھا یہ کیا ہے۔؟ کسی ہندو نے بتایا کہ خدا کا گھر ہے۔ اس نے جگناتھ کے فضائل بیان کئے۔ مغل تنگ دستی اور بھوک سے بے حال ہو رہا تھا۔ اُس مندر میں داخل ہونا چاہا۔ ہندوؤں نے نہ جانے دیا، مغل نے کہا کہ اس آستانے کو میں اُس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک مجھے ایک گھوڑا اور دس ہزار روپیہ نہیں ملے گا۔ غرض تین دن رات وہ وہیں پڑا رہا۔

ہندوؤں نے ہرچند اسے کھانا پانی دینا چاہا اُس نے قبول نہیں کیا۔ چوتھے دن جگناتھ خود نمودار ہوئے اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر مندر میں لے گئے، وہاں اُسے کھانا کھلایا۔ اُس کی مراد کے مطابق گھوڑا اور نقدی بھی دی۔ مغل نے ان دونوں چیزوں کو ٹھکرا دیا اور کہا کہ میں اس آستانہ پر کمال حاصل کرنے کے مقصد سے بیٹھا تھا وہ مجھے مل گیا، تو اب کہاں جاؤں۔ جگناتھ نے جب اسے اپنی محبت میں ثابت قدم دیکھا تو اسے مندر کا متولی بنا دیا، اور اپنے دوسرے پجاری اُس کے تابع فرمان کر دیئے۔ چنانچہ اب اس مندر میں جو کچھ بھی نقدی اور تحائف بطور نذر آتے تھے ان کا مالک صالح بیگ تھا۔ وہ جسے جو کچھ چاہتا دیتا اور اس مندر میں لوگوں کا رہنا یا نہ رہنا بھی اُسی کی مرضی پر منحصر تھا اور اگر وہ دس آدمیوں کو بھی مندر سے باہر نکال دیتا تو کسی کو اُس کے خلاف دم مارنے کی ہمت نہیں ہو سکتی تھی اور دس نئے آدمیوں کو مندر میں جگہ دے دیتا تو کوئی شخص چون و چرا نہیں کر سکتا تھا، اور ایک روایت کے مطابق ہندو اس کا جھوٹا کھانا کھا لیتے تھے۔ لیکن اس کے بعد اسے ظاہر یا باطن میں اسلام سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ اب بھی وہ جگہ صالح بیگ کی اولاد کے قبضہ میں ہے اور وہ دن رات جگناتھ کی پرستش میں مشغول ہیں۔ ان کی صورتیں بھی کافروں کے مثل ہیں۔ صالح بیگ کے علاوہ اور بھی کچھ لوگ اسی طرح کے ہو گئے ہیں۔

چونکہ ہندوؤں کی یہ پرانی رسم ہے کہ اپنی قوم کے علاوہ کسی دوسرے فرقے کا پکایا ہوا کھانا نہیں کھاتے بلکہ گھی میں پکائی گئی اشیا کے سوا دوسری چیزوں سے بھی عموماً اجتناب کرتے ہیں اور اُن کا کوئی فرقہ کسی دوسرے فرقہ کے لوگوں کے ساتھ ایک تھال میں بھوجن نہیں کرتا۔ جگناتھ نے حکم دیا کہ ہندوؤں کے تمام فرقے جب میرے آستانہ پر آئیں تو آپس میں مل کر کھانا کھائیں۔ چنانچہ کٹر قسم کے ہندو جگناتھ نہیں جاتے۔

دسویں اوتار کا نام نہ کلنگ ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ اسی کلجگ کے زمانہ میں برہمن کے گھر پیدا ہوگا اُسے ہرجی ہر مندر بھی کہتے ہیں اور سنبھل اُس کی جائے پیدائش ہے۔ سنبھل، ہندوستان

میں ایک شہر ہے، کتبِ مذہبی سے نابلد بعض مسلمان اس کو دجال سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ محض غلط ہے۔ بھلا دجال کہاں اور سنبھل کہاں۔

کیا یزید ہندو تھا؟

یہ بھی ایسا ہی عقیدہ ہوا جیسے بعض ناواقف ہندو اپنے مذہب کے یزید کو ہندو سمجھتے ہیں اور اس تصور سے خوش ہوتے ہیں کہ وہ ہمارا ہم مذہب تھا۔ کیوں کہ وہ آپس میں کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی حکومت کے باعث ہندو مغلوب ہو گئے ہیں مگر ایام سابق میں ہمیشہ مسلمانوں پر انہیں غلبہ حاصل تھا۔ بعض جاہل مسلمان اور مکتب کے مُلّا اُن کی باتوں کی تصدیق کرتے ہیں۔ ایک مکتب کے ملا کو میں نے فیض آباد میں دیکھا جو بہت زیادہ متعصب تھا اور ہندوؤں کو نجس محض خیال کرتا تھا۔

ایک ہندو بچہ نے جس کے والد کے یہاں یہ ملازم تھا، گفتگو کے دوران شیعہ وسُنی کے لئے ایرانی اور تورانی الفاظ کے بارے میں معلوم کیا۔ وہ ملّا کہنے لگا کہ جب پروردگار کے حکم سے یزید نے حضرت حسین علیہ السلام کو مع اُن کی اولاد و اقربا کے قتل کر دیا۔ اور اُن کو درجۂ شہادت نصیب ہوا تو خداوند عالم کی طرف سے اُن کے بڑے بھائی حسن علیہ السلام کو سبز خلعت مرحمت ہوا اور خلعتِ سُرخ چھوٹے بھائی امام حسینؑ کو ملا۔ اہلِ عصمت خواتین کے خیمے میں ایک عورت تھی جو باورچی خانے میں چولھا سُلگا رہی تھی۔ اُس عورت کے ساتھ اس کا چھ مہینہ کا بچہ بھی تھا۔ جب یزیدی فوج کے لوگ اس بیچاری کے قریب پہونچے تو اس بچے کو قتل کرنا چاہا کیونکہ انھوں نے پہلے ہی یہ طے کر لیا تھا کہ امام حسین علیہ السلام کی اولاد اور اقربا میں سے کسی کو زندہ نہ چھوڑیں اور دوسرے لوگوں سے تعرض نہ کریں تو اس عورت نے قسم کھا کر کہا، اس لڑکے کا امام حسین علیہ السلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ قاتلوں نے اس پر رحم کھا کر قتل سے ہاتھ کھینچ لیا۔ جب وہ فتنہ فرد ہو گیا تو وہ عورت ایران چلی گئی اور اس لڑکے نے وہیں نشو ونما پائی۔ آخر قدرتِ الٰہی سے وہ ایران کا بادشاہ ہوا۔ اور اس نے ایک نیا مذہب رافضی ایجاد کیا۔ جن لوگوں کو ایرانی کہتے ہیں وہ اسی بچے کی اولاد میں ہیں جس کا نام

زین العابدین علیہ السلام تھا۔ اور ایرانی اس کو امام زین العابدین علیہ السلام بھی کہتے ہیں مگر یہ بالکل غلط ہے۔ کیونکہ امام حسین علیہ السلام کے ساتھیوں میں امام قاسم کے سوا کسی شخص میں اتنی لیاقت نہیں تھی کہ اسے "امام" کہا جائے۔

ماہِ محرم میں سیاہ پوشی

اور محرم میں سیاہ لباس پہننے کی جو ایرانیوں کی رسم ہے اس کا بانی یزید تھا اور زین العابدین ہر سال محرم میں امام حسین علیہ السلام کی یاد میں رویا کرتے تھے اور رونا خدا کی مرضی کے خلاف ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مرضی سے ان کو شہادت کے اس مرتبہ پر فائز کیا جو کسی شخص کو نصیب نہیں ہوا۔ لہذا کس بات پر رونا۔!

یہاں تک دس اوتاروں کے نام ختم ہوئے۔ اب دوسرا باب شروع کرتا ہوں۔

باب دوسرا

انسان کی پیدائش اور ان کی تقسیم فرقوں میں اور ملتوں کا اختلاف اور معتقدات کی تحریف

برہمن

کہا جاتا ہے کہ پہلا انسان برہما کے سر سے برآمد ہوا، اور اُس کا نام برہمن پڑا۔ جب اُس کی اولاد میں آدمیوں کی کثرت ہوئی، تو ان کی اٹھارہ قسمیں ہو گئیں ان کو ہندی زبان میں اٹھارہ برن کہتے ہیں۔ فارسی میں برن کے معنی صنف اور نوع کے ہیں اور منطقیوں کے اصطلاحی معنیٰ سے اس کا تعلق نہیں بلکہ صنف، قسم اور طور کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ لہذا اس سبب سے کہ برہمن کا جنم برہما کے سر سے ہوا، وہ تمام آدمیوں میں اشرف سمجھا جاتا ہے۔ اس کا صرف یہ کام ہے کہ بید پڑھے اور پڑھائے اور اپنے نفس کی تکمیل کرے اور خیرات کی روٹیاں کھائے۔ نوکری پیشہ برہمن اپنی ذات میں سب سے زیادہ رذیل سمجھا جاتا ہے اور اُس کا آقا ہندوؤں کے مذہب کے مطابق جہنمی ہوتا ہے۔ کیونکہ برہمن اس فرقہ کا معلم، مرشد اور رہنما ہے۔ اور نوکری میں یہ ہے کہ نوکر کام کرنے پر اور آقا کام لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کبھی نوکر کام کرنے میں سستی کرتا ہے اور آقا کا موردِ عتاب ہوتا ہے۔ اس طرح مرید کا عتاب مرشد پر ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے وہ مرید قابلِ افسوس ہے جو اپنے پیر کو موردِ قہر کرتا ہے۔ اور اس طرح اپنی ہڈیوں کو دوزخ کا ایندھن بناتا ہے۔ اسی وجہ سے ہر فرقہ کے اربابِ علم نوکری کو علم فروشی کہتے ہیں اور جو کچھ بھی بطور نذر حاصل ہوتا ہے خواہ وہ کم ہو یا زیادہ اسی پر قناعت کرتے ہیں اور نوکری میں ہمیشہ نفس لالچی ہوتا ہے اور انسان کو نیکیوں سے روکتا ہے۔ بہرحال برہمن کو چاہیئے کہ وہ تحصیلِ علم

اور تکمیلِ نفس میں متوجہ ہو اور جو کچھ اس کو بطریقِ نذر ہاتھ آئے اس پر اوقات بسر کرے تاکہ گدائی نہ کرنا پڑے۔ جو کوئی اُس سے کمزور ہو اُس پر رحم و شفقت کو اپنا شعار بنائے اور زنّار باندھنا اظہارِ شرافت کے لئے اور برہمن اور غیر برہمن میں فرق کرنے کے لئے اُسی سے مخصوص ہے۔

چھتّری

برہمن کے وجود میں آنے کے بعد برہما کے بازو سے دوسرا آدمی پیدا ہوا جسے چھتّری کہتے ہیں۔ اُس کا کام، شمشیرزنی، ملک گیری، قلعے فتح کرنا نوعِ انسان کی پرورش کرنا اور برہمنوں کی خدمت کرنا ہے۔ اور حفظِ شرافت کے لئے اور ان دونوں فرقوں پر تفوّق کے لئے جن کا ذکر بعد میں آئے گا، چھتّریوں نے برہمنوں سے زنّار حاصل کیا۔ چنانچہ چھتّری (کھتری) عموماً زنّار باندھتے ہیں۔ اپنی گردن پر زنّار ڈالتے ہیں۔ اور اگر اُن کی زنّار ٹوٹ جائے تو وہ برہمنوں کی طرح اس وقت تک کوئی بات نہیں کرتے جب تک دوسرا زنّار نہ باندھ لیں۔ اس عرصہ میں جو کچھ کہنا ہوتا ہے اشاروں سے کہتے ہیں اور جب پاخانہ پیشاب کی ضرورت ہوتی ہے تو زُنّار کو کان پر لٹکا لیتے ہیں۔

بیس

بالجملہ کھتری (چھتری) کے بعد جو انسان برہما کے ناف سے وجود میں آیا اُس کو بیس کہتے ہیں۔ اُس کی اولاد کا پیشہ تجارت، دکانداری اور زراعت ہے۔

شُودر

اسی طرح بیس کے بعد برہما کی پنڈلی سے جو شخص پیدا ہوا، وہ شُودر کہلایا۔ اور مندرجہ بالا تینوں ذاتوں کی خدمت شُودر کا فرض قرار پایا۔ ہندی میں شُودر کے معنی رذیل اور کم قدر آدمی کے ہیں۔ اور کفّار، اہلِ اسلام کو بھی شُودروں میں شمار کرتے ہیں اور یہ خیال محض خصومت کی بنا پر ہے۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے بلکہ دیکھا جائے تو مسلمانوں میں قیدِ شرافت ہندوؤں سے زیادہ پائی جاتی ہے۔

مسلمانوں میں قیدِ شرافت

نہ ہم نے کبھی یہ سُنا اور نہ کسی کتاب میں لکھا ہوا دیکھا کہ مسلمانوں میں کسی بادشاہ یا کسی امیر، یا کسی معزز انسان نے

اپنی عورت یا لڑکی کا رقص کرنا جائز سمجھا ہو بلکہ اس فرقہ کے رذیلوں میں بھی (مثلاً فراش، خدمت گار. سقہ. چوبدار اور بازاری لوگ مثلاً عطار خواہ وہ ہندوستانی اصطلاح میں دوا فروش ہو یا لغوی معنی میں عطر فروش) کبھی نہیں سنا گیا کہ وہ اپنی عورت کو ناچنے کی اجازت دیتا ہو. بلکہ اگر اس کی عورت ایسی حرکت کرے اور اس کو اطلاع ہو جائے تو اُسی وقت اُس کو قتل کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔

ہندوؤں میں قیدِ شرافت کا نہ ہونا اس کے برعکس ہندوؤں کے راجاؤں میں ہمیشہ یہ رسم رہی ہے کہ وہ اپنی لڑکیوں کو رقاصوں، سازندوں، اور ڈوم ڈھاڑیوں کے حوالے کر دیتے ہیں. جب بادشاہوں کا یہ حال ہو تو دوسروں کے بارے میں کیا کہا جائے اور جو ہندو عورتیں مردوں کے سامنے نہیں آتیں انھوں نے یہ پردہ نشینی اور ترکِ رقاصی مسلمانوں کی صحبت سے سیکھی ہے. چنانچہ اگر اب کسی ہندو سے کوئی کہدے کہ ذرا کل اپنی بی بی کو بھیج دینا. اُس سے مجھے کوئی بات کرنی ہے، تو وہ گالیاں دینے لگے گا اور آمادۂ قتل ہو جائے گا. اور اتنا قہر اسی لئے ہے کہ اب ان کی عورتیں پردے میں بیٹھتی ہیں. اگر وہ بے پردہ سڑک پر جائے تو اسے لوگوں کے گھروں تک جانے میں پھر کیا مانع ہو سکتا ہے۔

اور ہندوؤں میں بعضے فیل نشین کھتری اپنے ہم قوم ہندوؤں کو لڑکی دے دیتے ہیں جو ادنیٰ پیشے کرتے ہیں. مثلاً دلالی، نخود فروشی یا حلوائی کا پیشہ کرتے ہیں شاہجہان آباد کے کھتریوں میں ایک شخص صاحب نیل اور پالکی نشین تھا. مگر اس کے بڑے بھائی کا داماد اس کی سواری کے وقت صراحی اٹھاتا تھا. مگر مسلمانوں میں رذیل پیشہ والوں کو جیسے خدمت گار. سقہ. فیل بان فراش عطار یا حلوائی اور نان بائی وغیرہ کو پاجی سمجھتے ہیں متمول لوگوں کی تو بات ہی کیا ہے. اگر کوئی شریف آدمی دس روپیہ ماہانہ منصب بھی پاتا ہے تو وہ کسی پانچسو روپیہ تنخواہ پانے والے نیلبان سے رشتہ داری کو جائز نہیں سمجھتا، تو

پھر سقّہ وغیرہ اور دوسرے بازاریوں کے بارے میں تو کہنا ہی کیا۔ بلکہ بعضے امیر مرثیہ خوانوں کو بھی محرم کے سوائے اپنی مجلس میں بٹھانے کے لائق نہیں سمجھتے۔ اس پیشے کو بھی زیادہ تر شرفا معیوب سمجھتے ہیں۔

اس کے برخلاف ہندوؤں میں یہ ہے کہ بڑا بھائی کسی امیر کے دفتر میں نوکر ہے اور چھوٹا بھائی گلی گلی برف بیچتا پھرتا ہے۔ اور بعضے رذیل مسلمانوں نے جو یہ شہرت دے رکھی ہے کہ ایران میں یہ قیود نہیں ہیں۔ وہاں بازاری لوگ اور بادشاہی خاندان کے افراد دونوں عزت میں برابر سمجھے جاتے ہیں، یہ بات بالکل غلط ہے کیونکہ وہاں بھی رذیل اور شریف کے درمیان بہت فرق ہے۔ وہاں شرفاء کی اولاد روضۂ خوانی کو بھی معیوب سمجھتی ہے۔ جو ثواب کا کام ہے۔ اگر کوئی سیّد، درزی کا پیشہ اختیار کرے، یا کوئی مغل نان فروشی، سبزی فروشی یا سقّائی کو اپنا پیشہ بنالے تو اسے عزیزوں اور شریفوں کے سامنے بیٹھنے کی اجازت بھی نہیں ملتی۔ ایسی صورت میں قرابت کا تو گمان بھی نہیں کیا جاسکتا۔

چھتریوں کا دعویٰ اور ان کی غذا

بہر حال برہمنوں کی اٹھارہ شاخیں ہیں۔ چھتریوں کا دعویٰ ہے کہ اگلے زمانہ میں تمام برہمن سارے فرقہ کے کھتریوں کے ہاتھ سے پکی ہوئی روٹی اور اُس کے برتنوں میں پکا ہوا سالن کھاتے تھے مگر اب سوائے سارسُت فرقے کے اور کسی فرقے کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا برہمن نہیں کھاتے اور حقّہ بھی اُن کے ساتھ نہیں پیتے۔ کھتریوں کی غذا، ان لوگوں کے سوا جو ویشنو ہو گئے ہیں، گوشت، پلاؤ وغیرہ ہوتی ہے اور جس قسم کا گوشت بھی ہاتھ لگ جاتا ہے، کھا لیتے ہیں۔ مگر گائے کا گوشت اور مسلمانوں کے خوف سے سوّر کا گوشت نہیں کھاتے۔ البتہ کہیں ہاتھ آجائے تو کھانے سے چوکتے بھی نہیں۔ لیکن اب مسلمانوں کے دارالحکومت میں بہت دنوں سے رہنے کی وجہ سے اس کے کھانے کی عادت

نہیں ہے۔ شاید پہلے بھی اس کی طرف زیادہ رغبت نہیں تھی۔ ہاں اگر کسی ایسے شہر میں پہنچ جاتے ہیں جہاں کا حاکم ہندو ہو تو اس وقت دیکھنا چاہیئے۔ اگر وہاں کا حاکم راجپوت ہو یا کسی جگہ یقین سے ثابت ہوگیا کہ یہاں کا حاکم سور کھاتا ہے اور کسی دوسری قوم کا ہے تو پھر ہر شخص تامل کرتا ہے، بہرحال اگر حاکم سور کھاتا ہے تو یہ لوگ بھی کھاتے ہیں اگر وہ نہیں کھاتا تو یہ بھی نہیں کھاتے۔

بیشنو بیشنو کے معنی ہندی میں پرہیزگار، متقی، مرتاض، عبادت پیشہ ہندو کے ہیں، جو گوشت کھانے سے پرہیز کرتا ہے۔[۱]

کھتریوں کا اصلی مسکن اب بہت زمانہ سے کھتریوں کا اصلی مسکن پنجاب کا علاقہ ہے جو پانچ دریاؤں کے درمیان واقع ہے۔ وہ پانچ دریا یہ ہیں۔ ستلج، بیاہ (بیاس) راوی۔ چناب اور جھیلم۔ پنجاب، فارسی کے پنج اور آب کا مرکب ہے اور اس کی وجہ تسمیہ پانچ دریاؤں کے درمیان واقع ہونا ہے۔ پنجاب کے علاوہ دوسرے خطوں میں بھی کھتری پائے جاتے ہیں لیکن جو فرقے پنجاب کے شہروں کے قریب میں رہتے ہیں، اُن کے درمیان روٹی اور حقہ میں مشارکت پائی جاتی ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے درمیان قرابت ہوتی ہے۔ کیونکہ ہندوؤں میں اپنی لڑکی اس شخص کو دی جاسکتی ہے جس کے ساتھ ایک ہی برتن میں کھانا کھاسکیں اور یہی حال کسی کی لڑکی قبول کرنے کا ہے۔

پورب کے کھتری بعضے کھتری جو مدت سے پنجاب کی سکونت چھوڑ کر پورب میں رہنے لگے ہیں، پنجاب کے کھتری اُن کے ساتھ ایک برتن میں کوئی چیز نہیں کھاتے اور اُن میں آپس میں رشتہ بھی نہیں کیا جاتا۔ لیکن اگر کوئی پنجابی کھتری

---

[۱] اصل نسخے میں اس عبارت کے بعد یہ جملہ لکھا ہے "بیشنو کے معنی ہیں پرہیزگار، متقی اور عبادت پیشہ ہندو کے ہیں جو گوشت کھانے سے پرہیز کرتا ہو۔" راجپوتوں کا ذکر، فرقۂ کھتریوں کے بعد کیا جائے گا۔

سو سال پہلے پُورب میں آیا ہو اور وہ ایک ایسے کھتری سے جسے اُس ملک میں آئے ہوئے اتنی ہی مدّت گذر چکی ہو آپس میں رشتہ کرے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ پنجاب کے نووارد کھتری ان کے ساتھ کھانا اور قرابت کرنا جائز سمجھتے ہیں۔ لہٰذا وہ کھتری جو پنجاب سے پورب کے شہروں میں آتے ہیں اور یہاں خوش حال زندگی بسر کرنے کے باعث یہیں بس جاتے ہیں، جب اس کا لڑکا جوان ہو جاتا ہے تو شادی کے لئے اسے اپنے وطن کو بھیج دیتے ہیں اور اس طرح جب لڑکی کو شادی کے قابل پاتے ہیں، تو اُسے وطن بھیج کر داماد کو یہاں بلا لیتے ہیں یا لڑکی کو وہیں بھیج دیتے ہیں تاکہ بصورت دیگر وہ "پوربی" نہ کہلائیں۔ جو کھتری مدّت سے پورب میں سکونت اختیار کئے ہوئے ہوتے ہیں اور اب پنجاب میں آمد و رفت نہیں رکھتے، اُن کو "پُوربی" کہا جاتا ہے۔ پنجابی، انکے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہوتے اور رشتہ داری بھی ممنوع ہے۔ یہ پوربیئے بھی پنجابیوں کے ساتھ کھانے سے پرہیز کرتے ہیں اور پنجاب کے سب کھتری آپس میں کھانے اور حقے کی شرکت رکھتے ہیں مگر اُن میں تین فرقے ایسے ہیں جنھیں نیچ اور کم مرتبہ سمجھا جاتا ہے کھتری ان کے ساتھ ہرگز کوئی چیز نہیں کھاتے اور نہ اُن میں رشتہ کیا جاتا ہے۔

کھتریوں کی فضیلت

مختصر یہ کہ کھتریوں کی شرافت، ہندوؤں کے تمام فرقوں سے زیادہ ہے۔ کیوں کہ برہمن کے بعد چھتّری (کھتری) ہی زنّار باندھتا ہے اور ہندوستان کے تخت و تاج کا مالک بھی یہی فرقہ تھا

چھتری راجپوت نہیں ہیں

بعضے جہلا جنھوں نے کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا، یہ گمان کرتے ہیں کہ چھتری بھی راج پوت ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ ہندوؤں کی شرافت کا معیار برہمن سے ان کی قربت پر موقوف ہے۔ لہٰذا اگر راج پوت کھتریوں سے زیادہ شریف ہیں تو یہ ہونا چاہیئے کہ راج پوتوں کا پکایا ہوا کھانا برہمن کھالیں۔ اور ایسا نہ کبھی ہوا ہے، نہ ہو گا۔ یا پھر یہ ہونا چاہیئے کہ ہر راج پوت

زنار باندھے اور یہ بھی کبھی نہیں دیکھا گیا۔ اس کے برخلاف کھتری ہیں کہ اب بھی سارسست فرقے سے طعام اور قلیان میں شرکت رکھتے ہیں۔ اور کوئی کھتری بغیر زنار کے نہیں رہتا اور کھتری کے مقابلے میں راج پوت کو شودر سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستان میں کھتری ہمیشہ سے تخت و تاج کا حق دار سمجھا جاتا ہے۔

اس فرقے کی کتابوں میں اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہوا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہندوستان میں ایک راجہ تھا اس کی وفات کے بعد، اس کی اولاد میں صرف ایک کنیز زادہ باقی رہا۔ چونکہ حق وراثت اسی کو پہونچتا تھا۔ وہ باپ کی گدّی کا وارث ہوا اس نے اپنے چچا اور چچیرے بھائیوں کو اس وجہ سے کہ وہ اُس کے ساتھ حقہ پینے میں شریک نہ ہوتے تھے، ذلیل و خوار کیا۔ اُن غریبوں نے اپنی جان کے ڈر سے جلاوطنی اختیار کی اور جس کے جہاں سینگ سمائے چلا گیا۔ بعضوں نے نوکری کا پیشہ اختیار کیا اور کچھ لوگوں نے کوئی ہنر سیکھ لیا اور اہلِ حرفہ میں شامل ہو گئے۔ چنانچہ اس وقت تک اُسی مصیبت میں مبتلا ہیں۔

ہندی میں راج پوت کے معنیٰ ہیں۔ بادشاہ کی اولاد۔ کیوں کہ راج کے معنیٰ بادشاہ کے ہیں اور پوت لڑکے کو کہتے ہیں۔ یہ لقب ایسا ہی ہے جیسے اندھے کو بصیر کہتے ہیں کیونکہ اس لڑکے کے راج پوت کہلانے کی وجہ تسمیہ یہی ہے کہ وہ لونڈی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ اگر وہ نجیب الطرفین ہوتا تو اس کا لقب محتاج نہ ہوتا۔ بہرحال اُس نے بہتری کی کوشش کی۔ مگر برہمنوں نے اور اس کے بنی اعمام نے اُس کے ساتھ کھانے میں شرکت گوارا نہ کی۔ نہ اُسے زنار ملی۔ کیونکہ اگر برہمن اجازت دیتے تو وہ زنار باندھ سکتا تھا۔ آج بھی تمام فرقوں کا یہی حال ہے کہ بغیر برہمن کی اجازت کے زنار نہیں باندھ سکتے۔ یعنی راجپوت یا دوسرے فرقوں کے لوگ، جو صاحبِ دولت و ثروت ہو جاتے ہیں، برہمنوں کو خوب روپیہ کھلا پلا کر زنار باندھنے کی اجازت حاصل کرتے ہیں۔ اگر کسی کو

اس معاملہ میں تامل ہو تو صاحب علم برہمنوں سے اس معاملہ میں دریافت کر کے اپنی تشفی کر لے۔

کشمیری برہمن کشمیر کے برہمن اس فرقے میں سب سے زیادہ افضل اور شریف ہیں۔ اس فرقے میں صاحب تصنیف علماء پیدا ہوئے ہیں اور ان میں سے بعض پنڈتوں نے گوشت کھانا بالکل ترک کر دیا ہے باقی تمام زن و مرد گوشت کھاتے ہیں۔

سارسُت فرقہ سارسُت فرقہ کا تعلق کھتریوں سے ہے۔ ان کے تمام مرد گوشت کھاتے ہیں اور عورت کی جب تک شادی نہ ہو جائے نہیں کھاتی ہے، کھتریوں کے دوسرے فرقوں کا بھی یہی حال ہے۔

قنوجی برہمن دوسرا گروہ قنوجیوں کا ہے۔ یعنی قنوج کے برہمن۔ قنوج۔ ہندوستان میں ایک قدیم شہر ہے۔ یہاں کے برہمنوں کو قنوجی کہتے ہیں۔ یہ لوگ بھی گوشت کھاتے ہیں، سوائے اُن کے جنھوں نے ترک کر دیا ہے۔

غرض کہ برہمنوں میں کچھ تو گوشت سے اجتناب کرتے ہیں اور بعضے بے تکلف کھاتے ہیں۔ لیکن گائے کے گوشت سے تمام ہندو لوگ بالکل پرہیز کرتے ہیں۔ بلکہ اس کا گوشت کھانے والے کو ہندوؤں میں شمار نہیں کرتے۔

ویشوں میں کوئی فرقہ ایسا نہیں جو گوشت کھاتا ہو۔ سب اس سے پرہیز کرتے ہیں اور گوشت ہی پر موقوف نہیں بعض ترکاریوں سے بھی وہ اجتناب کرتے ہیں۔

کھتری پیاز کھاتے ہیں مگر لہسن نہیں کھاتے اور کالیست، جو کہ کایتھ کے نام سے مشہور ہیں، لہسن کھاتے ہیں اور پیاز سے بالکل پرہیز کرتے ہیں۔ اور ویش، پیاز، گاجر اور شلجم بھی نہیں کھاتے اور بعضے کھتری بھی شلجم سے پرہیز کرتے ہیں۔

ویشوں کی شاخیں ویشوں کی چند شاخیں ہیں۔ اُن میں سے ہر ایک صرف اپنے ہی اعمام اور رشتہ داروں کے ہاتھ کی پکی روٹی کھاتے ہیں۔ لیکن برہمن

اُن کے ہاتھ کا کھانا نہیں کھاتے ویش کے فرقوں میں دو فرقے سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ اگر والہ اور سراوگی۔ اس فرقہ کے لوگ عبادت گزار اور پرہیز گار بہت ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اُن کے سامنے گوشت کا نام بھی لے لے تو یہ اس کی صحبت سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔

شودروں کے فرقے شودروں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ یہ لوگ اہیر کہلاتے ہیں۔

جاٹ اور کنبی اسی طرح جاٹ اور کنبی ہیں۔ کنبی، ہندوؤں میں ایک فرقہ ہے جو کایتہ کہلاتا ہے۔ مگر دوسرے لوگ انہیں شودر کہتے ہیں۔ اپنے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ ہم کایتہ نہیں ہیں۔ بلکہ کایست ہیں یعنی ہم برہما کے تمام جسم سے پیدا ہوئے ہیں۔ جب کہ برہمن صرف سر سے، کھتری بازو سے، ویش ناف سے اور شودر پیروں سے پیدا ہوئے ہیں۔ کایتہ، ہندی میں بدن کو کہتے ہیں اور کایست جو بدن سے منسوب ہو۔ راقم الحروف کے نزدیک اس فرقے کے لوگ اپنے دعویٰ میں حق بجانب ہیں کیونکہ شودر تو وہ فرقہ ہے جو مذکورہ بالا تینوں فرقوں یعنی برہمن، چھتری، اور ویش کے ہاتھوں کا کھانا کھالے، مگر جاٹ، اہیر اور کایتہ کے ہاں یہ معاملہ نہیں ہے، یہ لوگ اپنے قرابت داروں، قنوجی برہمنوں اور گوڑ فرقے کے لوگوں کے سوا کسی دوسرے کے ساتھ کھانا نہیں کھاتے خواہ وہ برہمن ہو یا چھتری یا ویش یا کایتہ۔

کایتہ فرقے کی شاخیں واضح رہے کہ کایتہ فرقے کی بارہ شاخیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ اُن کے مورثِ اعلیٰ کی دو بیبیاں تھیں۔ ایک بی بی کے بطن سے چار لڑکے پیدا ہوئے اور دوسری بی بی سے آٹھ۔ اس طرح دو فرقے دو صورت کے ہیں اور اس حساب سے کل چودہ فرقے ہو جاتے ہیں۔ اِن چودہ فرقوں میں سے ہر ایک اپنے فرقہ کے علاوہ کسی دوسرے کے ساتھ طعام و قلیان میں شرکت نہیں کرتے۔

مگر قنوجی برہمن یا اسی طرح کے کسی ذات والے کے ہاتھ سے کھانا بے تامل کھا لیتے ہیں۔
یہ فرقہ اپنے آپ کو دھرم راج نامی کی اولاد میں شمار کرتا ہے۔ اور اپنے مورثِ اعلیٰ کو چترگپت کہتے ہیں۔ اُن کے قول کے مطابق دھرم راج، برہما کا بیٹا تھا۔ دوسرا فرقہ ان کا وہ ہے جو اپنا سلسلہ کایتوں سے ملاتا ہے۔ لیکن کایتہ، اُن کو اپنی قوم میں تسلیم نہیں کرتے۔

آنانیا فرقہ

یہ جماعت آنانیا کہلاتی ہے۔ بادشاہی محل کے دفتروں میں مرزایانِ دفتر جن کو ہندی میں متصدی کہتے ہیں، زیادہ تر اسی فرقہ کے لوگ ہیں۔
یہ لوگ حساب میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اور ان کے زن و مرد گوشت اور شراب سے پرہیز نہیں کرتے۔ سوائے اُن کے جو وشنو ہو گیا ہو۔ اور کھتری سیاق فارسی میں کایتوں کے شاگرد ہیں۔ وہ بھی زیادہ تر دفتروں میں نوکری کرتے ہیں۔ لیکن کھتری سپاہی اور عامل پیشہ بھی ہوتا ہے۔ کایتہ اکثر یا تو دفتر کا متصدی ہوتا ہے، ورنہ قانون گو یا زمیندار اور بہت کم حالتوں میں سپاہی یا عامل پیشہ ہوتا ہے۔ لیکن ان میں سے جو شخص سپاہی کا پیشہ اختیار کرتا ہے اور حقیقت میں عامل پیشہ ہے۔ اُس سے بہت شجاعت اور پامردی ظہور میں آتی ہے جو برسوں یادگار رہتی ہے۔ یہ لوگ نشہ کے عالم میں اپنے مقدور اور لوگوں سے تعلق کی بقدر مراعات کرتے ہیں۔ اور حالتِ ہوشیاری میں بھی دوسروں کے ساتھ حُسن سلوک کرنا اور اپنے گھروں کو اچھے فرش فروش سے آراستہ کرنا ان لوگوں کی عادت ہے۔ لہذا یہ لوگ شرافت میں کسی طرح چھتریوں سے کم نہیں ہیں۔ اور علوم ہندی کی تحصیل میں اور اُس سے شغف رکھنے میں نیز ترک و تجرید اور تقویٰ کی زندگی بسر کرنے میں، جو ان میں سے کسی کسی کو ملتی ہے، یہ برہمنوں سے پہلو مارتے ہیں اور بعضے گوشت خوری ترک کرنے میں لکڑی کے دانوں کی تسبیح گھمانے میں، نیز تجارت کرنے میں ویش کے مانند ہیں لیکن اس طبقے میں ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں اور بعضے جو صفاتِ رذیلہ

سے متصف ہیں اور علم میں بالکل کورے ہیں، اُن کو شودر بھی کہا جا سکتا ہے اور کاتیوں (کاتھیوں) ہی پر کیا موقوف ہے ہر جاہل اور بازاری آدمی کا یہی معاملہ ہے لیکن اصل میں تو شودر وہی ہیں کہ ان میں کبھی کوئی باکمال انسان نہ پیدا ہوا ہے نہ ہوگا۔ جیسے کہار، کہ اگر وہ ساتویں آسمان پر بھی پہنچ جائیں تو اشراف میں ان کا شمار نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اہیر یا جاٹ یا کنبی اور کہار ایسی جماعتیں ہیں جو........ لوگوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھاتی ہیں اور یہ لوگ پالکی برداری بھی کرتے ہیں۔

فرقہ کنبو

اسی طرح ایک فرقہ کنبو ہے۔ ملتان اور اُس کے اطراف میں یہ لوگ ایک قول کے مطابق شودر ہیں اور بعضے لوگوں کے نزدیک ویش ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ اسلام سے مشرف ہوئے اور انھوں نے قدر و منزلت پیدا کی۔ اس طرح کہ سلاطین، وزرار اور امرار کا تقرب ہمیشہ ان کو حاصل رہا۔ ان میں سے سب لوگ کمال دوست، آشنا پرست، آقا کے دولت خواہ اور غیور و دانشمند ہوتے ہیں، اس فرقے میں بہت سے علمار والامرتبت اور قُضاۃِ عالی منزلت اور اہلِ تقویٰ گزرے ہیں۔ اگرچہ اسلام قبول کرنے میں یہ لوگ مغلوں پر سبقت رکھتے ہیں مگر اپنی قوم کے سوا کسی دوسرے فرقے میں رشتہ داری کو جائز نہیں سمجھتے۔ سیّدوں کو اپنا پیر و مرشد سمجھتے ہیں۔ لیکن ایسے لڑکے کو جو کسی سیّد کی لڑکی کے بطن اور کسی کنبو کے نطفے سے پیدا ہو، نجیب نہیں سمجھتے کوئی کنبو ایسے شخص کو اپنی لڑکی دینے پر آمادہ نہیں ہوگا۔ ہاں وہ لڑکی اس سے منسوب کی جا سکتی ہے جو کسی کنیز کے بطن سے ہو اور علیٰ ہذا اگر لڑکی ہے تو کوئی کنبو اپنے لڑکے کی اس سے شادی پسند نہیں کرے گا چاہے وہ کسی سیدہ کے پیٹ سے ہو۔ جب سیّدوں کے ساتھ یہ معاملہ ہو تو مغلوں، شیخوں، یا افغانوں کی کہاں پرسش ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ یہ فرقہ بھی دنیاوی عزت و حرمت میں کسی فرقہ سے کم نہیں ہے۔

مختلف فرقوں میں کھانے پینے کے تعلقات

واضح رہے کہ ہندو اپنے عزیزوں کے سوا کسی کے ساتھ ایک برتن میں کھانا نہیں کھاتے، نہ اُن کے ساتھ حقّہ پیتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ توے پر پکائی ہوئی گیہوں کی روٹی اور چاول وغیرہ نہیں کھاتے۔ ہاں اگر روغنی روٹی یا مٹھائیاں ہوں تو بلا تامل کھالیں گے۔ اسی طرح حقّے کی نلی بھی منھ سے نہیں لگاتے، بلکہ نارجیل کے سوراخ پر ہاتھ رکھ کر اس سے پی لیتے ہیں خواہ وہ کسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں اس میں کچھ ہرج نہیں سمجھتے۔ اسی طرح حقّہ خواہ وہ کسی چیز کا بنا ہوا ہو اُنھیں پینا ہوگا تو اُس کی نلکی نکال کر علیٰحدہ رکھ دیں گے اور سوراخ پر مٹھی لگاکر دم کھینچ لیں گے۔

دوسری قوموں میں فرق

کھتریوں، برہمنوں اور دوسری قوموں میں فرق یہ ہے کہ تمام ہندوؤں کے عقیدہ کے مطابق چچا، ماموں، پھوپھی اور خالہ کی اولاد کو بلکہ جو ایک ہی دادا کی پیڑھی میں ہو، اُسے سگی بہن کی برابر سمجھتے ہیں اور کھتری جس قوم کو اپنی لڑکی دیتے ہیں اس کی لڑکی لیتے نہیں ہیں اور جس قوم سے لڑکی لیتے ہیں اُسے دیتے نہیں، البتہ بعض برہمنوں اور رکاتیوں میں اس قاعدے کی زیادہ پابندی نہیں ہے، کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ زید عمرو کا سالا ہے اور عمرو زید کا سالا ہے، دکن کے بعض ہندو اپنے بھانجے کو لڑکی بیاہ دیتے ہیں لیکن بہر حال جو ہندو دھرم شاستر کے پیرو ہیں وہ خالہ یا پھوپھی کی لڑکیوں کو اور بڑی بھاوج کو خواہ بھائی سگا ہو یا رشتے کا، اپنی ماں کی طرح سمجھتے ہیں۔ اور چھوٹی بھاوج کو بہن کی جگہ مانتے ہیں۔

باب تیسرا

ان ہندوؤں کے معتقدات کا بیان جو اپنی شریعت کے دائرے سے باہر ہیں

بُت پرستی کی حقیقت

ابھی تک سمارتکیوں کے فرقے کا ذکر ہو رہا تھا۔ یہ لوگ حقیقتِ مطلق کو بے چون و بے چگون مظاہر کو جو ان کے عقیدے کے مطابق اسلام کے انبیاء اور رسولوں کی طرح ہیں، ذاتِ خداوندی کا مظہر سمجھتے ہیں اور اُن کی عبادت کرتے ہیں۔ وہ متشرّع لوگوں کی طرح کسی چیز کے منکر نہیں ہیں اور اُن کی بُت پرستی ایسی نہیں ہے کہ وہ بتوں کو خدا یا خدا کا مظہر سمجھتے ہوں بلکہ وہ اس طرح صاحبِ صورت کو دوست رکھتے ہیں جیسے ایک عاشق معشوق کی تصویر سے دل بہلاتا ہے۔ عقیدہ خواص ہی کا قابلِ اعتبار ہے۔ عوام کے عقائد معتبر نہیں ہوتے۔ بُت پرستی کی اصلیت تو اتنی ہی ہے لیکن اس فرقے کے عوام یقیناً بتوں کو خدا سمجھتے ہیں اور نارائن، نرنکار و جوتی سروپ جو جناب کبریا کا نام اور اس کی صفت ہے (نارائن بمعنی خدا۔ نرنکار۔ بے شبہ، بے نمون اور جوتی سروپ۔ نورِ مطلق) ان کے علماء خلوص باطن سے صورت پرستی نہیں کرتے۔ انھوں نے جتنی ظاہر پرستی اختیار کر رکھی ہے اتنی تو وہ، دوسرے مذاہب میں بھی دلیل و برہان سے ثابت کرتے ہیں لیکن وہ اپنا مضحکہ اڑاتے ہیں کیونکہ ہر فرقے کے عوام کے افعال مذموم ہوتے ہیں، سب کار روئے سخن خواص کی

طرف ہی ہوتا ہے۔

اگھور پنتھی۔ بہر حال اب ہندوؤں کے ایک اور مذہب کا ذکر کیا جاتا ہے جو اپنی شریعت کی حد سے باہر ہیں۔ اُنھیں میں ایک فرقہ ہے جو گورکھ ناتھ کے سوا کسی دوسرے کی پرستش نہیں کرتا۔ گورکھ ناتھ ایک عبادت گذار فقیر تھا جس کے پیروکار جوگی کہلاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ گورکھ ناتھ عین ذاتِ خداوندی تھا اور تمام اشیائے موجودہ میں اس کا جلوہ جاری و ساری ہے اور تمام مذاہب و ادیان کا سلسلہ اُس پر ختم ہوتا ہے۔ اُن کا عقیدہ دلائل اور براہین کے ساتھ یہ ہے کہ جب اُس کی خواہش ہوئی کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو وجود میں لائے تو خود اُس نے سرورِ انبیاء کی دایہ کی شکل اختیار کر لی اور اس طرح آں حضرتؐ کو گود میں پالا۔ اُن میں سے بعض اسی دلیل کی بنا پر گائے کا گوشت بھی کھا لیتے ہیں اور اُن میں بعض اس دلیل کی وجہ سے کہ گورکھ ناتھ نے حضرت مریم کی شکل اختیار کر کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جنم دیا تھا نصرانیوں کی تقلید میں سور کا گوشت کھانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ جو ہندو اس فرقے کے مرید اور مقلد ہیں وہ نوعِ انسانی میں کسی فرقے کو اپنے فرقہ کی برابر نہیں گردانتے۔ اور ان میں کے کامل ترین لوگ وہ ہوتے ہیں جو اگھور پنتھی کہلاتے ہیں۔

یہ کھانے کی اشیا میں بول و براز ملا کر کھا لیتے ہیں اور ہندو اس فرقے کو منبعِ کمالات و مخزنِ کرامات سمجھتے ہیں۔

چارواگ چارواگ، ہندوؤں کی ایک جماعت ہے جو کسی پیشوا کی مقلد نہیں ہے۔ یہ لوگ برہمنوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ لوگ اپنے گلے میں جنیو (زنار) اس لئے باندھتے ہیں کہ ڈھور ڈنگروں کو بغیر رسّی کے نہیں چھوڑا جا سکتا۔

دریائے گنگا گنگا جو ہندوستان کا ایک بہت بڑا دریا ہے، ہندو اس کا نام بڑی تعظیم اور توقیر کے ساتھ زبان پر لاتے ہیں اور گنگا کو صاحبِ کشف و

کرامات عورتوں میں شمار کرتے ہیں اور اس بات پر متفق ہیں کہ گنگا مہادیو کی جٹا سے نکلی ہے۔ یہ مقدس دریا فرقۂ چارواگ کے اعتقاد میں انزال کے پانی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ یہ لوگ مہادیو کو عضوِ تناسل نیز برہما اور بشن کو دو فوطے قرار دیتے ہیں یعنی مہادیو، برہما اور بشن، یعنی، ان کا عقیدہ ہے کہ تینوں نام انسان اور حیوانات کے عضوِ تناسل کا ایک علامتی نام ہیں اور ہندو مُردوں کے لئے جو کھانا پکوا کر برہمنوں وغیرہ کو کھلاتے ہیں وہ بھی ان کے عقیدہ کے مطابق بالکل بے کار بات ہے۔ اس کی کوئی لذّت یا فائدہ مُردے کو نہیں پہونچتا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ بات تو اس وقت قبول کی جاسکتی ہے جب ایک شخص کسی شہر سے ایک منزل کے فاصلے پر جائے۔ اور مفلسی کی وجہ سے بھوکا مر رہا ہو اور شہر میں کھانا پکا کر اس کے نام سے تقسیم کر دیا جائے اور وہ برابر بھوک سے فریاد کرتا رہے۔ اگر اس کھانے کا کوئی فائدہ اسے پہونچ سکتا ہے تو مردے کو بھی اس "بھوگ" سے نفع ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے پس اگر زندگی میں یہ بات ممکن نہیں تو مُردے کے لئے بدرجۂ اولیٰ فضول ہے۔

سراوگی

سراوگی نام کا ایک گروہ ہے جو سوائے پارس ناتھ کے کسی دوسرے کی پوجا نہیں کرتا۔ یہ ایک جگہ کا نام ہے جو پارس ناتھ کا مسکن تھا۔ اس مذہب کے پیرو بہت ہی رحمدل واقع ہوئے ہیں۔ اتنے کہ حماقت اور بزدلی کی حد تک۔ یہ "کاٹنے" کے لفظ سے اتنے گریزاں ہیں کہ اسے زبان پر لانا بھی گوارا نہیں کرتے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہ لوگ ہر قسم کے گوشت سے بلکہ ہر اس چیز سے جو رنگ اور بو میں اس کے مانند ہو، مثلاً مسور اور سخت گاجر وغیرہ سے پرہیز کرتے ہیں۔ کیونکہ مسور رنگ میں اور گاجر ہڈی میں گوشت سے مشابہ ہے، گوشت یا اُس سے مشابہ اشیاء کے سوا جو کچھ بھی ہاتھ آجائے اس کے کھانے میں پرہیز نہیں کرتے۔ جب یہ لوگ بینگن یا کدو یا اور کوئی چیز بازار سے لاتے ہیں اور اُس کو چھیل کر پکانے کا ارادہ کرتے ہیں۔ اگر اس وقت کوئی شخص آجائے اور پوچھ بیٹھے کہ یہ بینگن (یا جو کچھ بھی ہو) کس نے کاٹ کر تھال میں رکھا ہے تو پھر یہ اُسے کھانا یا پکانا

تڑی بات ہے، ہاتھ نہیں لگائیں گے، کیونکہ "کاٹنا" ان کی اصطلاح اور عقیدے کے مطابق ذی حیات (جیو) کے لئے آتا ہے چاہے وہ آدمی ہو یا حیوانوں میں سے کوئی اور جنس ہو۔ اور جس طرح کسی جاندار کی ہتیا کرنے میں یا اس کے اعضا کاٹنے سے یہ خود بچتے ہیں اسی طرح اگر کوئی اور شخص یہ حرکت کرے تو اُسے دیکھنے کے بھی روادار نہیں ہوتے، اس عمل کے فاعل یا گوشت کھانے والے کو، یا اس عمل کے دیکھنے والے کو وہ سخت بے رحم خدا ناترس، اور شقی سمجھتے ہیں۔ لہٰذا لفظ "کاٹنا" سے ان کا ذہن کسی جاندار کے ہاتھ پاؤں کاٹنے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور یہ تصور انھیں پھر اس چیز کے کھانے کی اجازت نہیں دیتا جس کے لئے یہ استعمال کیا گیا ہو۔ (خواہ وہ ترکاری ہی کیوں نہ ہو)

اس فرقے کے سلسلے میں ایک اور حکایت یوں بیان کی گئی ہے کہ کسی زمانے میں ہندوستان کے کسی شہر میں جہاں کا حاکم راج پوت تھا، ایک مفلس مسافر وارد ہوا، قیاس یہ ہے کہ وہ شہر جودھ پور، اودے پور، بیکانیر اور انبیر میں سے کوئی شہر ہوگا۔ ان میں سے جودھ پور اور بیکانیر، راٹھور، راجپوتوں کے دار الحکومت ہیں۔ اور انبیر کچھواہہ نامی راجپوتوں کی ریاست ہے۔ راجہ جے سنگھ سوائی حاکم انبیر نے بہت خوبصورت عمارتیں اور بازار بنوا کر انبیر کا نام جے نگر رکھا تھا، اسی کو جے پور بھی کہتے ہیں۔ اور اودے پور ہندوستان کا پایۂ تخت ہے۔ کسی زمانہ میں تمام راجہائے عالی شان، راجہ اودے پور کے تابع فرمان تھے۔ اگرچہ اب وہ ریاست (اودے پور) بادشاہ ہندوستان کی طرح دوسروں سے مغلوب ہے اور مسلمانوں کی لکھی ہوئی بعض تاریخوں میں لکھا ہے کہ راجہ اودے پور، نوشیروانِ عادل کی نسل سے تھے لیکن یہ بات بالکل بے اصل ہے اور سادات میں سے کچھ لوگ بغیر کتاب دیکھے راجپوتوں سے ہمشیرزادگی کا رشتہ ثابت کرتے ہیں اور اُسے حضرت شہر بانو کے واسطے سے کہتے ہیں، جنھیں حضرت علی اصغر کی عجمی والدہ لیلیٰ سے نسبت ہمشیرزادگی تھی۔ علی اصغر حضرت حسینؓ کے منجھلے صاحبزادے تھے، جو اب علی اکبر کے نام سے مشہور ہیں۔

اور یہ راجپوت اپنے سفلہ پن اور نوشیرواں عادل کی نیک نامی اور اسلام کے طعنے پر نظر رکھتے ہوئے اس فرضی قرابت کا اقرار کرتے ہیں اور اُسے آخرت کا سرمایۂ سعادت سمجھتے ہیں۔

حسینی برہمن

مگر یہ دعویٰ بھی حسینی برہمنوں کے دعوے کی طرح لغو ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ برہمنوں میں ایک گروہ اس بات کا مدعی ہے کہ ہم لوگ حسینی برہمن ہیں اور ہندوؤں کے آگے کبھی دستِ سوال دراز نہیں کرتے، مسلمان جو کچھ دیتے ہیں ہم اسی پر بسر اوقات کرتے ہیں۔ مسلمانوں ہی سے مانگنے کی یہ قید بھی یوں لگا رکھی ہے کہ اس سے مسلمان خوش ہو کر انہیں کچھ نہ کچھ دیتے رہیں، ورنہ ہندو اُن مسلمانوں سے جو یزید کے ساتھی تھے، بدرجہا بہتر ہیں۔ بہر حال ان کا دعویٰ ہے کہ جب یزید کے ساتھی شہداء کے سروں کو لے کر دمشق کی طرف روانہ ہوئے تو ایک رات کو کسی برہمن کے گھر قیام کیا۔ آدھی رات کے بعد جب سارا گھر سویا ہوا تھا، آسمان سے ایک تخت اُس مکان میں اُترا۔ اُس تخت کی برکت سے تمام گھر منور ہو گیا۔ پھر اُس تخت سے نورانی چہرے والا ایک شخص اترا اور اُس نے وہ سر، زمین سے اٹھا لیا۔ اور حضرت حسینؓ کے سرِ مبارک پر بوسے دیئے پھر بین کے ساتھ رونا شروع کیا۔ اسی طرح تین اور اشخاص اس تخت سے اترے۔ پھر ایک اور تخت ہوا سے زمین پر نازل ہوا۔ اُس تخت پر چار عورتیں تھیں۔ ان میں سے ایک عورت نے سرِ مبارک کو زمین سے اُٹھا کر بوسے دیئے اور رونا شروع کیا۔ غرض سویرا ہونے تک وہ دونوں تخت آسمان کی طرف روانہ ہو گئے۔ مالک مکان کی بیوی نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا اور وہ بہت روئی۔ اُس نے اپنے شوہر کو یہ ماجرا سنایا۔ برہمن نے یہ خواب سُنا تو سرِ مبارک کو زمین سے اٹھا لیا اور کسی جگہ چھپا دیا۔ جب صبح ہوئی اور سروں کو لے جانے والوں نے روانگی کا ارادہ کیا اور سروں کے ڈھیر میں حضرت حسینؓ کا سرِ مبارک نہ پایا تو بہت حواس باختہ ہوئے اور انھوں نے صاحبِ خانہ سے پوچھ گچھ شروع کی۔ برہمن نے قسمیں کھائیں مگر جب ان لوگوں نے اُسے ڈرایا دھمکایا تو اس نے اپنے ایک لڑکے کا سر کاٹ کر ان کے حوالے کر دیا جسے سپاہیوں نے یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ یہ وہ

سر مبارک نہیں ہے اب وہ بے چارا اپنے دوسرے لڑکے کا سر کاٹ کر لایا۔ اُسے بھی انھوں نے رد کر دیا۔ اس طرح اس نے اپنے اٹھارہ لڑکوں کے سر کاٹ کر اُن کو دیئے اور انھوں نے ہر بار انھیں شناخت کر کے رد کر دیا۔ بالآخر انھوں نے اس غریب برہمن کو قتل کر ڈالا اور حضرتِ حسین رضؓ کے سرِ مبارک کو نکال کر شام لے گئے۔ یہ قصہ حسینی برہمنوں کی زبانی منقول ہے لیکن دوسرے ہندو اور برہمنوں کے دوسرے فرقے اسے ٹھٹھول سمجھتے ہیں۔ طرفہ تر یہ ہے کہ بعض بیوقوف اثنا عشری اور خصوصاً امیر زادے اُسے باور کرتے ہیں اور وہ حسینی برہمنوں کی تعظیم و توقیر، اپنے علماء دین کی تعظیم و توقیر سے بھی زیادہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ لوگ ہم سے بلکہ ہمارے علماء دین سے بھی بدرجہا بہتر ہیں کیوں کہ ان کے بزرگوں نے حضرت سید الشہداء علیہ السّلام کے لئے اپنے اٹھارہ لڑکوں کو قربان کر دیا تھا، بس اتنا کہہ کر رونا شروع کر دیتے ہیں۔

یہاں حسینی برہمنوں کے بارے میں ایک دلچسپ قصہ یاد آگیا۔ جن دنوں ہندوستان کے وزیر نواب عماد الملک نے کالپی میں رحلت فرمائی اور راقم الحروف اُن کی وفات کے بعد وہاں قیام پذیر تھا تو ایک ہندو، نواب مرحوم کے داماد میر نصیر اللہ، کے ساتھ خواجہ امیر خاں سلمہٗ تعالیٰ کے مکان پر آیا جو نواب مقدم الذکر کے خالہ زاد بھائی اور نواب موصوف کے داماد تھے۔ اُس نے کہا "میں حسینی برہمن ہوں اور کربلائے معلیٰ کا رہنے والا ہوں"۔ میں نے پوچھا: تمہارا نام کیا ہے۔؟ کہنے لگا، نور محمد پانڈے، یعنی ملّا نور محمد۔ کیونکہ ہندی میں پانڈے کا وہی مفہوم ہے جو فارسی میں ملّا کا ہے اور یہ لقب برہمنوں کے لئے مخصوص ہے۔ اب ہر برہمن کے نام کے ساتھ مجازاً لفظ پانڈے کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ میں نے عربی میں پوچھا (این مولدک) تمہاری جنم بھومی کونسی ہے ؟ تو ہنس کر کہنے لگا کہ ہمارے کربلا میں فارسی زبان کوئی نہیں سمجھتا۔ وہاں کی زبان اَرَوی ہے یعنی عربی۔ اب میں نے فارسی میں پوچھا کہ "زن جبیب و دختر را کجا گذاشتہ آمدہ"۔ بیوی بچّوں کو کہاں چھوڑ آئے۔ تو کہنے لگا۔ ہاں یہ اروی (عربی)

نور محمد پانڈے

ہے۔ میں سمجھ گیا کہ بندیل کھنڈ کا پھیر ہے۔ اسے کچھ دے دلا کر رخصت کر دیا۔ جب وہ چلنے لگا تو ایک عزیز نے پوچھا کہ میر سید علی مجتہد کو جانتے ہو، کہنے لگا دس سال سے مکہ معظمہ کو چلے گئے ہیں۔

خیر وہ تازہ وارد مسافر (جس کا ذکر چل رہا تھا) راجپوتوں کے اُن شہروں میں سے کسی شہر میں آیا چوں کہ صاحبِ عزت تھا۔ سوال کرنے کو عیب سمجھتا تھا۔ پہلی رات تو بھوکا سو گیا۔ جب صبح ہوئی تو اس شہر کے کسی باشندے نے اس کے حال سے واقف ہو کر یہ پٹی پڑھائی کہ بازار میں جا کر فلاں سراوگی صرّاف کی دوکان کے آگے بیٹھ جاؤ اور جو لباس تم پہنے ہوئے ہو اس میں سے جوئیں پکڑ پکڑ کر ناخن سے مارتے رہو۔ جب وہ سراوگی فریاد کرے کہ میری دوکان کے سامنے یہ حرکت مت کر تو ذرا سا دور ہٹ جانا۔ لیکن بس اتنا کہ اس کا سامنا رہے اور پھر وہی حرکت شروع کر دینا۔ اب وہ سراوگی پھر چیخے گا کہ یہ کیا کرتا ہے تو کہنا کہ اس زمین کا تمہاری دوکان سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ تم خواہ مخواہ کیوں غل مچاتے ہو؟ میں ان جوؤں کی وجہ سے ساری رات نہیں سو سکا اور میرے پاس دوسرے کپڑے نہیں ہیں جو انہیں دھوبی کو دے سکوں۔ اس لئے مجبوراً جوئیں مار رہا ہوں۔ یہ سن کر وہ دوکان دار تمہیں ضرور کچھ نہ کچھ دے گا۔ مگر تم اُسے قبول کرنے سے انکار کر دینا اور اپنا کام جاری رکھنا۔ یہاں تک کہ وہ پریشان ہو کر روپے بڑھانا شروع کرے گا اور رفتہ رفتہ نوبت سیکڑوں روپے کی پیش کش تک پہونچے گی۔ جب تم دیکھو کہ اب وہ حسبِ منشائ رقم دے رہا ہے تو اس وقت روپیہ قبول کر لینا اور جوئیں مارنی بند کر دینا۔ اُس مسافر نے یہی عمل کیا۔ صبح سویرے سے ظہر تک اُس نے دوکان دار سے سات سو روپے حاصل کر لئے۔

اس میں شک نہیں کہ سراوگی فرقے کے لوگ بہت ہی رحمدل اور کم آزار ہوتے ہیں۔ کبھی مُنھ نہیں دھوتے، کلی بھی بہت کم کرتے ہیں۔ چنانچہ ہندوؤں میں مشہور ہے کہ

سراوگیوں کے دانتوں میں اتنا میل ہوتا ہے کہ اگر اُسے لفافہ پر لگائیں تو اُسے بند کرنے کیلئے گوند یا لئی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ یہ لوگ دوسرے ہندوؤں کے برخلاف غسل کئے بغیر کھانا کھاتے ہیں اور کھانا کھاتے وقت لباس بھی نہیں اتارتے اور ان دونوں باتوں میں، (یعنی کھانے سے پہلے غسل نہ کرنا اور کھانا کھانے کے لئے لباس نہ اُتارنا) پنجابی کھتری اور کشمیری برہمن بھی اسی فرقہ سے مشابہت رکھتے ہیں۔ کھتری دونوں حالتوں میں اور کشمیری صرف کپڑے پہن کر کھانا کھاتے ہیں۔ لیکن بعض کشمیری غسل کی قید کو بھی ملحوظ نہیں رکھتے لیکن کچھ لوگوں نے پنجابی کھتریوں کی طرح پورب کے شہروں میں آکر ہر روز غسل کرنے اور کھانا کھانے کے وقت کپڑے اتار دینے کی عادت ڈال لی ہے۔ بس اتنا ہی فرق ہے کہ کھتری سخت ضرورت میں یا شدید گرمی میں غسل کر لیتا ہے۔ اور سراوگی کسی حال میں بھی بدن نہیں دھوتا۔ اس بارے میں اس فرقے کے پیرو یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ :-

سیوڑے بسا اوقات یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بہت ہی چھوٹے موٹے جاندار وجن کا وجود جزء لایتجزیٰ کی طرح وہی ہوتا ہے، پانی بہانے سے زمین پر گر کر ہلاک ہو جاتے ہیں اور بعض لوگوں کے نزدیک منھ کی بھاپ سے بعض جاندار مر جاتے ہیں۔ اس بنا پر اس فرقے کے کچھ لوگ موٹا کپڑا منھ پر مضبوط باندھ کر چلتے ہیں۔ اس فرقہ کو سیوڑہ کہتے ہیں۔ بہت سے سیوڑوں نے علوم وحکمت کی تحصیل کی ہے۔ اور یہ لوگ تبحرِ علمی میں دوسرے ہندوؤں سے بڑھ گئے ہیں۔ بہت سے ہندو اُن کے اقوال کو وجودِ ربانی کے قدم اور کائنات کے حدوث کی دلیل میں پیش کرتے ہیں۔ علامی شیخ ابو الفضل، وزیر اکبر بادشاہ نے بھی اکبر نامہ میں سیوڑوں کے قول کو دلیل بنا کر موجودات کی ابتدا کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ہمارے زمانے میں یہ لوگ متعلم ہیں اور سود وغیرہ کا روپیہ جمع کرنے کی وجہ سے اچھی نظر سے نہیں دیکھے جاتے۔ سراوگیوں کو اوسوال بھی کہتے ہیں۔ سیوڑہ لوگ شادی نہیں کرتے اور بعض سراوگی بھی جو منھ پر کپڑا نہیں باندھتے، عورت سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو

"جتی" کہا جاتا ہے۔ بلکہ ہندوستان میں اس لفظ کا استعمال اسی معنی میں ہوتا ہے یعنی غیر سرادگی کو بھی جو عورت سے بچتا ہے خواہ ہندو ہو یا مسلمان "جتی" کہہ دیا جاتا ہے۔ اس فرقہ کا اصلی وطن راجپوتوں کے کہی شہر اور اس کے اطراف میں ہے۔ چنانچہ اس گروہ کے کچھ لوگ اپنے آپ کو راجپوت سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ خیال محض پاگل پن ہے۔

اگروال

یہ سب لوگ ویش ہیں۔ شریعت سے باہر ہونے کی وجہ سے اگروال جاتی کے لوگ سراوگیوں سے دلی عداوت رکھتے ہیں لیکن بعض لوگوں نے ان کا مذہب اختیار کر لیا ہے۔ اگروال جاتی کے لوگ پارس ناتھ کی مورتی کو ہاتھی پر بٹھا کر بڑی شان وشوکت کے ساتھ شہر میں گھماتے ہیں۔ پنجابی کھتریوں کے بعد اس فرقے کے مردوں اور عورتوں میں حُسن پایا جاتا ہے۔

شنوی

ہندوستان میں ایک جماعت شنوی کہلاتی ہے۔ ان کی عادت یہ ہے کہ رمضان کے چاند کی پہلی سے لے کر آخری تاریخ تک (پورے مہینے) خوب نمازیں پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں اور کلامِ پاک کی تلاوت بھی کرتے ہیں اور رات رات بھر عبادت کرتے رہتے ہیں۔ پانچوں وقت کی نمازیں حنفی سنیوں کے مسلک کے مطابق ادا کرتے ہیں اور ہندو مذہب کے روزے بھی نہیں چھوڑتے اور روزوں کے سوا اس فرقے کے عقائد میں جتنی عبادتیں بھی مقرر ہیں ایک ایک ادا کرتے ہیں۔ ایک طرف تو محرم میں تعزیہ داری کرتے ہیں، فقراء اور مساکین کو کھانا کھلاتے ہیں اور شربت پلاتے ہیں۔ دوسری طرف کالکا کے سامنے رقص بھی کرتے ہیں، متھرا اور بندرابن میں جو ہندوؤں کے تیرتھ استھان ہیں، آرتی بھی سنتے ہیں اور خود بھی گا گا کر اشلوک پڑھتے ہیں۔ کالکا، منسا دیوی کی مظہر ایک عورت ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے اور آرتی وہ الفاظ ہیں جو رام اور کنھیا کی مدح میں گائے جاتے ہیں۔ یہ دونوں بشن کے اوتار ہیں۔ اس جماعت کا یہ قاعدہ ہے کہ ضروری امور سے فارغ ہو کر رات کے وقت یہ مدحیہ الفاظ گاتے ہیں اور پیتل کا کوئی برتن خواہ چھوٹی

شکل کا، ہاتھ میں لے کر اسے انگلیوں سے ساز کی طرح بجاتے رہتے ہیں، اس سے گیت میں جان پیدا ہو جاتی ہے۔ بشنوی لوگ ہندوؤں کی پیروی میں گائے کے گوشت سے اور مسلمانوں کی تقلید میں سور کے گوشت سے پورا پورا پرہیز کرتے ہیں۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ انکی ابتداء کہاں سے ہوئی۔ اُن کے نام مسلمانوں سے ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ راقم الحروف کا یہ گمان ہے کہ مسلمان بادشاہی کے زمانہ میں یہ لوگ جبر کی وجہ سے مسلمان ہوئے ہیں چونکہ ایک ہندو کے مسلمان ہو جانے کے بعد ہندو لوگ اس کو اپنی مجلسِ طعام میں ہرگز داخل نہیں ہونے دیتے، ایک جگہ کھانا کھانا تو کس حساب میں ہے۔ اس لئے یہ بے چارے مجبوراً مسلمان بنے رہے کیونکہ انھوں نے ہندوؤں میں اپنی کوئی گنجائش نہیں دیکھی۔

شاید انھوں نے دل سے اسلام قبول نہیں کیا تھا، اسی لئے دونوں راہوں کو اختیار کرلیا یا پھر اپنی بے بصیرتی کی وجہ سے شک کی تنگنائے میں گرفتار ہیں۔ اور اپنی نجات کا کوئی راستہ سمجھ میں نہ آنے کی وجہ سے قیامت کی جواب دہی سے بچنے کے لئے دونوں مذہبوں کے پیشواؤں کی پیروی اختیار کر رکھی ہے۔ جیسے بعضے بھانڈ مسلمانوں سے روپئے اینٹھنے کے لالچ میں، تبدیلِ مذہب کر کے ہندو سے مسلمان ہو گئے ہیں، مگر شاید عمر بھر کبھی کلمۂ طیبہ ان کی زبان پر نہ آیا ہو گا۔ نماز و روزہ اور دوسری عبادتیں تو درکنار رہیں۔ اپنی برادری کے لوگوں کے سوا وہ کبھی مسلمانوں کے ساتھ کھانا بھی نہیں کھاتے اور ہندو پیشواؤں کے سوا کسی کو اپنا رہبر نہیں مانتے۔

بادخواں

بادخواں (بھانڈ) وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا نسب نامہ یاد رکھتے ہیں، ہر فرقے کے اپنے بادخوان ہوتے ہیں۔ اس لئے ہر بادخواں صرف اُسی فرقہ کا حسب نسب یاد رکھتا ہے جس سے وہ متعلق ہوتا ہے۔ دوسرے فرقے کے نسب کی اسے کچھ خبر نہیں ہوتی۔ اور کھتریوں میں یہ رسم ہے کہ لڑکے کی شادی کے موقع پر ایک دلاک، ایک بادخواں اور ایک مُطرِب (گویّا) یہ تین شخص داماد کے باپ کی طرف سے اور لڑکی کے والد

کی طرف سے جاتے ہیں اور اگر فریق ثانی نے اُن اشخاص کی بات مان لی تو پھر وہاں سے بھی اسی طرح یہ تین اشخاص داماد کو دیکھنے آتے ہیں، اور ان تینوں آدمیوں کی بیویاں بھی ساتھ ہوتی ہیں، جو ماں، بہن، پھوپھی، خالہ اور دولھا دلھن کی دوسری رشتہ دار عورتوں کو دیکھتی ہیں، شاید ان کے بزرگوں میں سے کسی نے اپنی خصوصیت کی وجہ سے یا کھتریوں سے تعلق کی بنا پر یا اپنے بنی اعمام میں سے کسی سے جھگڑا ہو جانے کے باعث حریف کا اپنے اوپر غلبہ دیکھ کر، یا انعام کی لالچ میں حاکم کے سامنے فریاد کی اور بظاہر اسلام سے مشرف ہو گیا تاکہ حریف پکڑا جائے اور خود دل جمعی کے ساتھ اپنی مراد حاصل کرلے۔ ہندوؤں کے عرفِ عام میں اس خصوصیات کو اصطلاحاً بہرت کہتے ہیں۔ اب ان معنوں میں بادخوان فارسی لفظ ہے لیکن ہندوستانی اُسے "باد فروش" کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ لفظ بھی بونصر بدخشانی کے کلام میں پایا جاتا ہے جو کبھی ہندوستان میں نہیں آیا تھا۔ لہذا ہندی الاصل نہیں ہو سکتا۔ حالاں کہ یہ ایرانیوں کی زبان نہیں ہے۔ اگرچہ شنویوں کا ذکر اس موقعہ پر نہیں آنا چاہیئے تھا جہاں ہندوؤں کے فرقوں اور ان کے عقائد کا بیان ہو رہا ہے چونکہ یہ فرقہ باطن میں کافر ہی مگر بظاہر مسلمان ہیں۔ لیکن ان کے کفر کی بنیادیں اتنی قوی ہیں کہ غافلوں کی تنبیہہ کے واسطے ان کا ذکر اسی ضمن میں کیا گیا۔ اس زمانے میں ہندوؤں کے اور بھی فرقے ایسے ہیں جو مسلمانوں کے رہن سہن اور خوراک اور پوشاک کو پسند کرتے ہیں اور ان کی گفتگو سے متاثر ہو کر یا اہلِ اسلام کی شان و شوکت دیکھ کر متحیر ہو جاتے ہیں اور جوق در جوق صوفیوں کی اطاعت میں آجاتے ہیں۔ اُن میں بہت سے لوگ شیعوں کی حکومت ہونے کے باعث تشیُّع کی طرف جھکتے ہیں لیکن اس سے کچھ فائدہ نہیں کیونکہ یہ لوگ مسلمانوں کے کھانے سے پرہیز کرتے ہیں۔ ہر روز غسل کرتے ہیں اور رسومِ کفر ابھی تک ادا کر رہے ہیں۔ جب مریں گے تو اپنے مورثوں کی طرح آگ ہی میں جلائے جائیں گے۔ بہرحال کچھ بھی ہو ظاہر میں تو غنیمت ہیں۔

سکھوں کا بیان

کھتری لوگ ایک فرقہ سے ہزار فرقوں میں تقسیم ہو گئے ہیں اور ہر فرقے کا الگ نام ہے۔ دوسری جماعت اِن میں شریک نہیں ہو سکتی۔ اسی فرقے میں پنجاب کے کچھ لوگ بیدی کہلاتے ہیں۔ اُن میں نانک چند یا نانک سنگھ نامی ایک کھتری زادے تھے۔ علم و ادب کے زیور سے آراستہ اُنھوں نے فارسی کتابوں سے بھی بخوبی استفادہ کیا تھا اور قدرے عربی بھی جانتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی اس قوم میں اس شخص کو خداداد شعور اور صلاحیت ملی تھی جس کی وجہ سے اُسے تمام کھتریوں کے لئے سرمایۂ نازش کہا.... جاسکتا ہے نانک نے جوانی میں ترکِ دنیا کر کے سیاحت اختیار کی اور عرب اور عجم کے شہروں کا پیدل سفر کیا اور بلا تعصب ہر مذہب و ملت کے صاحبِ ترک و تجرید درویشوں کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جو جو بات جہاں بھی اچھی ملی، اُسے حاصل کیا۔ اُس نے اسلام اور کفر کو عقل کی ترازو میں تول کر ایک نیا مذہب ایجاد کیا اور خود ترکِ دنیا کے بعد وہ نانک شاہ کے لقب سے مشہور ہوئے اس لئے اب اُن کے پیرووں کو نانک شاہی کہا جاتا ہے ان کے مرید دو قسم کے ہیں۔ بعضوں نے ظاہر اور باطن میں دنیا کو ترک کر دیا ہے اور نانک شاہی حلقہ میں داخل ہو گئے ہیں۔ اور بعضوں نے پیشے کی وجہ سے بظاہر دولت مندوں کی اطاعت ترک نہیں کی ہے مگر باطن میں فقر کی طرف مشغول رہتے ہیں۔ ان دونوں گروہوں میں جو خالصہ کے نام سے مشہور ہوئے ان کی ڈاڑھیاں اور سر کے بال لمبے ہوتے ہیں جو بظاہر ترکِ دنیا کئے ہوئے نہیں ہیں وہ نہ سر کے بال لمبے رکھتے ہیں نہ لمبی ڈاڑھیاں انہیں خالصہ کہا جاتا ہے۔ چونکہ نانک شاہ خود حلوہ بہت کھاتے تھے۔ اس وجہ سے ان کے مریدوں کو بھی حلوہ بہت مرغوب تھا۔ حلوے سے مراد گاجر، کدو، بادام وغیرہ کے مختلف حلوے مراد نہیں بلکہ یہی سادہ حلوہ مراد ہے جو آٹے اور شکر اور گھی سے بنایا جاتا ہے۔ نانک کی وفات کے بعد ان کی نیاز کے لئے بھی حلوہ ہی پکایا جاتا ہے۔ چنانچہ آج تک وہی رسم اُن کے مریدوں میں جاری ہے۔ بالفعل اسی حلوے کو کڑاہ کہتے ہیں۔ کڑاہ اصل میں

ایک بڑے کڑاؤ کے معنی میں آتا ہے جس میں بہت زیادہ حلوہ پکایا جاتا ہے۔ یہاں ظرف بول کر مظروف مراد لیا جاتا ہے اور مجازاً کڑاہ حلوے کو کہنے لگے۔ آج کل بھی سکھ جب کسی سے جنگ کرتے ہیں تو صلح ہونے پر اُس سے نانک شاہ کی نذر کے لئے نقد روپیہ طلب کرتے ہیں۔

نانک شاہ نے اپنے کلام میں اکابرِ اسلام کے فضائل بیان کئے ہیں اور وہ اس بات کے مُدعی ہیں کہ حضور سرور انبیاء کی پاک روح سے انھیں فیض پہونچا ہے۔ اُن کا کلام یا ملفوظات سبد کہلاتے ہیں۔ وہ ہندوستان کے بادشاہ ظہیر الدین محمد بابر کے ہم عصر تھے۔ اُن کے مرید عام طور سے سِکھ اور پنجاب میں سِنگھ کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ نانک شاہ کے سِوا جو اُن کے مرشد تھے اور جنھیں ہندی میں گرو کہتے ہیں۔ ہندو مذہب کے کسی پیشوا کو نہیں مانتے، بلکہ ان کو ہی اپنا خدا جانتے ہیں۔ اُن کے عقیدے کے مطابق اُن کے گرو کے ذکر کے سِوا کسی بھی عبادت میں انھیں ثواب نہیں ملتا جس قدر بھی گوشت اُن کے ہاتھ لگ جاتا ہے کھا جاتے ہیں۔ مگر گائے کا گوشت نہیں کھاتے۔ یہ لوگ سور کے گوشت سے بھی پرہیز نہیں کرتے مگر حقہ پینے والے کو اپنے لشکر سے نکال باہر کرتے ہیں بلکہ اُسے آزار پہونچاتے ہیں۔

ان کی فوج میں بھی عورتیں بہت کم ہیں بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان کی اوقات اِغلام پر ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ یہ سچ ہے یا جھوٹ۔ بہر حال دروغ بر گردنِ راوی۔ یہ لوگ غسل کرنے اور برہنہ تن کھانا کھانے کی قیود سے بے خبر ہیں بلکہ جن کھتریوں اور برہمنوں نے اس مذہب کو اپنایا ہے وہ توے پر پکی ہوئی روٹی ایک دوسرے کے ہاتھ سے کھا لیتے ہیں چاہے پکانے والا جاٹ یا کہار ہو۔ بلکہ سکھ کے سوا وہ لوگ کہار کے ہاتھ کی پکائی ہوئی روٹی اور چاول بھی کھا سکتے ہیں مگر شاید کچھ لوگ احتیاط کرتے ہیں لیکن یہ باتیں شہر میں ہو سکتی ہیں۔ فوج میں یہ سب ممنوع ہے۔ اگر کوئی مسلمان بھی سر کے بال چھوڑ کر اُن کی فوج میں داخل ہو جائے تو یہ اُسے نہیں روکتے لیکن اُس کے ساتھ کوئی چیز نہیں کھاتے بلکہ اگر اس کا ہاتھ روٹی سے چھو جائے تو اُسے کھانے سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ یہی سلوک بھنگیوں کے ساتھ کرتے ہیں جو

بول و براز اٹھاتا ہے۔ پنجابی کھتریوں میں سے ایک عزیز نے جو کہ خود نانک شاہ کا مرید ہے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے اُن کی فوج میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ایک شخص آٹا گوندھ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تمہارا تعلق کس قوم سے ہے تو اُس نے جواب دیا، میں قصور شہر کا افغان بچّہ ہوں تین سال ہوئے میں نے خود کو گروہ کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ بہر حال نہ یہ لوگ ہندو ہیں نہ مسلمان ہیں۔ خدا ہی جانتا ہے کہ کیا چیز ہیں۔ ان کا سلام علیک "واہ گرو" ہے۔ گرو کا مطلب مرشد ہے اور واہ فارسی میں "زہے" کے مانند کلمۂ تحسین ہے لیکن ہندوستان میں یہ لفظ اتنا مروّج ہو گیا ہے کہ اب ہندوستانی معلوم ہوتا ہے۔ سکھ علی الصبح جب چارپائی سے اٹھتے ہیں تو اسی لفظ سے زبان کھولتے ہیں اور حملہ کرتے وقت مخالف لشکر پر اکال اکال کہہ کر گھوڑوں کو ایڑ لگاتے ہیں اور دھاوا بولتے ہیں، ان کے ہتھیار۔ تیر، کمان، تلوار اور بندوق ہوتے ہیں۔ اکال شاید خدا کو کہتے ہیں۔ نانک کی زندگی میں اس فرقہ کے اعتقاد کی یہ حالت تھی کہ ایک دن شاہ نانک کے لڑکے نے جوان کے ترکِ دنیا سے پہلے پیدا ہوا تھا، کسی شہر میں ایک طوطی دیکھا۔ جو بڑی فصاحت سے بولتا تھا۔ اُسے وہ طوطی پسند آیا اور اُس کے مالک سے قیمت دریافت کی، طوطی کے مالک نے جواب تک نہ دیا۔ جو سکھ حاضر الوقت تھے انھوں نے مالک سے بہت منّت سماجت کی تو اس نے بگڑ کر کہا کہ یہ طوطی میری جان ہے اور اس کی قیمت جان ہی ہو سکتی ہے۔ یہ بات سنتے ہی چند سکھوں نے تلواریں کھینچ کر اس کی طرف بڑھا دیں اور اپنا سر جھکا دیا کہ ہمارا سر تن سے جدا کر دو۔ اور یہ طوطی صاحبزادہ کے لئے دے دو۔ یہ حالت دیکھکر صاحبِ طوطی نے بلاقیمت طوطی ان کے حوالے کر دیا۔

دوسری حکایت یہ ہے کہ ایک دن اُسی کم سن لڑکے نے تلوار کھینچ کر یہ چاہا کہ اُسکی دھار کو آزمائے۔ اس نے ایک سکھ کو اشارہ کیا کہ وہ سامنے آکر اپنی گردن اس کی تلوار کے نیچے کر دے۔ یہ دیکھ کر تمام سکھوں نے اپنی گردنیں جھکا دیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے قتل

کی آرزو کرنے لگا۔ ہر چند سب کی خواہش یہی تھی لیکن اپنی مراد کو ایک بھی نہ پہونچا۔ شاید اس لڑکے کا مقصد بس اتنا ہی تھا کہ اُن کی عقیدت کا امتحان لے۔

اور اس جماعت کی یہ رسم ہے کہ اگر اُن کی فوج میں کوئی شخص تیز بھالے، تلوار یا تفنگ سے اتنا زخمی ہو جاتا ہے کہ اس کا صحتیاب ہونا محال نظر آنے لگے تو کوچ کے وقت اس بیچارہ کو زندہ ہی آگ میں جلا دیتے ہیں۔ اور اگر کوئی مسلمان ان کے پھندے میں پھنس جاتا ہے تو اس سے روپے اینٹھنے کے لئے شلاق کرتے ہیں (یعنی مختلف ایذائیں پہونچاتے ہیں) یہاں تک کہ وہ غریب اپنی تنگ دستی اور مفلسی کی وجہ سے جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور پھر جو کچھ اس کے منہ میں آتا ہے، کہتا ہے حتیٰ کہ گالیاں دینے لگتا ہے۔ اور جب یہ نوبت پہونچتی ہے تو یہ لوگ (سکھ) کہتے ہیں کہ اچھا "یہ شہادت چاہتا ہے!" اور پھر اُس کو نہیں مارتے۔

اُن کی یہ بھی عادت ہے کہ جب کسی شخص سے زر طلب کرتے ہیں تو پہلے طرفِ ثانی کے مقدور سے بہت زیادہ مقدار میں مطالبہ کرتے ہیں۔ جب طرفِ ثانی اپنی مفلسی کا اظہار کرتا ہے تو رقم گھٹا کر آدھا کر دیتے ہیں۔ وہ پھر عذر کرتا رہتا ہے اور یہ گھٹاتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک لاکھ روپے سے نوبت ایک روپیہ تک پہونچ جاتی ہے۔

گورو گوبند سنگھ اور گورو بھگت بھگوان

خیر جب نانک شاہ نے دنیا سے کوچ کیا تو ایک مرید ان کا جانشین ہوا۔ اسی طرح اُس سے گورو گوبند سنگھ تک، جو دسویں اور آخری گرو ہیں، متعدد جانشین ہوتے رہے۔ اُن میں سے ایک بھگت بھگوان بھی ہے۔ یہ ایک تاجر کا لڑکا تھا اور نانک شاہ کے ہندو اور مسلمان مرید اُسے اپنے مرشد کی خصوصی توجہات کا مرکز سمجھتے ہیں۔

کہتے ہیں جب وہ خلیفہ ہوا تو ہندو لوگ یعنی کھتری، جاٹ، اہیر اور کہار اس کا جھوٹا کھانا کھا لیتے تھے اور بعض پنجابی برہمن بھی۔ لیکن نانک شاہ کے بعد گرو گوبند سنگھ خلیفہ ہوئے۔

وہ اپنے مریدوں پر بادشاہوں کی طرح حکمرانی کرتے تھے اور تسخیرِ ممالک کا خیال بھی سر میں رکھتے تھے۔ ان کا زمانہ شاہ عالم اوّل (پسر اورنگ زیب) کا عہدِ حکومت ہے۔ اس زمانے میں اُن کے مریدوں نے پنجاب کے شہروں میں پھیل کر بہت سے مقاموں سے بادشاہی ملازموں کو باہر نکال دیا تھا۔ ان کے فتنے کی وجہ سے لاہور کے صوبہ دار کی نیند حرام ہوگئی تھی۔

بندا بیراگی

آخر بیراگی فرقے کا ایک شخص جس کا نام بندا تھا، پنجاب سے آیا اور گورو گوبند سنگھ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے ایک زمانے تک فقیری کے لباس میں زندگی بسر کی تھی اور کہن سال بیراگیوں سے ریاضت و عبادت کے طریقے سیکھے تھے۔ اور گرو گوبند سنگھ صاحبِ جاہ و حشم تھے۔ بندا کی لچھے دار باتوں کے پھیر میں آکر گرو گوبند سنگھ نے اس سے یہ معاہدہ کیا کہ بیراگیوں سے بندا نے جو کچھ نعمتِ باطنی حاصل کی ہے وہ گرو گوبند سنگھ کو تعلیم کر دے اور یہ تختِ حکومت اُس کے سپرد کر کے تیرتھ استھان کی زیارت کے لئے سیاحت پر نکل جائیں۔ تمام سکھوں نے گرو کے ارشاد کے مطابق بندا کی اطاعت شروع کر دی جو کہ در اصل اُن کے گرو کی اطاعت کے مانند تھی۔ یہاں تک کہ بندا گداگری کی حالت سے نکل کر ایک ملک کا مالک بن بیٹھا یعنی ٹھٹھہ، بھکر، ملتان اور نواحِ لاہور کے علاقوں پر اُس نے تصرف حاصل کر لیا۔

گرو گوبند کی گرفتاری

اکبر آباد میں شاہی ملازموں نے گرو گوبند سنگھ کو گرفتار کر لیا اور شاہی حکم نافذ ہوا کہ اسے گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کر دیا جائے۔ راستے میں کسی افغانی نے ان کا کام تمام کر دیا۔

بندا بیراگی کی گرفتاری

بندا بیراگی نے فرخ سیر کے دورِ حکومت میں نواب عبدالصمد خاں دلیر جنگ تورانی سے جو خواجہ بادشاہ خاں کے نام سے تھے، جنگ کی تھی۔ اس میں وہ گرفتار ہوا۔ نواب موصوف نے اس کو لوہے کے پنجرے میں بند کر کے بادشاہ کی خدمت میں بھیج دیا۔

ستھرا شاہی فرقہ

ستھرا نامی ایک کھتری بچہ گرو گوبند سنگھ کا مرید اور رازدار تھا۔ ستھرا شاہوں کی جماعت جو ہندوستان کے شہروں میں گدائی کرتی ہے، اسی کے مرید ہیں۔ اس جماعت کے لوگ بہت زیادہ بے حیا، بے شرم، منھ پھٹ اور بیباک ہوتے ہیں۔ یہ اپنے چہرے پر کالک مل لیتے ہیں اور دو ڈنڈے ہاتھ میں لے کر بازار کی ہر دکان کے سامنے انھیں بجاتے ہیں اور ساتھ ساتھ کچھ عامیانہ الفاظ میں گاتے ہیں۔ یہ جو کچھ طلب کرتے ہیں اُسے وصول کئے بغیر نہیں ٹلتے۔ اب اس جماعت کے لوگوں کی تعداد بھی لاکھوں تک پہونچ گئی ہے۔ ستھرا کے بارے میں عجیب وغریب باتیں مشہور ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک دن وہ کسی ہندو کے گھر گیا اور رات وہیں بسر کی۔ صبح کو اس سے رخصت ہو کر اپنے گھر واپس ہوا۔ اتفاق سے اس ہندو کو اس دن کھانا اور پانی نصیب نہیں ہوا۔ دوسرے دن اس ہندو نے یہ واقعہ شاہزادہ معظم شاہ پسر اورنگ زیب عالمگیر کی خدمت میں لکھ بھیجا۔ شہزادے نے ستھرا کو امتحان کے لئے طلب کیا اور رات کو اپنی خوابگاہ کے قریب کسی جگہ اسے ٹھہرایا۔ صبح کو اپنی خدمت میں طلب کیا۔ وہ حکم کے مطابق حاضر ہوا۔ شہزادہ نے سب سے پہلے اس پر نظر ڈالی۔ اتفاق سے شہزادہ بھی تمام دن مکدر رہا۔ شاید کسی بات پر غصہ میں آکر کھانا بھی نہیں کھایا۔ شام کو ستھرا پھر پیش ہوا، تو شہزادے نے اُسے شکنجے میں کسنے کا حکم دیا۔ کہتے ہیں کہ صبح کو شاہزادہ کی خدمت میں حاضر ہونے کے وقت نیند کے غلبے کی وجہ سے ستھرا نے راستے میں آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ جب شہزادہ کے قریب پہونچا تو اس نے آنکھیں کھولیں اور سب سے پہلے شاہزادے کی شکل پر اسکی نگاہ پڑی تھی۔ غالباً ستھرا کے سونے کی جگہ شاہی خوابگاہ سے بالکل قریب ہی تھی جو اس نے آنکھ بند کر کے اتنا راستہ طے کیا تھا بہرحال جب شام کو شاہزادے نے ستھرا کے حاضر ہونے پر یہ حکم دیا کہ اسے ہاتھ پاؤں باندھ کر شکنجے میں جکڑ دیں، تو ستھرا نے متحیر ہو کر اس کا سبب پوچھا۔ شہزادے نے جواب دیا کہ اس سے بڑا گناہ اور کیا ہوگا کہ جب سے میں نے تیرا منحوس چہرہ دیکھا ہے، اس وقت تک مجھے آب ودانہ

نصیب نہیں ہوا ہے۔ ستھرا نے عرض کیا کہ میرا چہرہ بندگانِ حضور کے چہروں سے زیادہ منحوس تو نہیں ہے کیونکہ میں نے بھی آج سب چیزوں سے پہلے حضور کا مبارک چہرہ دیکھا تھا۔ میری صورت کا تو اتنا ہی اثر ہے کہ بندگانِ حضور اب کہیں کھانا نوش فرمائیں گے مگر صورتِ مبارک کا مجھ پر یہ اثر ہوا ہے کہ بے گناہ شکنجے میں جکڑا جا رہا ہوں، جو موت سے بھی بدتر ہے۔ اس پر شہزادے کو ہنسی آگئی اور اس نے ستھرا پر بہت مہربانی کی۔ اس کا یہ طریقہ تھا کہ اسے جہاں سے جو کچھ ملتا تھا، محتاجوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔

شاہجہاں آباد میں عبدالحلیم نامی درویش

بعض راویوں سے یہ بھی سنا گیا ہے کہ مشائخ صوفیہ میں سے ایک شخص شاہجہاں آباد میں وارد ہوئے انھیں حلم اور اخلاقِ پسندیدہ کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی۔ تو ستھرا ان سے ملاقات کرنے گیا۔ دیر تک اُن کی خدمت میں حاضر رہا۔ چلتے وقت اُس نے درویش کا نام پوچھا انھوں نے کہا میرا نام عبدالحلیم ہے۔ ستھرا نے ایک لمحہ تامل کے بعد پھر نام پوچھا تو درویش نے پھر وہی جواب دیا۔ ابھی ایک لمحہ بھی نہ گزرا تھا کہ ستھرا نے اپنے حافظہ کی کمزوری کا اظہار کیا اور معافی طلب کرتے ہوئے پھر نام دریافت کیا۔ اب درویش نے بددماغ ہو کر کہا کہ تمہارا عجیب حافظہ ہے دو بار بتا چکا ہوں، عبدالحلیم، عبدالحلیم، پھر بھی تمہیں یاد نہیں رہتا۔ اب میں وہ دماغ کہاں سے لاؤں کہ اپنے نام کی تجھے تعلیم دوں۔ ستھرا نے کہا اگر حضور کا نام ہلاکو شاہ ہو تو نہایت مناسب تھا۔ "شاہ عبدالحلیم" کو پھر ایسے اخلاق سے کیا واسطہ یہ سن کر حاضرین قہقہہ لگانے لگے۔

بیراگیان

بیراگیوں کا مذہب بالکل نیا ہے۔ ان کا لقب بشنو ہے۔ اور یہ دو شاخوں میں منقسم ہیں۔ ایک فرقہ رام کا پجاری ہے۔ دوسرا کنھیا کا۔ دونوں فرقوں کے لوگ جب آپس میں ملتے ہیں تو ایک دوسرے پر نازیبا اور بےتہذیب الزامات لگا کر اپنی برتری پر استدلال کرتے ہیں۔

اِس جگہ تین سطروں کا اصل ترجمہ نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

ملاحظہ ہو ہفت تماشائے مرزا قتیل۔ متن فارسی سطر ۱۲-۱۵

بہر حال اب اس فرقے کے لوگ جوق جوق ہندوستان کے شہروں اور خاص طور سے تیرتھ استھانوں پر بل جاتے ہیں۔ بتوں کی پرستش کرنا، گانا بجانا۔ دیوتاؤں کے سامنے رقص کرنا

(ملاحظہ ہو متن فارسی صفحہ ۵۱ سطر ۱۸ - ۱۹)

ان کا مشغلہ ہے۔ دیکھنے میں تو یہ سب لوگ لکڑی کے دانوں کی مالا گلے میں، ماتھے پر قشقہ، سینے پر صندل لگاتے ہیں اور عورت کو خواہ وہ بوڑھی ہو یا جوان، یا ان کی بیٹی ہو، ماتا کہہ کر پکارتے ہیں۔ اور لباس میں فقط ایک کمبل پر قناعت کرتے ہیں۔ کھانا بھی رسمی ہوتا ہے۔ مگر خلوت میں جو کچھ ہاتھ آجاتا ہے، کھا لیتے ہیں۔ اور خوبصورت امردوں اور عورتوں سے اختلاط کرتے ہیں۔

سنیاسیوں اور بیراگیوں کی آپسی دشمنی

سنیاسیوں اور ان کے فرقے والوں میں جانی دشمنی ہے۔ اگر کہیں دو تین ہزار بیراگی اور اتنے ہی سنیاسی جمع ہو جائیں تو ممکن ہی نہیں کہ کشت و خون نہ ہو۔ کنہیا کے گھاٹ پر جو ہردوار کے نام سے مشہور ہے۔ لاکھوں بیراگی اور سنیاسی جمع ہو جاتے ہیں۔ گذشتہ زمانہ میں اس میدان کی زمین ان دونوں کے خون سے رشکِ لالہ زار ہو جاتی تھی۔ مگر اب صاحبان عالی شان انگریز بہادر کے نظم و نسق کی وجہ سے یہ لوگ سر نہیں اٹھا سکتے۔ دونوں فرقے ایک دوسرے کو دیکھ کر خون کا گھونٹ سا پی جاتے ہیں مگر افسروں کی دار و گیر کے خوف سے کچھ نہیں..... کر سکتے یہ رعب خداداد ہے۔ ورنہ اتنی بڑی جماعت سے کسی قدیم عادت کا چھڑا دینا محالات میں سے تھا۔

سنیاسیان سنیاسی میں یائے نسبتی ہے، یعنی سنیاس کرنے والا۔ سنیاس کے معنی ہندی میں ترک و تجرید کے ہیں۔ یائے نسبتی اگرچہ عربی الفاظ پر آتی ہے لیکن اب ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کی وجہ سے ہندی میں بھی استعمال ہونے لگی ہے۔ اس لفظ سنیاسی کے سوا اور بھی ہندی الفاظ میں یائے نسبتی آتی ہے جیسے جوگی، بیراگی اور روگی۔ جو جوگ، بیراگ اور روگ سے منسوب ہیں لیکن یہ ترکیب شاہجہاں آباد کی زبان (اردو) اور کسی حد تک بھاکا (موجودہ ہندی) کے ساتھ مخصوص ہے۔ مگر ہندی قدیم یعنی سنسکرت میں یائے نسبتی کی گنجائش نہیں ہے۔ کیوں کہ زبان اردو مفرد نہیں بلکہ مرکب زبان ہے۔ (یعنی کئی بولیوں اور زبانوں کا آمیزہ ہے) اور بھاکا میں کویوں (یعنی شاعروں نے) عربی کے بعض حروف و کلمات میں کچھ تغیر و تبدّل کر کے اُنھیں ہندی بنالیا ہے جیسے ظالم کی جگہ جالم یا ضامن کے بدلے جامِن یا کھت (خط) یا سیسا (شیشہ) یا کجیا (قضیہ) کِسّا (قصہ) مگر یہ لفظ بغیر تشدید کے ہندی میں جھگڑے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

بہر حال سنیاسیوں کا فرقہ قدیم ہے اور عبادت و ریاضت میں یہ لوگ تارک الدنیا اور فقراء کی طرح ہیں۔ اہلِ شرع ہندوؤں کے آئین کی پابندی نہیں کرتے۔ اس جماعت کے بیشتر لوگ شریف النفس، تارک الدنیا، بے لوث اور خاک نشین پائے جاتے ہیں۔ اکثر بالکل ننگے رہتے ہیں۔ انھیں ستر کے کھلے رہنے سے بھی شرم نہیں آتی۔ ان کے بدن کا لباس صرف بھبھوت ہے جو یہ جسم پر ملتے ہیں اور بچھونا بھی خاک ہی کا ہوتا ہے۔ بعض لوگ خاک سے بھی تعلق نہیں رکھتے، اسے بھی ترک کر دیتے ہیں۔

ناگے لیکن یہ لوگ فسق و فجور کے پاس بھی نہیں پھٹکتے۔ ہندی میں انھیں ناگے کہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ سپاہی پیشہ بھی ہوتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کے یہاں نوکری کرنے سے پرہیز نہیں کرتے۔ جو کوئی ان کو روپیہ دے اُسی کے مطیع و فرماں بردار ہو جاتے ہیں۔ اور جنگ کے موقع پر بڑی بہادری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ لیکن ان میں بہت سے بدذات

چور، ڈاکو، قزاق، سود خور، زانی، شراب نوش اور بد زبان ہوتے ہیں، سور کا گوشت بڑی رغبت سے کھاتے ہیں، بعض لوگ، جو کسی کے ہاں ملازم نہیں ہیں، ان کا شغل چوری اور ڈکیتی ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ چند ہزار نانگے جمع ہو کر کسی نئے ملک میں جا پہنچتے ہیں اور جس شہر میں بھی جاتے ہیں وہاں کے حاکم کو کمزور پا کر اس سے مہمانی طلب کرتے ہیں اور متمول ہندوؤں مثلاً مہاجن وغیرہ کو گرفتار کر کے خاطر خواہ اس سے دولت حاصل کرتے ہیں۔ اگر طرفِ ثانی نے پہلے ہی سوال میں ان کی خواہش کے مطابق یا اس سے کم ان کو روپیہ دے، یا تو اس سے اپنا ہاتھ اٹھا لیتے ہیں۔ اور دوسرے کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں ورنہ اسکے ہاتھ پاؤں باندھ کر اتنے بید مارتے ہیں کہ اس پر موت کو بھی ترس آنے لگتا ہے۔

مداری فقیر

ان کی حرکات و سکنات مداری فقیروں کے مانند ہیں۔ لیکن مداری اپنا ستر ڈھکتے ہیں اور یہ لوگ نہیں ڈھکتے۔ بعض سنیاسی دکن کے شہروں میں امیرانہ شان و شوکت کے ساتھ رہتے ہیں۔ یہ لوگ روپیہ جمع کر کے اُسے تجارت میں لگا دیتے ہیں اور سود پہ چلاتے ہیں اور بیٹھے بیٹھے لاکھوں کما لیتے ہیں۔ انھیں اگر ایک ہزار روپیہ دستیاب ہوتا ہے تو اس میں سے سو روپیہ خرچ کرتے ہیں باقی سب جمع کی مد میں جاتا ہے۔ نانگاؤں کی طرح یہ لوگ بھی بد باطن اور فتنہ پرور ہوتے ہیں۔ نیک آدمی اس گروہ میں عنقا ہے لیکن نانگاؤں کے برعکس یہ لوگ ستر ڈھانپتے ہیں۔ ان میں بعض لوگ گیرو سے رنگی ہوئی زردی مائل سُرخ چادر کے سوا کچھ نہیں پہنتے۔ چاہے ان کے اصطبل میں ہزارہا گراں قیمت گھوڑے اور فیل خانے میں سینکڑوں فیل فروخت ہونے کے لئے موجود ہوں۔ اور بعض گیروے رنگ کی ایک پگڑی سر پہ رکھتے ہیں یا اسی رنگ کی ایک چادر کندھے پر ڈال لیتے ہیں۔ باقی لباس بیش قیمت اور اعلیٰ درجے کا پہنتے ہیں۔ یہ لوگ بری طاحت عورتوں اور خوبصورت بچوں سے اختلاط کر کے دنیا اور آخرت میں اپنا منہ کالا کرتے ہیں۔ یہ بچے بظاہر اُن کے چیلے یا بالکے کہلاتے ہیں۔ مرید عورت کو چیلی یا بالکی کہتے ہیں۔

سنیاسی فرقے کے لوگ مہادیو کے ماننے والے ہیں اور کسی دیوتا کو اس کے برابر نہیں جانتے۔ ان میں جو لوگ دنیا دار ہیں وہ سر اور ڈاڑھی کے بال تراشتے ہیں۔ اس مذہب میں ریاضتِ شاقہ بہت زیادہ ہے۔ بعض لوگ ہاتھوں کو اتنی مدت تک اوپر اٹھائے رکھتے ہیں کہ وہ خشک ہو جائے۔ بعض اپنے پیروں کو گردن کی طوق بنا لیتے ہیں اور اسی حالت میں وہ سوکھ جاتے ہیں۔ اور بعض لوگ ایک پیر کو خشک کر کے دوسرے پیر سے کام لیتے ہیں چونکہ ہندوؤں کے عقائد میں تناسخ تماسخ، تراسخ اور تفاسخ چاروں الگ الگ داخل ہیں۔ یعنی آدمی کی روح کا دوسرے آدمی کی بدن میں منتقل ہونا۔ انسان کا حیوان ہونا۔ یا درخت کی شکل میں نمودار ہونا یا پتھر بن جانا۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ خدا عادل ہے، ظالم نہیں ہے، اور عادل کے معنی یہ ہیں کہ وہ گناہگاروں کو بُرے عمل کی سزا اور نیکوں کو اچھے عمل کی جزا دیتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بچّہ کسی بادشاہ کے حرم میں ایک ملکہ کے بطن سے پیدا ہوتا ہے، دوسرا ایک خاکروب عورت کے بطن سے وجود میں آتا ہے اور ایک شخص دنیا میں پیدائش کے دن سے اپنی تمام عمر عیش وعشرت میں گذارتا ہے اور دوسرا شخص ساری عمر بیمار اور محتاج رہتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر خدا موجود نہیں ہے تو یہ جو کچھ پیش آتا ہے، اس کا تعلق تقدیر اور محض اتفاق سے ہوا، لیکن اگر کوئی پیدا کرنے والا اور پالنہار موجود ہے تو پھر شاہزادہ، شاہزادہ کیوں ہوا، اور خاکروب کا بچّہ خاکروب ہی کیوں رہا۔ اگر شاہزادہ کی عزّت اور خاکروب کی ذلت کا کوئی سبب نہیں ہے تو فاعل حقیقی کا فعل لغو معلوم ہوتا ہے (نعوذ باللہ من ذالک)

اور اگر ان بچّوں کو اپنے ہی اعمال کی سزا یا جزا ملی ہے تو لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اس سے پہلے بھی اس دنیا میں ان کا وجود رہا ہوگا۔ اسی سے یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ ایک بادشاہ کے گھر اور دوسرا بھنگی کے گھر کیوں پیدا ہو۔ اسی سے مسخ، رسخ اور فسخ کا مسئلہ ثابت ہوتا ہے ورنہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ درخت آخر درخت کیوں ہے اور پتھر، پتھر کیوں ہوا اور حیوان، حیوان

کیسے بن گیا۔ دانشمند لوگ ان ریاضتوں پر ان لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں کہ یہ بدبخت جو ایک پیر پر کھڑے کھڑے دوسرے کو سکھا دیتے ہیں، یقیناً اس زمانے سے پہلے کسی دوسری جون میں پیدا ہوئے ہونگے، اور انھوں نے اللہ کے بندوں کو اپنے سامنے بیٹھنے کی اجازت نہ دی ہوگی، جبھی تو اس جنم میں سزا پا رہے ہیں۔ اسی طرح ان لوگوں کے بارے میں جنھوں نے اپنے ہاتھ سکھائے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کسی زمانے میں انھوں نے کسی مسکین کا ہاتھ توڑا ہوگا، اور یہی لوگ یعنی ہندو مذہب کے عقلاء روایت بیان کرتے ہیں کہ سیتا کے فراق میں رام اپنے بھائی لچھمن اور چند دوسرے رفیقوں کیساتھ ایک جنگل میں پہونچے اور لچھمن کو خوردرو گھاس (سبزی) توڑ کر لانے کے لئے بھیجا تاکہ وہ اپنے اور ساتھیوں کے لئے کچھ کھانا بنا سکیں۔ لچھمن نے بہتیری کوشش کی اور چاروں طرف دوڑ دھوپ کی مگر کسی اگنے والی شے کا نشان نہ ملا۔ آخر مایوس ہو کر واپس آئے اور حقیقت حال سے اپنے بھائی کو مطلع کیا۔ رام نے سر ہلایا اور کہا کہ تمام جنگل سبزہ سے بھرا پڑا ہے لیکن آج کے دن ہماری قسمت میں کچھ نہیں ہے۔ کیونکہ پچھلے جنم میں آج کے دن میں نے کسی برہمن کو کھانا نہیں کھلایا تھا۔

سنیاسیوں کے دس گروہ ہیں اور ہر ایک گروہ کے الگ الگ نام ہیں۔ اس فرقے والے جنیو کا استعمال نہیں کرتے۔ برہمنوں میں بھی جو لوگ سنیاسی ہو گئے ہیں وہ گردن میں زنار نہیں ڈالتے۔ یہی حال کھتری سنیاسیوں کا ہے۔

کبیر پنتھی

کبیر ایک مسلمان جولاہے کا نام تھا جو مگہر کا رہنے والا تھا۔ یہ لکھنؤ سے چھ سات منزل کے فاصلہ پر ایک قصبہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ راما نند نامی ایک فقیر نے، جو ابتدا میں کئی برس تک سنیاسی رہا تھا اور اس زمانے میں اس نے بہت عبادت و ریاضت کی تھی۔ آخر میں وہ بیراگی ہو گیا۔ اور اس حالت میں بھی اس نے مرتبۂ کمال تک ترقی کی۔ وہ ایک دن راستے سے گذر رہا تھا۔ کبیر اس کے حالات دیکھ کر

بے قابو ہو گیا اور اس کی خدمت میں رہنے کا مشتاق ہو کر استفادہ کی امید میں اس کے پاس آنا جانا شروع کر دیا۔ رامانند نے اس سبب سے کہ کبیر مسلمان ہے اس سے اعراض کرنا شروع کیا اور اس کی تربیت کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ وہ عاشقِ صادق ہے اور کوئے محبت کی خاک کے سوا بدن پر کوئی لباس بھی نہیں رکھتا تو اس کے حال پر مہربان ہو گیا اور ذکر و شغل کی تعلیم سے اُس کے باطن کو، جو ناآگہی کے باعث تاریک تھا، اپنے اعتقاد کے بموجب نورِ عرفاں سے منور کر دیا یعنی اس شخص کو جس پر اسلام کی محض تہمت تھی، "رشکِ ہندواں" بنا دیا۔ وہ اللہ کا بندہ رات دن رام اور کنہیا کی یاد میں محو رہتا تھا۔ آخر میں اس کا جنون ترقی کی طرف مائل ہوا اور اس راستے پر جس سے رامانند آیا جایا کرتے تھے، وہ (کبیر) رات دن زمین پر پڑا رہ کر زندگی بسر کرنے لگا۔ اور کنہیا اور رام کی مدح میں کبت اور دوہے کہہ کر اونچی آواز سے گایا کرتا تھا۔ ہندوؤں کے گمان کے مطابق رفتہ رفتہ مقربِ درگاہِ الٰہی میں سے ہو گیا ایک دن رامانند نے اس کو اپنے سینے سے لگا کر بھینچا اور وہ نعمت جو کہ اس سے پوشیدہ رکھی تھی، اسے بخش دی۔ لہٰذا تمام ہندوؤں نے مایوس ہو کر اس کو ذخیرۂ سعادت سمجھا اور اس سے فیضیاب ہوئے۔ ان ہی لوگوں کے قول کے مطابق کنہیا بے تکلف کبیر کے گھر آتا جاتا تھا۔ اور اس کا جھوٹا (کھانا پانی) ہندو لوگ کھا لیتے تھے۔ مگر نہیں کھاتے تھے تو برہمن لوگ۔ کہتے ہیں ایک دن کچھ برہمن کبیر سے ملاقات کرنے کے لئے اس کے مکان پر گئے۔ کبیر نے اُن کے لئے کھانا پکایا۔ جب اس نے کھانا کھانے کو کہا تو انھوں نے کہا کہ اگر کنہیا خود آ کر اجازت دے تو ہم یہ کھانا کھا سکتے ہیں۔ کبیر نے اس کی صورت کا تصور کیا اور کنہیا اس کی مجلس میں ظاہر ہو گیا اور کبیر کا دل رکھنے کے لئے برہمنوں کو کھانا کھانے کی اجازت دے دی۔ ان لوگوں نے کہا کہ ہم نے کبیر سے یہ بات تمہارے جمالِ جہاں آرا کے مشاہدہ کرنے کے لئے کہی تھی۔ ورنہ ہم برہمنوں کو کبیر کا جھوٹا کھانے سے کیا تعلق۔ اور تم ایسا حکم

دینے پر مجبور ہو۔ کیونکہ جو شخص خلوص نیت سے تمہاری محبّت کا دم بھرتا ہے تم اس پر فریفتہ ہو جاتے ہو۔ اور ہر کام میں اس کی خاطر داری ملحوظ رکھتے ہو۔ تم نے خود کتاب میں ایسے طعام سے منع کیا ہے اور اب خود تم اُس کے کھانے کا حکم دے رہے ہو۔ پس ثابت ہوا کہ تم اس کھانے کو برہمنوں کے لائق نہیں سمجھتے۔ لیکن کبیر کی بھگتی سے شرمندہ ہو کر ہم لوگوں کو اس کے کھانے کا حکم دیتے ہو۔ یہ بات سُن کر کنہیا جی خاموش ہو گئے اور برہمن بغیر کھانا کھائے واپس چلے گئے۔

یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک دن کسی جانب سے ایک سپاہی مگہر میں آیا ایک بقال کی دوکان کے ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اتفاقاً کبیر کی بیوی آٹا یا روغن خریدنے کے لئے اس بقال کی دوکان پر آئی۔ سپاہی اس عورت کو دیکھکر دل دے بیٹھا۔ اور ہزاروں جان سے اس کا خریدار ہو گیا۔ یہ عورت بھی باشعور تھی۔ اس کی حالت کو سمجھ گئی۔ وہ اپنے گھر واپس تو آ گئی لیکن سپاہی کی محبت اس کے دل میں جم گئی۔ اب وہ ہر روز اس کا حال دریافت کرنے کے لئے اور اس کے دیدار سے اپنی تسلی کرنے کے لئے کسی نہ کسی بہانے سے وہاں جاتی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد ایک ہمدرد عورت کے توسط سے ان دونوں کے درمیان مستحکم عہد و پیمان ہوئے کہ چونکہ کبیر کی یہ عادت ہے کہ وہ ہر ماہ کے بعد دو تین دن کے لئے ایک بت خانہ کی زیارت کو جاتا ہے۔ اس وقت نئے مہینہ کے شروع ہونے میں دو روز باقی ہیں۔ یقین ہے کہ جب مہینہ ختم ہو گا تو وہ عبادت کے لئے یہاں سے جائے گا اور اس کے جانے کے بعد ہم دونوں کی ملاقات میں کوئی مانع نہ ہو گا۔ عاشقِ شیدا اس جاں بخش خوشخبری کو سن کر دن گننے لگا۔ جب مہینہ ختم ہوا اور اس محبوبہ کا شوہر اپنی عادت کے مطابق بت کدہ کے لئے روانہ ہوا تو معشوق کی طرف سے اس کے بُلانے کے لئے کسی آدمی کے آنے کا وہ انتظار کرنے لگا اور اس نے خود بھی اس خیال سے کہ شاید معشوقہ اُسے اپنے گھر بلانا مناسب نہ سمجھ کر خود اس کے

پاس آنے کا ارادہ کرے، ایک خلوت کدہ مہیّا کر لیا تھا۔ اتفاق سے اُس دن شدید بارش ہونے لگی اور بڑے زور کا سیلاب آیا۔ دریا عبور کرنا اپنی طاقت سے باہر دیکھ کر کبیر اپنے گھر واپس لوٹ آیا۔ اُس نے دیکھا کہ اس کی بیوی بھڑکیلا لباس پہنے بیٹھی ہے۔ اُسے تعجب ہوا اور اس نے اس آرائش کا سبب دریافت کیا۔ بیوی نے اس سپاہی کے عشق اور اپنے ارادے کو اس پر ظاہر کر دیا۔ یہ قصّہ سن کر کبیر نے اپنی بیوی کو اس سپاہی کے پاس جانے کی کھلے دل سے اجازت دے دی یہاں تک کہ وہ شوہر کی اجازت کے مطابق اُس عاشق کے پاس گئی اور شوہر کے واپس لوٹ آنے اور اُس سے ملاقات کی اجازت پانے کا تمام قصہ اس سے بیان کیا۔ یہ بات سنتے ہی سپاہی کے حواس گم ہو گئے اور اُس کے بدن پر کپکپی طاری ہو گئی۔ آخر میں اُس نے کہا کہ تم میری ماں ہو اور تمہارا شوہر کبیر، میرا باپ ہے۔ اب اس کے علاوہ میرا تم سے کوئی معاملہ نہیں رہا۔ اور قیامت تک اسی عقیدہ پر اٹل رہوں گا۔ عورت نے ہر چند معشوقانہ انداز سے اس سے چھیڑ چھاڑ کی، سپاہی نے اس کی طرف کوئی التفات نہ کیا اور گفتگو ختم کرنے کے بعد اس کو کبیر کی خدمت میں پہونچا دیا۔

بیدانتی ہندوؤں کی ایک جماعت ہے کہ اس کو بیدانتی کہتے ہیں کیونکہ بیدانت کے معنی تصوف کے ہیں۔ لغت کے لحاظ سے نہیں بلکہ اصطلاح کے اعتبار سے۔ کیونکہ تصوّف کے لغوی معنی اون پہننے کے ہیں۔ عرب میں ایک جماعت تھی وہ لوگ صوف پہنتے تھے اور ان میں سے ہر ایک شخص اپنے آپ کو خدا کا مقرّب سمجھتا تھا۔ ان کے اوقات یہ تھے کہ ذکر و شغل کو عبادتِ شرعیہ سے زیادہ سمجھتے تھے۔ اور روزہ و نماز کے اتنے فریفتہ نہ تھے۔ تحفۂ اثنا عشریہ کے مصنف مولوی عبدالعزیز کے والد شاہ ولی اللہ محدثؒ اپنی تصنیف موسومہ بہ نور العین فی تفضیل الشیخین میں لکھتے ہیں کہ علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ نے اس جماعت کو قتل کر دیا تھا۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ وہ لوگ

باطل کے پیرو تھے۔ کیونکہ علیؓ کا انھیں قتل کرنا اس جماعت کے عقائد کے باطل ہونے کی قوی دلیل ہے۔ اصل خواہ کچھ ہی ہو لیکن اس کا مفہوم یہی ہے جو میں نے لکھا ہے۔

بہر حال ان کا عقیدہ یہی تھا کہ اس زمانے میں دو جہان کی سعادت حاصل کرنے کا ذریعہ صوفیوں کی پیروی ہے۔ وہ لوگ اچھی آواز پر ہاھو کرتے تھے اور بیتاب ہو کر رقص کرتے تھے۔ اس حکایت کو یہیں چھوڑتا ہوں اور اصل مطلب کی طرف آتا ہوں۔

صوفیوں اور بیدانیوں کے اعمال اور افعال میں یکسانیت۔

ہر چند بیدانتی لوگ ہندوؤں کے مذہب میں اس کی شریعت کے راستے سے ہٹ کر چلتے ہیں لیکن تمام ہندو اس فرقے کو اپنا مرشد کامل اور رہنما سمجھتے ہیں، اس کے باوجود کہ ان میں سے ہر ایک فرد اپنے آپ کو عین خدا سمجھتا ہے جیساکہ شیخ محی الدین ابن عربی نے فصوص میں لکھا ہے۔ بیدانتیوں کے اقوال کا ترجمہ کسی نسخہ میں نہیں ہے لیکن صوفیوں کے اعمال وہی ہیں جو بیدانتیوں کے اعمال ہیں۔ بس اتنا فرق ہے کہ انھوں نے اصطلاحات کے نام بدل دیئے ہیں اور رقص و وجد کو جو چشتیہ سلسلہ میں بہت رائج ہے، انھوں نے بیراگیوں سے سیکھا ہے۔ کیونکہ وہ لوگ بھی اکثر بتوں کے سامنے رقص کرتے ہیں۔ دوسری لطف کی بات یہ ہے کہ بیاس کے لڑکے سکھدیو کے قصے اور ساتویں اوتار رام کی بیوی سیتا کے والد کی نقل بعض صوفیوں سے منسوب کرتے ہیں اس کی تفصیل یہ ہے کہ بیاس ہندوؤں کے مذہب میں بڑا عالم و فاضل ایک شخص تھا جس نے بہت عبادت و ریاضت کی تھی اور درگاہِ کبریا کے مقربوں میں سے ہو گیا اور اس کو حی ابدی (امر) بھی کہتے ہیں اور اس کا ایک لڑکا تھا وہ بھی اپنے باپ کی طرح علومِ عقلیہ میں ماہر تھا اور ابتدائے شعور سے تحقیق کا ذوق رکھتا تھا اس کا نام سکھدیو تھا وہ ہمیشہ اپنے باپ سے یہ سوال کیا کرتا تھا کہ خدا اور

مخلوق کے درمیان کیا نسبت ہے۔ بیاس اس سوال کو سن کر خاموش ہو جایا کرتا تھا، جب بیٹے کا اصرار حد سے زیادہ بڑھا تو اس نے راجہ جنک کے پاس بھیجدیا جس نے فقر اور توکل کی منزلیں طے کی تھیں اور جو ظاہر میں شاہانہ شان و شوکت رکھتا تھا مگر فقیری کی منزلیں طے کر چکا تھا چوں کہ وہ شرابِ وحدت کا دُرد آشنا تھا اور شاید بیاس کا یہ گمان تھا کہ اس کے بیٹے کو مطمئن کرنا اس کے علاوہ کسی کا کام نہ تھا۔ بہر حال جب سکھدیو راجہ کے گھر پہنچا اور دربان نے اسے خبر کی کہ سکھدیو نامی شخص درِ دولت پر حاضر ہے راجہ نے اس عمارت میں جو دروازہ سے اس کی مسندگاہ تک بنی ہوئی تھی۔ پری پیکر عورتوں کو فاخرہ لباس اور بیش بہا زیورات سے آراستہ پیراستہ کر کے بٹھادیا اور حکم دیا کہ آج کے دن درِ دولت پہ آیا ہوا فقیر جب عمارت میں داخل ہو تو ان میں سے ہر ایک حور پیکر اُس کے استقبال کو دوڑے اور معشوقانہ انداز سے اُس سے اختلاط کرے۔ اسی طرح دوسرے مقام پر گراں بہا جواہرات اور نفیس کپڑے کی کشتیاں اور دیناروں کے صندوق رکھ کر محافظوں سے کہا کہ جب وہ فقیر ان کے قریب پہونچے تو یہ سب کچھ اس کے آگے ڈال دیں۔ یہ ملازمین حکم کے مطابق جب دونوں عمارتوں میں چلے گئے تو راجہ نے سکھدیو کو اپنی خدمت میں طلب کیا۔ جیسے ہی وہ شاہانہ دولت سرا میں داخل ہوا، ویسے ہی حسین عورتوں نے اس عمارت سے نکل کر اس کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور اس کے ساتھ دلبرانہ اور معشوقانہ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ جوش و اختلاط تو درکنار، سکھدیو نے ان کو نظر پھیر کر بھی نہ دیکھا۔ جب انھوں نے اس کو ملتفت ہوتے نہ دیکھا تو اپنے مقام پر واپس لوٹ آئیں۔ اسی طرح وہ جواہرات اور اسباب اور نقدی روپیہ کی لالچ کا شکار نہ ہوا۔ اس نے سوچا بھی نہیں کہ یہ کس کے لئے اور کیوں ہے۔ ان واقعات کو سُن کر راجہ جنک کو معلوم ہو گیا کہ سکھدیو کاملوں میں سے ہے۔ جب راجہ کی نظر سکھدیو پر پڑی تو اس نے یہی کہا کہ اے سکھدیو تم خدا رسیدہ لوگوں میں سے ہو۔

اور خدائی بھیدوں میں سے کوئی بھید تم سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ تیرا باطن ایک ایسا آئینہ ہے کہ اس میں علومِ غیبیہ کی صورتیں منقش ہوتی ہیں۔ تجھے کسی معلم یا مرشد کی ضرورت نہیں ہے۔ کون سا عقدہ باقی ہے جسے تونے اپنے ناخنِ تحقیق سے حل نہیں کیا۔ سکھدیو یہ باتیں سُن کر راجہ سے رخصت ہو گیا۔ راقم الحروف نے یہ قصہ خود اپنی آنکھوں سے کتاب میں دیکھا ہے۔ جو چشتیوں کے پیشوا اور مقتدا ابراہیم ادہم صوفی سے منسوب ہے۔

ایک دن میرے کرم فرما سبحان علی خاں کنبوہ بھی جو ایک عالم فاضل اور محسودِ اقران شخص ہیں، کہتے تھے کہ ایک دن میں اور میرے بھائی تاج الدین حسین خاں، میر غلام علی خاں کے مکان پر بیٹھے تھے تو خاں صاحب ممدوح نے صوفیہ کے فضائل کا ذکر کرتے ہوئے یہ حکایت بیان کی کہ فلاں بزرگ نے فلاں عارف کے لئے کھانا بھیجا تھا۔ کھانا مقدار میں یقیناً اتنا تھا کہ اس سے دو سو بھوکوں کا پیٹ بھر سکے۔ جب کھانا لے جانے والے اس نہر کے کنارے پر پہونچے، جو مہمان عارف کی قیامگاہ اور میزبان صوفی کی خانقاہ کے درمیان حائل تھی تو انھوں نے دیکھا کہ اس کا پانی آدمی کے سر سے بھی چند گز اونچا بہہ رہا ہے اور اس وقت کشتی میسر نہیں تھی۔ وہ فکر میں پڑ گئے اور انھوں نے ایک شخص کو میزبان صوفی کی خدمت میں بھیجا کہ اب جیسا وہ کہیں ویسا ہی کیا جائے صوفی نے سن کر فرمایا کہ نہر کو میری عفت اور عصمت کی قسم دینا کہ اگر فلاں شخص نے اپنی تمام عمر میں کسی عورت سے تعلق نہ رکھا ہو تو تجھے چاہیئے کہ اس کی پاک دامنی کا لحاظ کرکے اپنے تئیں سمیٹ لے تاکہ ہم مہمان کو کھانا پہنچا سکیں۔ یہ بات سن کر وہ آدمی واپس آگیا اور کھانا لے جانے والوں نے نہر کے کنارے پہونچ کر وہی بات دہرائی۔ فوراً نہر خشک ہو گئی اور بڑی آسانی سے عارف کے پاس کھانا پہونچ گیا۔ اسی خیال سے کہ شاید اس کھانا بھیجنے والے صوفی نے اس خیال سے کہ ظاہر میں لوگ اس سے الگ تھلگ رہیں حسین و جمیل عورتوں سے زیادہ گرم جوشی شروع کر رکھی تھی۔ بہر حال جب وہ عارف کی خدمت میں کھانا لائے تو اس نے سارا کھانا خود کھا لیا اور ہاتھ دھو کر

ﺑﺰ ٥ — ہفت تماشائے مرزا قتیل۔

بیٹھ گیا۔ پانی خشک ہو جانے والے واقعہ سے بھی زیادہ کھانا لانے والوں کو اس بات سے حیرت ہوئی کیونکہ پہلے صوفی کے بارے میں وہ یہ گمان رکھتے تھے کہ وہ عورتوں سے بہت اختلاط کرتا ہے جب اُس سے رخصت لے کر نہر کے کنارے پہونچے تو پانی کو پہلے کی طرح بلند پایا۔ اب ایک آدمی کو اس عارف کے پاس بھیجا۔ اُس مرد خدا شناس نے کہا کہ میری طرف سے جا کر اس نہر سے کہنا کہ فلاں کہتا ہے اگر عمر بھر میں نے کبھی اپنا ہاتھ کھانے سے آلودہ نہ کیا ہو تو اس بات کی گواہ ہو۔ پہلے کی طرح اس جماعت کو جانے کا راستہ دے دے اس شخص متوسط نے یہ پیغام اپنے ساتھیوں سے بیان کیا تو انھیں اور بھی زیادہ حیرت ہوئی اور انھوں نے عارف کا پیغام نہر کو پہونچایا یہاں تک کہ وہ خشک ہو گئی، اور وہ لوگ بڑے اطمینان سے نہر کو عبور کر کے میزبان کی خدمت میں واپس آ گئے۔ جب میر غلام علی خاں یہ حکایت بیان کر چکے تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں نے کہا کہ اس قصہ کو میں نے کنھیا جی کے نام سے سنا تھا۔ آج معلوم ہوا کہ یہ حضرات صوفیہ کی کرامات میں سے ہے۔ یہاں تک سبحان علی خاں کی گفتگو تھی۔ ایک دن انہیں بزرگوں کے ذکر کے ضمن میں میں نے ایک عزیز سے یہ حکایت بیان کی۔ میری غرض مذہب صوفیہ سے نہ تھی بلکہ ان عزیزوں کو دروغ گو لوگوں کے احوال سے متنبہ کرنا تھا، کہ دیکھئے کس کی حکایت کس کے سر منڈھ دی ہے۔ اس بات کا احتمال ہے کہ مخدومی میر غلام علی خاں صاحب نے اس مجلس کے منعقد ہونے سے پہلے کنھیا سے متعلق حکایت نہ سنی ہو۔ تو وہ اپنی باطنی پاکیزگی اور صوفیہ پر راسخ عقیدہ سے مجبور ہو کر بات بنانے والی کی بات کو قرین قیاس بیان کرتے ہیں۔ ورنہ وہ تو اس زمین سے بھی جس پر جھوٹے کا سایہ پڑتا ہو، ہزاروں کوس دور بھاگتے ہیں، بلکہ صدق مقال کی اپنی کج رفتاریوں سے ان پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ وہ ممدوح اپنی صدق گوئی کا ذکر خیر سُن کر اس سے کہیں زیادہ خوش ہوتے ہیں کہ ان کے لئے ایک لاکھ روپیہ سالانہ کا

وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔

اتفاق سے اس محفل میں شاہ بوعلی صاحب کا ارادت مند ایک ہندو بیٹھا ہوا تھا۔ وہ میری طرف دیکھکر مسکرایا۔ پھر کہنے لگا آج میں آپ سے سخت بدگمان ہوگیا۔ میں نے کہا خیر تو ہے۔ تو بولا کہ ان صوفی جی میں اور کنہیا جی میں آپ کے نزدیک کیا فرق ثابت ہوا جو فلاں شخص کو کاذب اور مفتری قرار دیتے ہیں۔ بلکہ یہ معلوم ہوا کہ آپ کنہیا جی کے علاوہ خود کو بھی عارف سمجھتے ہیں، وائے اس شاعری اور انشا پردازی، فقر و توکل اور مذہبِ حق کی تحقیق پر، یہ دونوں حکایتیں تو جملہ معترضہ کے طور پر تھیں۔ اب میں پھر اپنے اصلی مقصد کی طرف آتا ہوں۔

ہندو اور فرقۂ صوفیہ

ہندو لوگ صوفیہ کے فرقے کو ہندوؤں کے تمام فرقوں سے زیادہ مکرم سمجھتے ہیں اور ان لوگوں میں صوفی وہی ہے جس نے جسمانی لذتوں کو ترک کر دیا ہو۔ یہ لوگ برہما، بشن اور مہادیو کو کسی طرح سے بھی نہیں مانتے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان تینوں کا مسکن نفسِ انسانی ہی ہے۔ جسے عوام دل سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس لئے کہ جب آدمی کسی شہر کا یا کسی اور چیز کا دل میں تصور کرتا ہے اور اس کا خیال محکم ہے تو یقیناً وہ شہر یا جو وہ چیز جس کا اس نے تصور کیا تھا، موجود ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں گویا تصور کرنے والے شخص میں برہما کی خاصیت پیدا ہو جاتی ہے، تو اگر ہم اس کو برہما کے لقب سے موسوم کریں تو نامناسب نہیں ہے اس کے بعد جو کچھ ہے وہ دو صورتوں سے خالی نہیں ہو سکتا یا تو وہ تصور دل میں متمکن ہو جائے گا یا زائل ہو جائے گا۔ اگر متمکن ہو جاتا ہے تو صاحب تصور میں بشن کی خاصیت پیدا ہو جاتی ہے اور اگر زائل ہو گیا تو یہ خاصیت مہادیو کی ہے۔

اس طبقہ کی اصطلاح میں روح کو آتما اور حضرتِ آفریدگار کو پرم آتما یعنی روحِ بزرگ" اور روح الارواح بھی کہتے ہیں۔

ترک ہندی میں ترک حکمت کو کہتے ہیں۔ اس میں تمام علوم شامل ہیں سوائے منطق کے جو علم حاصل کرنے کا وسیلہ ہے۔ علمِ منطق سکندر ذوالقرنین کے وزیر حکیم ارسطاطالیس نے مدوّن کیا تھا۔ ہندوؤں کی کتابوں میں لکھا ہے کہ پرانے زمانے میں اس فرقے میں بڑے جیّد علماء اور فلسفی گذرے ہیں۔ علمائے یونان ..... ایک واسطے سے ہندوستانی فلاسفہ کے شاگرد ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے مصریوں سے علوم عقلی سیکھے اور مصریوں نے ہندوستانیوں سے حاصل کئے تھے۔ اسی طرح عرب کے علماء نے یونانیوں سے اور فرنگیوں نے عہد خلافت عباسی میں عرب سے علمی استفادہ کیا۔ اس زمانہ میں یونانی زبان میں حکمائے یونان کی تصانیف لندن کے سوا کسی دوسری جگہ دستیاب نہیں ہوتیں۔ کیونکہ بو علی سینا کے زمانے میں بخارا کا کتب خانہ جل گیا تھا اور اس زمانہ میں بخارا کے علاوہ کہیں اور ایک کتاب بھی نہ تھی کیوں کہ بغداد اور شیراز میں جتنے بھی کتب خانے تھے آخر میں سب کے سب غارت ہو کر اسی شہر میں جمع ہو گئے تھے۔ اور ان کتابوں کے گُم ہونے کا سبب یہ تھا کہ علمائے اسلام نے انہیں قبول نہیں کیا تھا۔ دوسرے لوگوں کی ہمتوں کی پستی تھی۔ کیونکہ پہلے تو ایک کتاب سے ایک سال میں ہزار کتابیں نقل ہوتی تھیں لیکن ہر چیز کی قیمت خریدار کی قدر دانی پر موقوف ہے۔ آج بھی اگر حکمائے یونان کی کسی تصنیف کا کوئی نسخہ کسی کے پاس ہو اور دلیل سے یہ ثابت ہو جائے کہ یہ اصل ہے تو میں اس بات کی ضمانت لیتا ہوں کہ وہ اس نسخہ کو لندن بھیج دے اور دس لاکھ سے ایک کروڑ روپیہ تک جو قیمت چاہے لے لے۔ علم ہندسہ میں ہندوستانیوں کی مہارت ضرب المثل ہے۔ دوسرے علم ریاضی بھی جانتے ہیں اور علم مابعد الطبیعیات میں بھی دوسروں سے بہتر ہیں۔ البتہ علم طبعیات میں یونانیوں کو ان سے زیادہ مشق حاصل تھی لیکن اس زمانہ میں ایسا کوئی شخص دیکھنے میں نہیں آتا جو کہ ہندوستانی

علوم پر پوری قدرت رکھتا ہو۔ نند رام راز دان کشمیری لکھنؤ میں رہتا تھا، حالانکہ وہ بھی حکماء کے مرتبہ کو نہ پہنچا تھا، تاہم وہ اپنا ثانی نہ رکھتا تھا، سنا گیا کہ دکھنی برہمنوں میں سے ایک شخص بنارس میں تھا جس کا پلّہ علم و فضل میں اُس سے بڑھا ہوا تھا لیکن یہ قول متفق علیہ نہیں۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ اُس پر فوقیت رکھتا تھا۔ ایشیا کے تین علاقے معدنِ علوم اور حکماء کے اجتماع کا مرکز تھے۔ پہلا کشمیر جو تمام علاقوں سے مقدم اور اعلیٰ تھا، دوسرا بنارس، تیسرا نیپال۔

ہندوستان کے حکماء کا عقیدہ اہل شرع ہندوؤں کے عقائد سے بالکل مختلف ہے۔ یہ لوگ رام، کنہیا اور اس فرقے کے دوسرے پیشواؤں کی بزرگی کے بالکل قائل نہیں رہے ہیں۔ ان میں بعض لوگ صانعِ عالم کے وجود سے منکر ہو گئے ہیں۔ مگر ایسے لوگ کم ہیں۔ ورنہ اکثر حکماء آفریدگارِ حقیقی کے وجود کے قائل ہیں اور اُس کی قدرتِ کاملہ کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔ وہ شرع کی ظاہری عبادتوں کو اہمیت نہیں دیتے۔ صفاتِ حمیدہ کو سب سے بڑی عبادتوں میں سے سمجھتے ہیں، مرنے کے بعد روح کی بقا اور سعادتِ روحانی کے قائل ہیں۔ راجہ ٹیک رائے کی مختاری کے زمانہ میں بشن ناتھ نامی شخص اس شہر میں رہتا تھا۔ اگرچہ اس میں علمی لیاقت اس قدر نہ تھی کہ اس کا شمار نند رام راز دان کے ساتھ کیا جاتا لیکن روشن ذہن رکھتا تھا۔ ایک دن لالہ ٹیک مل نامی شخص کی خاطر، جو اور کشمیری برہمنوں میں سے ایک ہوشیار اور روشن طبع شخص تھا، مجھے اس کے مکان پر جانیکا اتفاق ہوا۔ پورے ایک گھنٹہ تک ہم اس کے یہاں بیٹھے رہے۔ مجھ سے اس نے سوال کیا کہ حکمائے اسلام نے روح کے متعلق کیا لکھا ہے۔ میں نے کہا مجھ سے اگر سوال کرنا ہے تو شعر و شاعری کے بارے میں کرو، مجھے فلسفہ سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ٹیکا رام نے اُس سے کہا آپ ہی کچھ فرمائیے۔ مرزا صاحب بھی سنیں گے۔ پہلے کچھ عذر کئے۔ پھر طرفِ ثانی کی خاطر سے بولنا شروع کیا۔ جب تک وہ باتیں کرتا رہا نہایت شستہ اور معقول باتیں تھیں۔

سفر کالپی کے دوران میں راقم الحروف کو کان پور کیمپ میں ایک برہمن سے ملاقات کا اتفاق ہوا تھا۔ اور کسی بات میں فلسفے کی بات چھڑ گئی تھی۔ اس بحث کے ضمن میں ہیولیٰ اور صورت کے بارے میں اس نے تقریر کی۔ سوائے ان الفاظ کے جو ہندی زبان کے لئے مخصوص ہیں، باقی سب وہی باتیں تھیں جو عربی کی کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں۔

سر بھنگی یہ ایک فرقہ ہے جو دکن میں زیادہ اور دوسری جگہوں پر کم پایا جاتا ہے۔ یہ اپنی ندرت کی وجہ سے سر بھنگی سے موسوم ہیں۔ ان کا کام مہادیو اور پاربتی کی پرستش ہے، اور ان بدنہادوں کا عقیدہ آلاتِ تناسل کی پرستش کے سوا اور کچھ نہیں ہے ان کا کہنا ہے کہ تمام مذہبوں میں سب سے بڑی عبادت یہی ہے۔ گو ظاہر میں اس کا نام بدل گیا ہے۔ یہ بدبخت اہلِ اسلام پر بھی اعضائے تناسل کی پرستش کا اتہام لگاتے ہیں۔

(اس موقع پر دو سطروں کا ترجمہ نظر انداز کر دیا گیا ہے
اسکیلئے ملاحظہ ہو، ہفت تماشا، متن فارسی صفحہ ۶۴ سطر ۸-۹)

اُنکے مذہب میں سگی، سوتیلی بہن، چچا، خالہ اور بھائی کی لڑکی اور بھانجی بھتیجی سب کے ساتھ جماع جائز ہے۔ بلکہ وہ لوگ بیگانہ عورتوں سے زیادہ ان سے متلذذ ہوتے ہیں صرف ماں سے تعلق نہیں رکھتے۔ لیکن اس فرقہ کے علماء میں سے ایک شخص نے لکھا ہے کہ ماں کے ساتھ جماع متذکرہ لوگوں سے زیادہ لذیذ ہوگا۔ جو لوگ اس سے پرہیز کرتے ہیں وہ گمراہی کے راستہ پر ہیں۔ یہ جب مباشرت کے لئے تیار ہوتے ہیں تو پہلے مرد عمدہ لباس پہن کر اُس پر عطر ملتا ہے اور پھولوں کے گجرے گلے میں ڈالتا ہے۔ پھر عورت بھی اسی طرح آراستہ ہوتی ہے۔ مرد اپنا نام مہادیو رکھتا ہے اور عورت کو پاربتی قرار دیتا ہے۔ پھر دونوں منھ کالا کرتے ہیں جس شہر میں بھی ان لوگوں کی کثرت ہے وہاں جو شخص جس کے گھر چاہتا ہے چلا جاتا ہے، اُسے کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ پھر اس کی لڑکی، بیوی یا بہن سے مباشرت کرتا ہے تو یہ حرکت مالکِ مکان کی طبیعت پر ہرگز گراں نہیں ہوتی۔ بلکہ اسے

ان دونوں کے درمیان رابطۂ محبت زیادہ ہو جاتا ہے۔ اگرچہ تمام متشرع ہندو خواہ وہ عورت ہو یا مرد، مہادیو کے لِنگ (عضو تناسل) کی پرستش کرتے ہیں لیکن یہ حرکتیں ہندوؤں میں نہیں ہوتیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ پتھر کا لنگ بنا کر کسی گوشے میں رکھ دیتے ہیں۔ اور کبھی کبھی عورتیں اس پر پانی بہا کر پرستش کرتی ہیں۔

چمار چمار ہندوستان کا ایک فرقہ ہے۔ یہ لوگ ساحری کے لئے مشہور ہیں۔ ہندو اور مسلمان دونوں اُن کے شر سے ڈرتے ہیں، لیکن عوام ہی ان سے ڈرتے ہیں، خواص نہیں۔ ان کی غذا مردہ جانور کا گوشت ہے۔ یہ زندہ گائے کی پوجا کرتے ہیں اور مردہ کو بڑی خوشی کے ساتھ کھاتے ہیں۔ اور سور چاہے زندہ مل جائے، یا مردہ اُسے کھا لیتے ہیں۔ گائے اور بھینس کے چمڑے کی جوتیاں وغیرہ بنانا ان کا پیشہ ہے۔ سحر کے اعمال شروع کرتے وقت اوّل شب میں نہایت مکروہ صدا بلند کرتے ہیں جو گدھے کی آواز سے بھی زیادہ کریہہ ہوتی ہے۔ پھر بھوانی اور دوسرے دیوتاؤں کی مدح پر کچھ الفاظ گاتے ہیں، اپنے گھروں میں چراغاں کرتے ہیں۔ اس شور و غل سے پڑوسیوں کا سونا حرام ہو جاتا ہے۔ گاتے وقت جو بجاتے ہیں اُسے ڈورو کہتے ہیں۔ دوسرے سازوں کے برخلاف کہ ان کی آواز سے روحِ انسانی نشاط اور فرحت حاصل کرتی ہے۔ ڈورو کی آواز سوہانِ روح ہے۔ بھوانی سے مراد چند عورتیں ہیں جو منسا دیوی کی نیابت میں ہر ذی حیات کے مارنے، جلانے اور کام کے بگاڑنے پر قادر ہیں۔ ان کے نام صاحب لیاقت اور متشرع ہندوؤں کے ناموں کی طرح ہوتے ہیں۔ رذیل لوگوں کا اعتقاد ہے کہ ہر شخص کی موت چماروں کے جادو سے ہوتی ہے۔ ان کے جادو کو اصطلاح میں موٹھ کہتے ہیں۔ فارسی میں موٹھ کا ترجمہ "مشت" ہے لیکن ان لوگوں کی اصطلاح میں تیغ چلانے اور جادو سے آدمی کے مارنے کو موٹھ کہتے ہیں۔

حلال خور حلال خور ایک مشہور جماعت ہے۔ ہر چند کہ یہ لفظ غلط ہے لیکن بہرحال

اسی طرح مشہور ہے۔ مزبلوں اور نجاست خانوں کو بول و براز سے صاف کرنا اور صحن خانہ کی صفائی کرنا ان کا کام ہے۔ یہ ہندو مسلمان دونوں کی پکی ہوئی روٹی کھا لیتے ہیں۔

مرے، زمین کے تمام جانور، پرند، چرند، درند، زندہ، مردہ سب کا گوشت کھاتے ہیں۔ گائے اور سور تو کس شمار میں ہیں۔ لیکن اگر کوئی ان سے اسلام قبول کرنے کو کہے تو ہرگز آمادہ نہ ہوں گے بلکہ اصرار کیا جائے تو خودکشی پر آمادہ ہو جائیں گے۔ ان کے نام بالکل ہندوؤں کے جیسے ہوتے ہیں۔ حالانکہ ہندو ان کے جسم کو چھونا بُرا سمجھتا ہے۔ اگر اتفاق سے راستہ چلتے ہوئے.....

کسی ہندو کا بدن کسی بھنگی سے چھو جائے تو جب تک وہ غسل نہیں کر لیتا دوسرے ہندو اس سے کنارہ کش رہتے ہیں۔ اگر اس حالت میں کسی ہندو سے بغلگیر ہو جائے تو وہ ہندو بھی اسی بلا میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ان کے اعتقادات بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ بعضے تو چماروں کی طرح بھوانی کی پوجا کرتے ہیں اور شادی کی مجلس میں ڈھول بجا کر گاتے ناچتے ہیں اور بعض لوگ اپنے آپ کو لال بیگ نامی شخص کا مرید کہتے ہیں۔

لال بیگ

لال بیگ کا قصہ یوں ہے۔ اُس گروہ کے عقیدہ کے مطابق کرچھرا نامی اس جماعت کا مرشد اور نجاست برداری کے فن میں کامل اور اس پیشہ کے قانون کا وضع کرنے والا اور مقرب درگاہِ کبریا ایک شخص تھا اور اُس کا لقب خواجہ صفا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ جب سرورِ کائنات محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آنحضرتؐ کا خط دعوتِ اسلام کے بارے میں خواجہ صفا کے پاس پہونچا۔ اس نے حضورؐ کے فرمان سے روگردانی کی اور درگاہِ کبریا کے مغضوبین میں شامل ہو گیا۔ اس کے بعد آنحضرتؐ شبِ معراج کو عرش اعظم پر تشریف لے گئے تو عرش اعظم کے صحن میں بے حد کوڑا کرکٹ ملاحظہ فرمایا۔ آنجناب نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ یہاں اتنے کوڑے کا سبب کیا ہے۔ بہ حضرتِ حق کی طرف سے آواز آئی کہ کچھ دنوں سے تمہارے بھائی خواجہ صفا پر جو کہ اس مکان کی صفائی کا بہت خیال رکھتا تھا، میں نے قہر نازل کیا ہے اور اس قہر کا سبب یہ ہے کہ اُس نے تمہاری اطاعت سے انحراف کیا تھا پیغمبر خدا صلی اللہ

علیہ وسلم نے عرض کیا کہ میری خاطر اس کی تقصیر معاف کر دی جائے۔ رسولِ خدا کی سفارش سے خواجہ صفا کی خطا معاف ہوگئی۔ وہ اسی وقت عرش مبارک پر جناب رسالت مآب سے بغلگیر ہوا اور عرشِ اعظم پر جو خس و خاشاک تھا، اُسے آناً فاناً صاف کر دیا۔ لال بیگ کو اُسی خواجہ صفا کا لڑکا بتاتے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ اس کا جنم بیوی کے بطن سے ہوا ہو بلکہ اس کی کرامت سے ہوا تھا۔ وہ اس طرح کہ ایک دن خواجہ صفا نے اپنا عضوِ تناسل کھولا تو اس میں سے ایک بچہ زمین پر گر پڑا۔ خواجہ صفا نے اس بچّہ کو اٹھا لیا اور مہربان باپ کی طرح اس کی پرورش کی، یہاں تک کہ وہ جوان ہو گیا اور پدرِ بزرگ کی جگہ عرش پر جھاڑو دینے کی خدمت اُسے ملی۔ خواجہ صفا کا اصلی نام گرو جھپرا تھا۔

ایک عزیز نے روایت بیان کی کہ میں نے ایک حویلی کرایہ پر لی تھی۔ اس حویلی کی پشت پر ایک حلال خور کا مکان تھا۔ ایک رات اس کے لڑکے کی شادی کے سلسلہ میں شہر بھر کے خاکروب اس جگہ جمع ہوئے تھے۔ وہ آپس میں گپ اُڑا رہے تھے کہ ہندوؤں کے لئے تو مرنے کے بعد دوزخ مقرر ہے ہی۔ مسلمانوں کے بارے میں بالکل کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ مرنے کے بعد دوزخ میں جائیں گے یا اعلیٰ مرتبہ پا کر بہشت میں داخل ہوں گے۔ اُن میں سے ایک سن رسیدہ شخص نے کہا کہ مسلمانوں میں ایک فرقہ بہشتی ہے، اُن کو مغل کہا جاتا ہے۔ اس بات کا پورا یقین ہے کہ لال بیگ ہم قومیت کا لحاظ کر کے اُن لوگوں کو البتہ جنّت میں بلا لے گا۔ اور انہیں دوزخ میں نہیں جلنے دیگا۔ مسلمانوں کے باقی تمام فرقے جہنمی ہیں۔

ظاہر پیر

یہ لوگ ظاہر پیر کو جسے گوگا پیر بھی کہتے ہیں، بہت مکرم و معظم اور دنیا بھر کے لوگوں کا مشکل کشا سمجھتے ہیں۔ ہر سال یہ جہلا شہر میں جمع ہو کر ان میں سے بعض پرّوں کے علم اور بعضے طاؤس کے پروں کے پنکھے ہاتھ میں لے کر ڈور و بجاتے اور گانا گاتے ہوئے روزانہ کوچہ و بازار سے گذرتے ہیں اور ایک مہینہ تک یہی ہنگامہ گرم رکھتے ہیں۔

ان میں سے بعض لوگ باگرڈ کے لئے روانہ ہو جاتے ہیں۔ یہ راجپوتانے میں ظاہر پیر کا مدفن ہے۔ اس کے زائرین سالار اور شاہ مدار کے زیارت کرنے والوں سے کم نہیں ہیں جلال خوروں کے علاوہ میوات اور راجپوتانہ کے رذیل مسلمان بھی جمع ہوتے ہیں۔ میوات راجپوتانہ کے متصل ایک ملک ہے اور یہاں کے باشندے میو (بروزن دیو) کہلاتے ہیں۔ حالانکہ میوؤں کے علاوہ وہاں دوسرے فرقہ کے لوگ بھی رہتے ہیں لیکن اس قطعۂ زمین پر اُن کی آبادی کی وجہ سے اُسے میوات کہا جانے لگا ہے۔ سنا گیا ہے کہ ظاہر پیر بھی ایک میو کا لڑکا تھا اور شاید عنفوانِ شباب میں اٹھارہ سال کی عمر میں بے گناہ مارا گیا تھا اور راجپوتوں نے اس پر رحم کر کے اس کی لاش مسلمانوں کے سپرد کر دی تھی کہ وہ اُسے دفن کر دیں۔

باب چوتھا

ہندوؤں کے متبرک دنوں اور تہواروں کے بیان میں

دسہرہ سے مراد رام کی فتح کا دن ہے، رام، بشن کا ساتواں مظہر تھا، اور زمانہ ترتیا میں کنہیا سے پہلے پیدا ہوا تھا، کنہیا زمانۂ دواپر کی پیدائش تھا۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ زمانۂ کلجگ کے متصل دواپر اور ترتیا میں وہ پیدا ہوا تھا اور یہی قرین صحت ہے، اور کچھ لوگوں کے نزدیک ترتیا اور دواپر کا زمانہ غیر متعین ہے۔ کچھ کا اعتقاد ہے کہ ہر چوکری میں یہ لوگ اور سارے اولیاء، بلکہ انبیاء، اور ائمہ وجود میں آتے ہیں، اور جو حالات ان پر گذرتے ہیں وہ ہر زمانے میں اسی طرح وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ راون نامی ایک دیو تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بہت زیادہ عبادت اور ریاضت کر کے اُس نے وہ مقام حاصل کر لیا تھا کہ راجہ اندر اور آفتاب اور دوسرے دیوتا اس کے مطیع ہو گئے تھے۔ حسنِ اتفاق سے رام کی بیوی سیتا کے حسن و جمال کا وصف سُن کر وہ اس پر فریفتہ ہو گیا۔ اور اُسے حیلے سے گرفتار کر کے اغوا کر لیا۔ لیکن حکمِ الٰہی کے مطابق وہ سیتا پر قابو نہ پا سکا۔ رام نے مدتوں سیتا کے فراق میں جنگل کی خاک چھانی اور درختوں کے پتے اور گھاس کھا کر گذارا کیا۔ مدتِ مدید کے بعد قادرِ مطلق کے حکم سے راون اور رام کے درمیان جنگ واقع ہوئی اور رام نے اپنے دشمن پر فتح پائی۔ اور یہی وہ دن ہے جو دسہرہ کہلاتا ہے۔ آج تک ہر سال ہندو لوگ کسی لڑکے کو عمدہ لباس پہنا کر اس کے

سر پر تاج رکھتے ہیں اور اُسے رام کہتے ہیں، اسی طرح ایک دوسرے لڑکے کو لباسِ فاخرہ پہنا کر اُسے لچھمن سے موسوم کر کے ان دونوں کو ہاتھی پر سوار کرتے ہیں، پھر ایک کاغذ کا دیوتا بناتے ہیں، جسے راون سمجھتے ہیں۔ ہر شہر میں لاکھوں کی تعداد میں آدمی جمع ہو کر اس ہاتھی کو مع راون کے ایک میدان میں لاتے ہیں اور بڑے جوش وخروش کے ساتھ رام اور راون کی آپس میں جنگ کراتے ہیں، اور اسی عقیدہ کے مطابق کہ رام نے راون کو شکست دی تھی، اس مقام پر بھی راون کی شکست کا منظر پیش کرتے ہیں، راون کے بھاگنے کے بعد تہنیت اور مبارک بادی کا شور وغل اتنا بلند ہوتا ہے کہ آسمان گونج اٹھتا ہے، پتھر، کنکر اور مٹی کے ڈھیلے اٹھا کر اس طرح چاروں طرف سے راون پر مارتے ہیں کہ اُس شور وغل سے خوف زدہ ہو کر وہ پیکر ہاتھی بھی اپنی جگہ سے بھاگ جاتے ہیں، ہر چند مہاوت آنکس سے اُن کو روکنے کی سعی کرتے ہیں لیکن اس کی کوشش لاحاصل ثابت ہوتی ہے۔ وہ اس قدر خوف زدہ ہو کر بھاگتے ہیں کہ اگر راستے میں کنواں بھی آجائے تو عجب نہیں کہ وہ اُس میں گر کر ہلاک ہو جائیں۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آم کے باغ میں یا شہتوت وغیرہ کے درختوں میں گھس جاتے ہیں اور سوار ڈر کے مارے اپنے آپ زمین پر گر پڑتے ہیں، اس صورت میں شاید ہی کوئی شخص صحیح سالم اعضا لیکر گھر واپس پہنچتا ہو۔ بعضوں کو اپنے ہاتھوں سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے، اور بعضوں کو لکڑی کے مصنوعی پیر لگوانے پڑتے ہیں، بسا اوقات بے چارے مہاوت کے سر پر درختوں کی ایسی ٹکریں لگتی ہیں کہ وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ہندو اِس دن کو عموماً بے حد مبارک دن تصور کرتے ہیں، اور کھتری، رام سے ہم قومی کا علاقہ رکھنے کے باعث خصوصاً نفیس کپڑے پہنتے ہیں اور برہمنوں سے جو کے ہرے پودے لے کر پھولوں کی بجائے اپنی دستار میں لگاتے ہیں۔ اُس دن نیل کنٹھ کو دیکھنے کی غرض سے تمام لوگ شام کے وقت شہر سے باہر جنگل کی طرف نکل جاتے ہیں،

اور اس کا دیکھ لینا اپنے لئے سرمایۂ دولت سمجھتے ہیں۔

مسلمان اور دسہرہ

اور یہ صرف ہندوؤں تک محدود نہیں ہے، کچھ مسلمان بھی نیل کنٹھ کے دیدار کے اشتیاق میں شہر کے باہر جاتے ہیں، خصوصًا وہ مسلمان امیر جو حاکم شہر ہو، وہ مجبور ہوتا ہے کہ آج کے دن اپنے گھوڑوں اور ہاتھیوں کو مہندی اور دوسرے رنگوں سے رنگین کر کے نقرئی و طلائی ساز و سامان اور زرنگار جھول کے ساتھ سونے چاندی کے حوضے اور عماریاں لگا کر فوج فرّا اور خدم و حشم کے ساتھ اور ذی مرتبہ مصاحبوں کو ہمراہ لے کر بازار میں نکلتا ہے۔ یہ مصاحب بھی اپنی حیثیت کے مطابق عمدہ ملبوس اور بڑھیا ہتھیاروں سے لیس ہوتے ہیں۔ وہ ہر فرقے کے لوگوں میں گراں بہا نقدی بطور انعام تقسیم کرتا ہے اور شہر کے باہر جا کر ایک میدان میں نیل کنٹھ کا دیدار کرتا ہے۔ اس موقع پر توپیں اور بندوقیں داغی جاتی ہیں، پھر شام کو گھر واپس آکر وہ پری نژاد شوخ و طناز رقاصاؤں کے رقص اور خوش نوا مطربوں کے سرود سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ نیل کنٹھ ایک پرندہ ہے جس کے پر سبز اطلس کی طرح ہوتے ہیں، ان میں آبی رنگ بھی ملا ہوتا ہے، وہ جسامت میں طوطی کے برابر ہوتا ہے

ٹیسو رائے

ہندوؤں اور مسلمانوں میں یہ رسم ہے کہ بچّے دسہرہ سے دس دن قبل مٹی کی ایک صورت بناتے ہیں اور اُسے لکڑیوں پر لٹکاتے ہیں، اس کا نام ٹیسو رائے ہوتا ہے۔ روزانہ شام کے وقت کچھ بچّے اور کچھ جوان مل کر اپنے رشتہ داروں کے دروازوں پر جاتے ہیں اور ایک مخصوص لَے میں بلند آواز اور خوش الحانی کے ساتھ ہندی کے چند بیت پڑھتے ہیں اور ایک پیسہ یا اس سے زیادہ لے کر ایک دروازے سے دوسرے دروازے پر جاتے ہیں۔ اس طرح جو کچھ روزانہ حاصل کرتے ہیں، اُسے جمع کرتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ روزِ مذکورہ کو ان پیسوں کی مٹھائی خرید کر آپس میں بانٹ لیتے ہیں (اس کے برعکس) لڑکیاں

ٹیسو رائے کے بجائے جالی دار کوزہ ہاتھ میں لے کر دروازوں پر جاتی ہیں، اور ان ایام میں لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان اچھی خاصی عداوت پیدا ہو جاتی ہے، جس جگہ اُن کا آمنا سامنا ہو جاتا ہے لڑکے ان کے کوزے توڑ ڈالتے ہیں اور اگر ایک ٹیسو رائے اس طرف آجائے اور دوسرا اس طرف سے، تو دونوں گروہوں کے درمیان جنگِ عظیم واقع ہو جاتی ہے۔ جو ٹیسو رائے غالب آجاتا ہے وہ مغلوب کو توڑ ڈالتا ہے، اس سے مغلوب اتنا غمگین ہوتا ہے کہ خود کو ہلاک کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ غرض دسہرہ کے دن ہر شخص اپنے مخصوص ٹیسو رائے کو نشان و نقارہ کے ساتھ باہر نکالتا ہے اور ایسی شان و شوکت سے کہ اس کے ساتھ سپاہی پیشہ مغل بچے اور زنانِ کسبی و بازاری سر کے بال بکھیرے ہوئے ہمراہ ہوتی ہیں۔ یہ جلوس ندی کی طرف جاتا ہے اور ٹیسو رائے کو پانی میں بہا کر واپس آجاتا ہے اور یہ الٰہی سنہ کے ماہ شہر یور کا آخری دن ہوتا ہے۔

سلونو دسہرہ کے اختتام سے پانچ دن پہلے سلونو کا تہوار ہوتا ہے۔ یہ دن بھی بابرکت دنوں میں سے ہے۔ اس دن بہنیں جھوٹے مروارید سے مزیّن ریشم زری کے تاروں کی راکھی بنا کر بھائیوں کے ہاتھوں میں باندھتی ہیں۔ اور برہمن بھی عوام کے واسطے رنگین ڈوروں کی بنی ہوئی اور خواص کے لئے ریشم اور جھوٹے مروارید کی راکھیاں خرید کر غیر برہمن ہندوؤں کی کلائیوں میں باندھتے ہیں اور اس کے صلے میں زرِ نقد حاصل کرتے ہیں، بہنیں بھی بھائیوں سے روپے لیتی ہیں اور اس دن صاحبِ ثروت ہندو رقص و سرود سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور شام کے وقت شہر سے باہر جا کر میدان میں جمع ہوتے ہیں۔ بعض لوگ کسی درخت کے سائے میں، اور کچھ لوگ دریا کے کنارے فرش فروش بچھا کر بیٹھتے ہیں اور خوبصورت لڑکوں کو نچاتے ہیں۔

کتھک واضح ہو کہ ہندوستان میں برہمن فرقے میں کتھک نامی ایک چھوٹا سا گروہ ہے، جس کا کام بچوں کو، چاہے اُن کا بیٹا ہو یا بھتیجا ہو یا بھانجا ہو، نواسہ ہو، پوتا ہو یا غلام کا لڑکا ہو، چاہے کسی غیر کا لڑکا ہو جسے باپ نے افلاس کی وجہ سے اُن کے سپرد کر دیا ہو، انھیں رقص و سرود کی تعلیم دیتا ہے، تاکہ دولت مندوں کی محفلوں میں ان کو نچوائیں اور گراں قدر انعامات حاصل کریں۔ امیروں کی مجلسوں کے علاوہ دوسرے لوگوں کا یہ معمول ہے کہ چند لوگ ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور ان لڑکوں کو ناچنے کے لئے مامور کرتے ہیں۔ رقص کی حالت میں ان میں سے ایک شخص جب اپنی جیب سے ایک پیسہ یا ایک روپیہ نکال کر اُس کے ہاتھ میں رکھ دیتا ہے تو مجمع کے دوسرے لوگ بھی یہ عمل دیکھ کر اُن میں سے اُسے حسب حیثیت کچھ نہ کچھ دیتے ہیں۔ اس مجمع میں جس شخص کے سامنے یہ لڑکا ناچتا ہوا آکر بیٹھ جاتا ہے اور ناز و ادا سے اس کا دامن پکڑ کر بیٹھے بیٹھے ناچتا ہے، وہ مجلس کے دیگر اشخاص کے لئے باعثِ رشک و حسد ہوتا ہے، کیوں کہ ان کے خیال میں یہ بات اعلیٰ ترین مراتب میں ہے۔ یہ عمل ہندو شرفاء کے لئے مخصوص ہے، اس کے برعکس شریف النسب مسلمان اگر نانِ شبینہ کے لئے بھی محتاج ہو تو بھی اس کے لئے ایسی مجلس میں بیٹھنا اور اس لڑکے کا رقص دیکھنا ہزار طرح سے باعثِ ننگ ہے لیکن کچھ رذیل پیشہ مسلمان اس میں بڑا اہتمام کرتے ہیں، بعضے چناری، بازاری اور دیہاتی جو قصبات و دیہات کے باشندے ہوتے ہیں۔ اور ملکیوں کے نام سے موسوم ہیں، اس فرقے کے شیخ، سیّد، مرزا اور خان تمام کے تمام لڑکوں کے ناچ کے عاشق ہوتے ہیں۔ اگر کسی عزیز کے گھر وہ کسی تقریب کے سلسلہ میں طوائف کے رقص کی خبر سنیں تو وہاں نہیں جاتے، چاہے دعوت نامہ ہی کیوں نہ آیا ہو کوئی نہ کوئی عذر پیش کر دیتے ہیں لیکن اگر کسی سے سن لیں کہ فلاں بازار میں، فلاں دکان کے سامنے

کسی ہندو یا مسلمان لڑکے کا ناچ ہو رہا ہے تو کچھ لوگ جمع ہو کر بڑی خوش دلی سے وہاں جائیں گے۔ چاہے راستہ میں کیچڑ، پانی، گڈھے اور شدید بارش ہی کیوں نہ ہو۔ سلونو کا دن سنہ آلہی کے ماہ امرداد کی پہلی تاریخ کو ہوتا ہے۔

دوالی

یہ دن بھی مبارک ترین دنوں میں سے ہے۔ اس کی برکت ایک ماہ تک رہتی ہے۔ ایک ہفتہ پہلے سے ہندو اپنے مکانوں کے در و دیوار پر طرح طرح کے پھول بوٹے اور تصویریں بناتے ہیں اور نقش و نگار سے مزین کرتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنی حیثیت کے مطابق روزانہ دن میں رقص کا تماشا دیکھتے ہیں اور رات کو کبھی کبھی شام سے آدھی رات تک اور کبھی رات کے آخری حصے تک قمار بازی میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں۔ اور کچھ لوگ ساری ساری رات جوا کھیلتے رہتے ہیں۔ ان دنوں میں کتھک بچے بھی انعام کی امید میں کوچہ و بازار میں، گھروں اور دوکانوں کے سامنے ناچتے پھرتے ہیں اور دوکان دار بھی اپنی دوکانوں کو آراستہ پیراستہ کرتے ہیں۔ کمہار مٹی کے کھلونے بناتے ہیں، ان میں کچھ معین صورت کے ہوتے ہیں کچھ غیر معین صورت کے بعض مردوں اور عورتوں کی شکلیں خوب صورت بھی، کچھ مورتیں بچوں، جوانوں، بوڑھوں کی ہوتی ہیں۔ کبھی جانوروں کی مورت بناتے ہیں۔ مثلاً چھوٹے بڑے سائز کے ہاتھی، گھوڑے، پرندے، وحوش، یا بعض درخت گل بوٹے، پھول دار بیلیں، وغیرہ، اسی طرح چھوٹی بڑی عمارتیں، مسجد کے برج اور مینار جیسی شکلیں بناتے ہیں اور ان کی زیب و زینت کو دوبالا کرنے کے لئے ان پر روغن پھیر کر بیچتے ہیں، اور حلوائی ہندوستان کی مروجہ مٹھائیاں تیار کر کے طرح طرح سے دوکانوں میں سجاتے ہیں، اور لکڑی کے سانچوں میں قوام ڈال کر ان سے کھانڈ کے کھلونے بناتے ہیں، اور تھالوں میں سجا کر دوکانوں میں رکھتے ہیں تاکہ ہندو لوگ ان مٹھائیوں کو اپنے بچوں کے لئے خریدیں۔ اگرچہ اس مقام پر اختصار سے ذکر کیا

گیا ہے، لیکن یہ چیزیں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں. مختصر یہ کہ ہندوؤں کے مذہب میں ان راتوں کو جوا کھیلنا برکت اور میمنت کا باعث سمجھا جاتا ہے. جس شخص نے کبھی بھی جوا نہ کھیلا ہو اسے بھی چاہیئے کہ ان راتوں کو حصولِ برکت کے لئے جوا کھیلے اور اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اسے مطعون کیا جاتا ہے اور اسے لوگ غلطی پر سمجھتے ہیں. شاذونادر ہی کوئی ایسا شخص ہوگا جو ان راتوں کو ایک دو گھڑی یہ شغل نہ کرتا ہو۔ اس طرح ایک شہر میں ہزار گھر برباد اور دوسرے ہزار گھر آباد ہو جاتے ہیں. بعض لوگ جن کی قسمت یاوری کرتی ہے، جوئے میں ہزاروں روپے پیدا کر لیتے ہیں، اور بعضے جب ان کے پاس نقدی اور جنس تک باقی نہیں رہتی، تو اپنی بیوی اور لڑکی تک داؤں پر لگا دیتے ہیں. اکثر ہارنے والے بدقسمت اس رات کی صبح کو شہر سے بھاگ جاتے ہیں یا زہر کھا کر اپنی جان تک دے دیتے ہیں یا کوتوالی کے چبوترے پر دکھائی دیتے ہیں، کچھ لوگ تیغ اور چھرا اور خنجر کے زخموں کی وجہ سے مرہم پٹی اور ٹانکوں کے محتاج ہو جاتے ہیں. ان غریبوں پر یہ تمام بلائیں قمار بازی کے سبب سے آتی ہیں. روئے طمع سیاہ، اس خیال سے کہ اب کی بازی جیت لوں گا، بساط پر داؤں بڑھاتے رہتے ہیں. جب ہارتے ہیں اور رقم ادا کرنے کی مقدرت نہیں رکھتے ہیں تو حریف سے بازی جیتنے کی توقع میں دوبارہ بساط پر جمتے ہیں اور اگر اس مرتبہ بھی ہار جاتے ہیں تو اور زیادہ اضطراب و پریشانی لاحق ہوتی ہے مگر اس حالت میں بھی بساط سے ہاتھ نہیں کھینچتے اور کھیلنے میں مصروف رہتے ہیں کہ شاید اب کی بار سب کسر پوری ہو جائے. چنانچہ آخری داؤں میں یا تو واقعی یہ بلا ٹل جاتی ہے اور وہ جیت جاتے ہیں ورنہ پہلے سے بھی زیادہ بلا میں گرفتار ہو جاتے ہیں کبھی ان کی مراد بر آجاتی ہے یعنی حریف سے بازی مار لیتے ہیں لیکن پہلی اور تیسری شق صحیح نہیں. اکثر تیسری صورت ہی رونما ہوتی ہے اور اسی کا گمان زیادہ رہتا ہے. اور مزے تو مالک مکان کے ہوتے ہیں جس کے گھر پر جوا ہوتا ہے، کیونکہ جو شخص بھی جیتتا ہے وہ ایک چوتھائی مکان دار کو دیتا ہے جیسے کہ کہاوت مشہور ہے:۔

از ہر طرف کہ کشتہ شود سود اسلام است (یعنی جدھر سے بھی مارا جائے اسلام ہی کا فائدہ ہے)

حمز ۶ — ہفت تماشائے مرزا قتیل۔

اور کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں جو ایک کونے میں بیٹھے ہوئے دونوں کھلاڑیوں کے لئے جیتنے کی دعائیں مانگتے رہتے ہیں انھیں جیتنے والوں کی طرف سے نقدی کا بیسواں حصہ ملتا ہے۔ یہ نفع بھی بلا کسی دردسری کے حاصل ہوتا ہے۔ کچھ اور لوگ جو قمار بازوں کی خدمت کرنے میں لگے رہتے ہیں اپنا انعام وصول کرتے ہیں۔ اگرچہ جواریوں کے لئے تو روز ہی دوالی ہے لیکن اس رات کو تو سارے ہی وضیع و شریف اس شغل میں مصروف ہوتے ہیں۔

جادو، اور ٹونے ٹوٹکے اس زمانے میں لیمو بھی بچّوں کے گلے میں ڈالتے ہیں۔ یہ عمل اس وجہ سے کیا جاتا ہے کہ اِن دنوں اور راتوں کو اکثر جادوگر دشمنوں کے لئے جادو ٹونا، کرتے ہیں اور مختلف قسم کی چیزیں مثلاً کپڑا یا مسور کی دال، زیرہ، اور زردچوب یا اسی قبیل کی کچھ چیزیں، یا آٹے کا ایک پُتلا بناتے ہیں جسے بزعم خود اپنا دشمن سمجھتے ہیں، پھر اُسے رات کی تاریکی میں کسی گلی کے کونے میں یا سرِ بازار گاڑ دیتے ہیں تاکہ دشمن وہاں سے گزرے تو بلا میں گرفتار ہو جائے، یا کسی ایسے مرض میں مبتلا ہو کہ اگر مسیح علیہ السلام بھی آسمان سے اتر آئیں تو اُسے چنگا نہ کر سکیں۔ ان چیزوں کا اثر دشمن تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اگر نابالغ لڑکا بھی ان چیزوں کو اولانگھ جائے تو اسے بھی بخار آجائے۔ یا مجنوں ہو جائے۔ اس خوف سے والدین بچوّں کے گلوں میں لیموں ڈالتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اِن چند راتوں اور دنوں میں ہر بلا کسی نہ کسی آدمی کی تلاش میں رہتی ہے۔ ہندوؤں کی اصطلاح میں بلا سے مراد لغوی معنی نہیں ہیں بلکہ اس سے بھوت پریت مراد لیتے ہیں۔ بعض لوگ جو حالتِ جنابت میں مرجاتے ہیں ان کی خبیث ارواح بعد میں پریشان کرتی ہیں، انھیں ہندی میں بھوت کہتے ہیں۔ بعض برہمن جب کبھی کسی متموّل ہندو سے زرطلب کرتے ہیں اور وہ دینے سے پہلو تہی کرتا ہے تو یہ لوگ اس احمقانہ خیال سے اپنے آپ کو ہلاک کر لیتے ہیں کہ ہم مرنے کے بعد بھوت بن کر اسے اذیت پہنچائیں گے۔ اسی طرح اگر کسی مسلمان کے ذمے کسی ہندو کا روپیہ لبطور قرض ہو اور وہ ادا نہ کر سکتا ہو یا ادائیگی کا مقدور ہوتے ہوئے بھی قرض خواہ کو کمزور

جان کر بدنیتی سے عمداً قرض کے ادا کرنے میں ٹال مٹول کرے تو وہ ہندو زہر سے یا خنجر سے اپنے آپ کو ہلاک کر لیتا ہے تاکہ بھوت بن کر اس مسلمان کے اہل و عیال اور خود اس کو بھی صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دے۔

مختصر یہ کہ سرِ شام ہی سے اُس رات کو گھروں کے در و دیوار پر، چھتوں پر اور دکانوں پر چراغاں کرتے ہیں۔ شہر کے چھوٹے بڑے عمائد اور شرفاء اور ارازل، ہاتھی گھوڑے پر یا مہانہ پر سوار ہو کر یا پیادہ روشنی کا تماشا دیکھنے کے لئے نکلتے ہیں اور عمارت کی شکل کی ایک چیز ہوتی ہے جسے کمہار مٹی سے بنا کر فروخت کرتے ہیں۔ ہندو اُسے خرید کر چراغاں کر کے اپنے سامنے رکھتے ہیں اور معبود کا تصور کر کے پوجا پاٹھ کے لئے بیٹھتے ہیں اور اپنے مذہب کے چند مخصوص الفاظ پڑھ کر اس عمارت کے سامنے سر بسجود ہوتے ہیں، اس عمارت کو ہٹری کہتے ہیں، اس کی پوجا ویشیوں سے مخصوص ہے، ان کی تقلید میں دوسرے لوگ بھی اس عمل پیرا ہوتے ہیں لیکن تمام ہندو ایسا نہیں کرتے بلکہ کچھ ویش اس کے دعویدار ہیں کہ یہ روز ہمایوں ہمارے لئے اسی طرح مخصوص ہے جیسے دسہرہ کھتریوں کے لئے، یہ بات کچھ دل کو نہیں لگتی۔ کیوں کہ اس رات کو چھتری جوا کھیلتے ہیں۔

راجہ پانڈو اور یدھشٹر کی اولاد میں جو آپس میں چچیرے بھائی تھے، خون خرابہ ہوا تھا، وہ اسی جوئے کی بنا پر ہوا تھا، اور ان کے زمانے سے قبل بھی جوا کھیلنے کی رسم رہی ہے، راجہ نل کی آوارہ گردی بھی جوئے کی وجہ سے ہوئی تھی جس کی محبوبہ دمن تھی اور جن کے عشق کا قصہ زبان زدِ خاص و عام ہے — اسی قمار خانہ خراب نے اسے سالہا سال تک اپنے وطن سے دُور دشتِ غربت میں پھرایا تھا اور اس نے اپنی محبوبہ کے فراق میں دن گذارے تھے۔

دوالی اور مسلمان اس دن کی حرمت فرقۂ ہنود ہی پر منحصر نہیں ہے سوائے معدودے چند متقی اصحاب کے جو خدا کی دی ہوئی توفیق سے صاحبِ فہم و فراست ہیں، بہت سے مسلمان بھی ہندوؤں کے حال میں شریک ہو کر شمعِ محفلِ قمار بازی بنتے ہیں، یعنی جوا کھیلنے کے لئے قمار خانوں

میں جاتے ہیں، جو مسلمان جوا کھیلنے سے پرہیز کرتے ہیں وہ کم ازکم اپنے گھروں میں چراغاں کرتے ہیں، اور شبِ دوالی میں عورتیں سب بچوں کے نام سے الگ الگ مٹی کے کھلونے منگواتی ہیں اور طرح طرح کی مٹھائیاں اور کھانڈ کے کھلونے ان پر اضافہ کر کے پہلے گھر کو چراغاں کرتی ہیں پھر اس حصۂ مکان کو جہاں کھلونے اور مٹھائیاں ہیں۔ روشنی سے "رشکِ وادیِ ایمن" بناتی ہیں

دوالی بھرنا | اور اسے اصطلاح میں "دوالی بھرنا" کہتے ہیں، رسم یہ ہے کہ ہر ایک لڑکے اور لڑکی کے نام سے جو دوالی بھری جاتی ہے۔ اگر سوءِ اتفاق سے کسی سال اس ثواب کے حاصل کرنے سے قاصر رہتے ہیں تو ان کا آئندہ تمام سال غم وغصہ میں گذرتا ہے۔ انھیں یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ سال ہمارے لئے برکت نہیں رکھتا۔ پس ظاہر ہے کہ اس عمل کو بچوں کی سلامتی کے لئے اچھا سمجھتے ہیں۔ چوں کہ یہ عمل عقل کے برخلاف ہے لہذا اگر کوئی شخص بزرگانہ تعلیم کے ذریعہ اپنے گھر کی عورتوں کو اس سے باز رکھے اور قضائے الٰہی سے اس سال میں اس کا کوئی بچہ مرجائے تو پھر وہ عورتوں کی ملامت اور طعنوں کا ہدف بن جاتا ہے اور اسے اپنے کئے پر نادم ہونا پڑتا ہے۔ آخر کار انھیں اس معاملے میں عورتوں کو پوری آزادی دینی پڑتی ہے۔ چنانچہ بعضوں نے عورتوں کے طعنوں سے ڈر کر اور بیشتر نے اس خیال سے کہ اگر ہم عورتوں کو ان کے عمل سے باز رکھیں گے تو سارا سال منحوس گذرے گا "دیوالی بھرنے" کا عمل اختیار کر لیا ہے اور عام طور سے اس ملک کے مردان معاملات میں ہندوانہ عقائد کے پیرو اور عورتوں کے مرید ہیں۔

سیتلا | انھیں امور میں ایک چیچک بھی ہے جو مشہور مرض ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ ایک صاحبِ قدرت عورت ہے جس کے اختیار میں بچّوں کی موت وحیات ہے۔ اس کا نام ادب سے لیتے ہیں، بلکہ اُسے ماتا (ماں) کہتے ہیں۔ اس کی کمی کو روٹھنے سے اور کثرت کو عنایتِ مادرانہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ دربانوں اور باغبانوں کے ساتھ بے حد توقیر سے پیش آتے ہیں اس خیال سے کہ انھیں چیچک ماتا کے حضور میں تقرب حاصل ہے۔ جب تک چیچک بچّے پر "مہربان"

ہے گھر میں سالم مسور اور گیہوں کی روٹی کے سوا کوئی چیز نہیں پکاتے۔ ہندی زبان میں چیچک کو ماتا، سیتلا اور ستیلاجی کہتے ہیں۔ ماتا کے معنی ہیں ماں۔ اِسے مائی بھی کہتے ہیں۔ اور سیتلا ہی مفروضہ عورت ہے۔ جی، کلمہ ہندی میں تعظیم کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے فارسی میں لفظ صاحب آتا ہے۔ مثلاً ہندی میں مرزا صاحب کہ جگہ مرزاجی کہیں گے۔ لیکن یہ لفظ ہندؤں کے نام اور لقب کے آخر میں جتنا سجتا ہے اتنا مسلمانوں کے نام اور لقب کے ساتھ زیب نہیں دیتا۔

مختصر یہ کہ دوالی کا تہوار سنہ الٰہی شمسی میں آبان کی چودہ تاریخ کو پڑتا ہے۔

جنم اشٹمی | جنم اشٹمی ایک مشہور رات ہے، جو سال میں ایک بار آتی ہے۔ جنم کے معنی تولد، اشٹمی کے معنی آٹھویں۔ روایت کرتے ہیں کہ اسی رات کو کنہیا پیدا ہوئے تھے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ہر سال اسی رات کو ہندو کنہیا کی مورتی کو، جسے زمانہ قدیم سے انھوں نے پتھر یا پیتل یا سونے سے بنا کر اپنے گھروں میں رکھ چھوڑا ہے یا کنہیا کا جو بُت ان کے مورثِ اعلیٰ سے میراث کی صورت میں اُن تک پہنچا ہے، باہر نکالتے ہیں، اور ایک پاک وصاف مقام پر جس کو دولت مند لوگ فرش و فروش سے آراستہ پیراستہ کرتے ہیں اور مفلس لوگ جس کی دیواروں کو گائے کے گوبر سے لیپ کر کے پوتتے ہیں، ایک لکڑی کے تخت کے اوپر اس کو رکھتے ہیں، اپنی حیثیت کے مطابق قسم قسم کی مٹھائیاں جو بالعموم ہندوستان کے لئے مخصوص ہیں اور خربوزہ کے بیج شکر میں بھون کر بالخصوص کانسے یا پیتل کے برتن میں رکھ کر اسی بت کے سامنے قرینے سے سجاتے ہیں۔ پھر عورت اور مرد دونوں رات بھر کنہیا کی مدح میں کچھ کلام بڑی خوش الحانی اور جوش وخروش کے ساتھ گاتے ہیں اور بعضے فرطِ شوق سے ناچنے لگتے ہیں۔ اور اس رات کی صبح کو شہر میں جا بجا خوبصورت لڑکوں کو جن میں بعض ملیح اور سبز رنگ ہوتے ہیں، مردانہ اور نفیس لباس پہناتے ہیں۔ اور جو لڑکے بے حد نازک اور صبیح ہوتے ہیں انھیں زنانہ لباس اور زیورات سے سجاتے

ہیں۔ مردانہ لباس والے کو کنہیا اور زنانہ لباس والے کو رادھا کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ کنہیا اور رادھا کو علیحدہ علیحدہ شاہانہ تخت پر بٹھاتے ہیں جسے لکڑی اور بید سے بنا کر آرائشی چیزوں سے مزین کرتے ہیں۔ پھر نقارہ اور نشان نیز دوسرے سازوں کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے سواروں کا اور پیدل چلنے والوں کا ایک جمِ غفیر انھیں شہر کے باہر ایک مقررہ مقام پر لے جاتا ہے، جہاں ہر سال یہ رسم ادا کی جاتی ہے۔ اس شاہانہ جلوس کے بانی مبانی کی حیثیت کے مطابق اس جلوس میں کنہیا کے ہمراہ ہاتھی، گھوڑے اور سپاہی بھی ہوتے ہیں جب مقررہ جگہ پر پہنچ جاتے ہیں تو دوسرے کچھ لوگ کاغذ سے ایک دیو کا مجسمہ بنا کر اُسے کنس کا نام دیتے ہیں۔ کنس، کنہیا، کا ماموں تھا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ وہ ایک عظیم الشان بادشاہ تھا۔ اس کی ایک بہن کے بطن سے کنہیا اور دوسری سے "برق" پیدا ہوئی تھی۔ برق سے مراد یہی بجلی ہے جو آسمان پر کوندتی ہے۔

منقول ہے کہ جب رعایا پر کنس کا ظلم و تشدد حد سے تجاوز کر گیا تو کنہیا اور کنس میں ایک جنگ عظیم واقع ہوئی اور ماموں اپنے بھانجے کے ہاتھوں قتل ہوا۔ ہندوؤں نے کنہیا کی اس نیک کارگذاری کے صلے میں کہ اس نے انھیں کنس کے ظالم ہاتھوں سے خلاصی دلوائی اور عادل بادشاہوں کی طرح اُن کے ساتھ مشفقانہ سلوک کیا، یہ طے کیا کہ ہر سال کنہیا کے ہاتھوں کنس کی موت کی تمثیل پیش کی جائے

مسلمان اور جنم اشٹمی بعضے مسلمان بھی اس مقررہ دن کو کنس کا مجسمہ بنا کر اس کے پیٹ کو چاک کرتے ہیں اور جو شہد اس میں پہلے سے بھر دیتے ہیں، اُسے اس کا خون سمجھ کر پیتے ہیں۔

عصر کے قریب کنس اور کنہیا کے درمیان جنگ ہوتی ہے۔ کنس کی شکست کے بعد دسہرہ کے دن کی طرح تماشائیوں کا شور و غل لوگوں کو منتشر کر دیتا ہے اور شام تک اسی طرح ہنگامہ برپا رہتا ہے۔ پھر لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے جاتے ہیں۔ اور اہلِ ثروت کے گھروں میں رہس شروع ہوتی ہے۔ رہس یہ ہے کہ برہمنوں کی

ایک جماعت لڑکوں کو، خواہ وہ ان کی اپنی اولاد ہو یا بھتیجا بھانجا ہو، یا ان کے دوسرے قریبی رشتہ داروں کی اولاد ہو، کنہیا اور رادھا کی شکل میں اور دوسری سکھیوں کو آراستہ پیراستہ کر کے دولت مند ہندوؤں کے سامنے انعام حاصل کرنے کی امید میں نچواتے ہیں. لیکن ان ناچنے والوں کا حال دوسرے تمام ناچنے والوں سے مختلف ہوتا ہے کیوں کہ مسند نشین ہندو اِن دونوں لڑکوں کی تعظیم میں جو کنہیا اور رادھا بنتے ہیں کھڑے ہو جاتے ہیں اور جب تک یہ نہیں بیٹھتے، وہ بھی نہیں بیٹھتے، چاہے ایک گھنٹہ گذر جائے یا انھیں سو بار اپنی جگہ سے اٹھنا پڑے مگر ان کے والدین کی کوئی تعظیم نہیں کرتا. وہ بے چارے نوکروں کی طرح ادب سے بیٹھے رہتے ہیں. بعضے ہندو اِن مذکورہ لڑکوں کو مسند پہ اپنے برابر جگہ دیتے ہیں. بعضے ان کے لئے مسند خالی کر دیتے ہیں، اور خود ایک طرف جا بیٹھتے ہیں. مگر سکھیوں کے لئے ہر شخص کھڑا نہیں ہوتا. رادھا کی سہیلیاں اور اس کے ساتھ کھیلنے والی حسین لڑکیوں کو سکھی کہا جاتا ہے.

مختصر یہ کہ جب برہمن کنہیا اور رادھا کو مع سکھیوں کے مجلس میں لاتے ہیں تو صاحبِ خانہ اور تمام حاضرین کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان دونوں کو بڑی عزت اور احترام کے ساتھ مسند پر بٹھاتے ہیں. ان دونوں کے سامنے سکھیاں ساز کے ساتھ رقص و سرود کا آغاز کرتی ہیں. بعد ازیں مسند نشیں عاشق و معشوق میں ظاہری کشیدگی ظہور میں آتی ہے اور محبوبہ اپنے عاشق سے دور ہو جاتی ہے. وہ سکھیاں بیچ میں پڑ کر اُن میں صلح کرا دیتی ہیں اور وہ دوبارہ ایک جگہ ناچنے لگتی ہیں. جب صبح ہوتی ہے تو کنہیا اور رادھا بھی اٹھ کر سکھیوں کے ساتھ رقص میں شریک ہوتے ہیں. توت یا کسی دوسرے درخت کی شاخوں میں سے ایک نازک و نرم شاخ کنہیا اپنے ہاتھ میں لے کر گیند زمین پر پھینک دیتا ہے اور ناچنے لگتا ہے. سکھیاں اس کو رقص میں مشغول دیکھ کر وہ گیند اچکنے کا ارادہ کرتی ہیں اور کنہیا اسی حالتِ رقص میں بھی اس گیند کو اس جگہ سے ہٹاتا رہتا کہ

تاکہ سکھیاں اُسے اچک نہ سکیں۔ مگر کمال یہ ہے کہ ان حرکات کے باوجود اصولِ رقص کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا اور یہ سب حرکات وسکنات ساز کے زیروبم کے مطابق عمل میں آتی ہیں۔ اس موقع پر تمام حاضرین جلسہ کھڑے رہتے ہیں۔

مسلمان اور جنم اشٹمی اس جلسے میں جو مسلمان شریک ہوتے ہیں ان کی تین صورتیں ہوتی ہیں۔ اگر وہ مفلس ہے تو اُسے بہرحال اس مجلس میں آخر تک کھڑا رہنا ہی ہے لیکن اگر صاحبِ عزت ہے تو یا وہ خود بخود احتراماً کھڑا ہوتا ہے یا صاحبِ خانہ کی خاطر ایسی صورت میں صاحبِ خانہ اُسے بٹھا دیتا ہے۔ بہرحال تماشا دیکھنے اور رقص وسرود کا لطف اٹھانے کے علاوہ مسلمانوں کا اس دن سے اور کوئی تعلق نہیں ہے، یہ دن آلٰہی کے ماہ امرداد میں پڑتا ہے۔

بسنت بسنت تہوار آلٰہی سنہ کے ماہ دے کی بیس تاریخ کو ہوتا ہے، اور یہ وہ دن ہے جو گرمیوں کی آمد اور جاڑوں کی رخصت کا پتہ دیتا ہے۔ اس دن کی آمد سے پانچ روز قبل گانے والے مٹی کے برتن میں سبز خوشے اور گل سرشف ڈال کے روزانہ کسی بزرگ کے مزار پر جاتے ہیں، اور بسنت کی تہنیت نیز صاحب مزار کی مدح میں اشعار گاتے ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی ٹولیاں تماشے کے لئے ان کے ساتھ نکلتی ہیں، اسی طرح پری پیکر لولی، بھڑکیلے لباسوں میں ملبوس ہوکر قبروں پر جاکر رقص کرتے ہیں۔ ہر شہر کے بزرگوں کے مزاروں پر جاکر مطربوں اور لولیوں کے رقص وسرود کرنے کا مقصد تمام سال کے بابرکت گذر جانے کا شکریہ ادا کرنا ہوتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ اس دن تمام گانے والوں اور ناچنے والوں کا نیز تمام ہندوؤں کا لباس زرد رنگ کا ہو، لیکن شاہجہاں آباد اور اس کے اطراف کے کچھ لوگ اب پیلے لباس کو عار سمجھتے ہیں، البتہ بعضے لولی پہنتے ہیں، اور کچھ لوگ چھڑی اور چادر کو زرد رنگ لیتے ہیں لیکن پنجاب کے شہروں میں عورت اور مرد کیا ہندو اور کیا بازاری اور نوکر پیشہ مسلمان سب کے

سب پیلے لباس پہنتے ہیں، اور ہزاروں کی تعداد میں اکٹھے ہو کر شہر کے باہر جاتے ہیں اور کاغذ کے ہزاروں پیلے پتنگ زرد ڈوری سے ہوا میں اُڑاتے ہیں۔ پنجاب کے شہروں میں سے کوئی بھی شہر ایسا نہیں ہے جہاں یہ تماشا نہ ہوتا ہو، حالانکہ بہت زمانہ سے پنجاب کا علاقہ شاہی ملازموں کے قبضۂ اقتدار سے نکل گیا ہے اور وہ تمام ملک اور شاہ جہاں آباد کے قرب وجوار کے دوسرے شہر سکھوں کے قبضے میں چلے گئے ہیں جن کا ذکر نانک شاہ کے ضمن میں ہو چکا ہے۔

ہولی | یہ ماہ پھاگن کا آخری دن ہوتا ہے۔ جب وہ دن گذر جاتا ہے تو جا بجا لکڑیوں کے انباروں میں آگ لگائی جاتی ہے تاکہ صبح تک وہ جل کر خاک ہو جائیں اور اسے ہولی جلانا کہتے ہیں، ہولی سے دو مہینے پہلے ہی ہندو لوگ دف بجانا، گیت گانا اور رقص کرنا شروع کر دیتے ہیں اور جب ایک مہینہ باقی رہ جاتا ہے تو ان باتوں میں اور اضافہ ہو جاتا ہے، اور جب صرف پندرہ دن باقی رہ جاتے ہیں تو ڈھاک اور ٹیسو کے پھولوں کو پانی سے بھرے ہوئے مٹکوں اور دیگوں میں ڈال کر چولھوں پر چڑھا دیتے ہیں تاکہ پانی کے ابلنے سے ان پھولوں کا رنگ کھنچ کر پانی کو زرد کر دے، پھر اس پانی کو ان برتنوں سے چھوٹے چھوٹے برتنوں میں نکال لیتے ہیں۔ اُس راستے سے گذرنے والے ہر شخص کے سر پر چاہے وہ آشنا ہو یا بیگانہ دلشبر طیکہ ہندو ہو) رنگ ڈالتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کا تمام لباس رنگین ہو جاتا ہے، اور اونچی آواز سے کہتے ہیں کہ یہ شخص ہولی کا بھڑوا (قرمساق) ہے اور وہ شخص بھی ان لوگوں کے لئے یہی الفاظ استعمال کرتا ہے، اور دوسری شے جسے گلال کہتے ہیں وہ رنگ ڈالنے کے بعد ہاتھ میں بھر کر اس آدمی کے آگے پیچھے سے اس کے منہ پر مل دیتے ہیں، اسی طرح عبیر بھی ایک چیز ہوتی ہے جس کو گلال لگانے کے بعد آدمی کے منہ پر چھڑکتے ہیں۔ چھوٹے بچے اور بعضے جوان لوگ بھی چمڑے اور پیتل کی بنی ہوئی پچکاری کو جسے فارسی میں "آب دزدک" کہتے ہیں، ہاتھ میں لے کر راستوں پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور

کسی ہندو کو آتا ہوا دیکھ کر دور سے آئیے جی، آئیے جی، کہنے لگتے ہیں، پھر اس کے کپڑوں کو دور سے ہی رنگین کر دیتے ہیں اور بلند آواز سے کہتے ہیں۔ بھڑوا ہے بے، بھڑوا ہے بے وہ شخص اس لفظ سے بُرا نہیں مانتا چاہے کتنا ہی باعزت کیوں نہ ہو، اور وہ لڑکے کم قدر بازاریوں کے ہوں۔ ٹیسو رائے، جو دسہرہ کے دن بچّوں کا ایک کھیل ہوتا ہے، اسی سے بناتے ہیں، ٹُن بھی ہندوستان کا ایک درخت ہے، اور گلال، خشک سنگھاڑوں کے آٹے کو رنگین کر کے بنایا جاتا ہے، اور سنگھاڑہ ہندوستان میں بیلوں دار ایک پودے سے پیدا ہوتا ہے، اس کو کچّا یا اُبال کر کھاتے ہیں، وہ جسامت میں بندوق کے چھوٹے کلولہ کے برابر ہوتا ہے، اور اس کے اطراف میں کانٹے ہوتے ہیں۔ یہ پانی میں پیدا ہوتا ہے، خشکی میں نہیں۔ وہ پانی چاہے بارش کا ہو یا کسی تالاب میں جمع کیا گیا ہو۔ اس کا درخت دوسرے بیل دار درختوں کی طرح نہیں ہے بلکہ انگور اور چپّار کی طرح پھیلتا ہے، پچکاری سے مراد پیتل کی وہ نالکی ہے جس میں زرد رنگ کا پانی بھر کر اور ایک آلہ سے جو اس میں لگا ہوتا ہے، حرکت دے کر دور سے لوگوں پر چھڑکتے ہیں، اور چمڑے سے بھی چھڑکتے ہیں، اور صاحبِ مقدور لوگ قمقموں میں گلال بھر کر خوش اندام نوجوان عورتوں کی طرف پھینکتے ہیں۔ قمقمہ انار کے برابر ایک گول چیز ہوتی ہے جس کو کاغذ سے بھی باریک کانچ سے بناتے ہیں تاکہ جس کسی کو بھی لگے اُسے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ یہ قمقمے امیر زادے پری چہرہ عورتوں کے سینہ بند پہ مارتے ہیں اور دولت مند لوگ حوضوں اور گڑھوں میں بھی رنگین پانی بھرتے ہیں جن کی گہرائی قدِ آدم سے بھی زیادہ ہوتی ہے، اُس میں لوگوں کو غوطہ دیدیتے ہیں خصوصًا ماہ پارہ لولیوں اور ان کے سازندوں سے یہ مذاق کیا جاتا ہے۔

جواہر سنگھ بن سورج مل جاٹ کے وقت میں جس کی ظاہری جاہ وحشمت نے بڑے بڑے امیروں کی نیند حرام کر دی تھی، متھرا کے بازاروں میں اتنا گلال ہوتا تھا کہ

راستہ چلنے والے زانوؤں تک اس میں دھنس جاتے تھے، سورج مل ہندوستانی قوم جاٹ کے ایک صاحبِ شان و شوکت راجہ کا نام تھا، جس نے اپنی تلوار کے زور سے چند کروڑ روپیہ کی آمدنی کے ملک کو فتح کر کے اپنے قبضے میں کر لیا تھا، اور پختہ اور خام جنگی قلعے تعمیر کرائے تھے، اس کا خزانہ بادشاہوں کے خزانوں پر غالب تھا۔

بہر حال ہندو لوگ دو مہینہ تک روزانہ رنگین لباس پہن کر ہزاروں آدمیوں کا غول زرد رنگ سے بھرے ہوئے گھڑے اور پچکاریاں لے کر اور گلال اور عبیر کمر سے باندھ کر دف بجاتے اور گیت گاتے ہر شہر کے کوچہ و بازار سے نکلتے ہیں، لیکن ہولی کا یہ طریقہ برج کے باشندوں کا ہے جو کنہیا کا وطن اور مولد تھا۔ ہندوؤں کے نزدیک ہولی کے گیت گانے، دف بجانے اور ناچنے میں برج کے باشندوں سے بہتر کوئی دوسرا نہیں ہے۔ سب لوگ اپنے کو ان کا پیرو سمجھتے ہیں۔ برج کی عورتیں بھی جمع ہو کر گانے گاتی ہیں۔ اگر راستے میں کسی نوجوان عورت کا اس غول سے آمنا سامنا ہو جاتا ہے تو اسے گھیر کر چاروں طرف سے اس کے سینے اور ران اور جسم کے اعضا کی تعریف میں ہندی میں اشعار گانے لگتے ہیں، اور ناچتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے وہ عورت بھی اس گیت کے ساتھ رقص کرنے لگتی ہیں۔ اس زمانے میں دن رات بہروپ بھرے جاتے ہیں۔ کبھی خوب صورت نازک اندام لڑکے، عورتوں کا لباس اور زیورات پہنتے ہیں، اور کبھی عورتوں کو مردانہ لباس پہناتے ہیں، خصوصاً حرم سرا کی عورتیں مغل اور فرنگی مردوں کا روپ بھرتی ہیں، اور فارسی کے کچھ الفاظ مغلوں کے لہجے میں یا مصنوعی انگریزی الفاظ جو اس زبان اور لہجے سے ملتے جلتے معلوم ہوں، بولتی ہیں، کبھی ایک سبزی فروش بنتی ہے، دوسری اس کی بیوی، کبھی ایک جوگی بنتی ہے اور دوسری جوگن، جوگیوں کے بہروپ کے علاوہ بندر، کتا، بھیڑیا، گائے، ریچھ، شیر اور دوسرے جانوروں کی شکلیں اختیار کر کے آدمیوں کا تعاقب کرتی ہیں۔ اکثر ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ گاؤں اور شہر کے نووارد بچے اور جوان ریچھوں اور شیروں کی

مصنوعی شکلوں کو اصلی سمجھ کر ڈر کے مارے زمین پر لوٹنے لگتے ہیں اور مدد کے لئے چلاتے ہیں۔

مسلمان اور ہولی افغانوں اور بعض متعصب مسلمانوں کے علاوہ سبھی مسلمان دل کھول کر ہولی میں ہندوؤں کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ پنچ لوگ، پنچوں کے ساتھ، دولت مند دولت مندوں کے ساتھ اور جوان جوانوں کے ساتھ مل کر ہولی مناتے ہیں۔ جب ہولی جلانے میں تین دن باقی رہ جاتے ہیں تو زرد رنگ چھوڑ کر نالے کے کیچڑ عام طور پر بلا کسی تفریق کے اُچھالتے ہیں، چاہے اس کی زد میں ہندو ہو یا مسلمان، رذیل ہو یا شریف (بشرطیکہ وہ صاحبِ ثروت نہ ہو) کیوں کہ صاحب مقدور اپنے خدم وحشم کے ساتھ باہر نکلتا ہے، چاہے اس کا لباس رنگین ہو لیکن اسے آلودہ کرنے کی انھیں ہمت نہیں ہوتی، باقی ہر راہگیر کے سر اور صورت کو آلودہ کر دیتے ہیں۔ لیکن جس وقت فوج کا غول اس امیر کے دروازہ پر پہنچ جاتا ہے تو چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان بلکہ بادشاہ ہی کیوں نہ ہو، اِس کے علاوہ اس کے سامنے کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ ان کو نقدی دے دلا کر انھیں صرف رنگ پھینکنے پر راضی کر لے۔ اور دکن میں حاکموں اور رئیسوں کو سوار کرنے کے لئے گدھے لائے جاتے ہیں، اگر اس رئیس نے انھیں منشار کے مطابق زرِ نقد دے دیا تو خیر ورنہ اسے گھسیٹ گھسیٹ کر لاتے ہیں اور گدھے پر سوار کر دیتے ہیں۔ ہولی کے دنوں کی فحش باتیں معتبر نہیں سمجھی جاتیں۔ ہر شخص دوسرے کو جو جی چاہتا ہے کہہ ڈالتا ہے، وہ اشخاص جن کی طبیعت اس قسم کی مکروہات کو پسند نہیں کرتی اپنے گھروں کے دروازے بند کر کے اندر بیٹھ رہتے ہیں اور ہرگز باہر نہیں نکلتے۔ مگر اب انگریزوں کی حکومت میں یہ قدغن ہو گئی ہے کہ ہولی کا رنگ مسلمانوں پر نہ پھینکا جائے، بہر حال اس زمانے میں ہر مسلمان کے گھر پر روزانہ لولیوں کا رقص ہوتا ہے۔ اور رات کو اس میں بہرولپوں اور نقلوں کا مزید اضافہ کر دیا جاتا ہے۔

نواب آصف الدولہ مرحوم کے زمانے میں اس شہر (لکھنؤ) میں بڑی بے تکلفی سے ہولی

کا جشن منایا جاتا تھا۔ تمام دن رنگ اور گلال وعبیر اڑتا تھا اور رات کو لولیوں سے اختلاط ہوتا تھا۔ دریا کے کنارے ایسی روشنی اور آتش بازی ہوتی تھی کہ اس کا تماشا دیکھنے کیلئے قطب ستارہ بھی حرکت میں آجاتا تھا۔ بندگانِ عالی وزیر الممالک یمین الدولہ ناظم الملک نواب سعادت علی خاں بہادر مبارز جنگ کی مسند نشینی کے ابتدائی برسوں میں بھی ہولی کا ہنگامہ گرم ہوتا تھا، لاکھوں روپے نقد اور مرصع جواہر نگار زیور اور قیمتی لباس لولی عورتوں کو بطور بخشش مرحمت ہوتے تھے۔ اعلیٰ حضرت کی مجلس میں اکثر ایک ہزار نفر سنجاب اور زردوزی کے بنے ہوئے پُر تکلّف رنگین لباسوں میں ملبوس ہوکر نقش دیوار کے مانند کھڑے رہتے تھے۔ وہ لوگ بھی جن کو اس مجلس میں حاضر ہونے اور بیٹھنے کا حکم حاصل تھا رنگین لباس زیب تن کر کے حضور پرنور کے سامنے آتے تھے۔ کیا کھڑے رہنے والے کیا بیٹھنے والے سب لوگوں کو سرکار دولت مدار کی طرف سے کپڑے مرحمت ہوتے تھے۔ لیکن چوں کہ یہ عمل شانِ اسلام کے خلاف تھا، اس بنا پر بہت دنوں سے سرکار عالی نے اسے ترک کر دیا ہے اگرچہ نہ صرف نوکر پیشہ رذیل بلکہ تمام ہندو اور مسلمان چند متقی لوگوں کو چھوڑ کر باقی سب تعلیم یافتہ صاحبِ تمیز اور اہلِ متانت تک ہولی کے دنوں میں خودداری اور انسانیت کو خیرباد کہہ کر ایک دوسرے پر زرد رنگ اچھالتے اور ہر قسم کا بہروپ بھرتے ہیں، پھر ہر راہ رو کی خواہ وہ آشنا ہو یا بیگانہ، بے صرفہ گالی گلوج اور فحاشی سے تواضع کرتے ہیں، اور بعض صاحب مقدور لوگ اپنے گھروں میں یہ حرکتیں کرتے ہیں۔ لیکن کایتھوں کا فرقہ، جن کے حالات کے متعلق پہلے بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ ہندوؤں کے باقی تمام فرقوں سے زیادہ ان چیزوں کا اہتمام کرتے ہیں، بایں ریش وفش جو وہ رکھتے ہیں۔ شراب پی کر مستی کے عالم میں بہروپ بھرتے ہیں، پھر فارسی کی عبارتیں، گلستاں کے اشعار یا ولی دکھنی کے ریختہ کی غزلیں گا گا کر پڑھتے ہیں اور ایک دوسرے کی مجلس میں موسیقی پر بھی نوازش فرماتے ہیں اچھا ہے اس فن سے دور کا بھی علاقہ

نہیں رکھتے۔ پھر خود ہی بے خودی کے عالم میں اپنی صورت پر فریفتہ ہو کر فرش پر لوٹنے لگتے ہیں، اور اس حالت میں بھی لکنت کے ساتھ، جو نشے کی زیادتی کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ گانا نیم بسمل کی طرح تھوڑا تھوڑا زبان سے کہتے رہتے ہیں، لیکن یہ ہر شخص کا حال نہیں ہوتا۔ یقیناً بعض لوگ اس سے شرم محسوس کرتے ہیں۔ اور یہ شاذ کے ذیل میں ہے، خلاصہ کلام یہ ہے کہ اپنے مقدور کے مطابق ان دنوں وہ لوگ بہت زیادہ روپیہ صرف کرتے ہیں اس سے شاگرد پیشہ اور ہمسایوں کو بھی فیض پہنچتا ہے۔ چوں کہ روز اول ہی سے اس فرقے کے خمیر میں جواں مردی، مروت، سخاوت اور احسان شامل ہے، یہ روپیہ صرف کرنے، میں خواہ وہ کسی طریق سے ہو، اور دوسرے انسانوں پر اپنی برتری جتانے میں اور مسلمان امرا و شرفا، سے اپنی ہمسری کا اظہار کرنے میں اور اپنے ہم عصروں کے سامنے تفوق دکھانے کے لئے خرچ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

باب پانچواں

ہندوؤں کی رسمیں :-

معیارِ شرافت واضح رہے کہ کسی فرقے میں بھی اجلاف و اراذل کے رسوم و رواج نہ پہلے کبھی معتبر سمجھے گئے ہیں اور نہ آج قابلِ لحاظ ہو سکتے ہیں۔ یہاں پر صرف اربابِ شرافت و متانت کے رسوم و رواج کا ذکر اسی اصول کے تحت کیا جاتا ہے۔ درحقیقت ہندوؤں کے پانچ فرقوں کا شمار شرفا میں ہوتا ہے جو برہمن، کھتری، راجپوت، بیس اور کایتھ کے نام سے مشہور رہیں۔ چوں کہ کشمیری برہمنوں کے سوا باقی برہمن امرا کی سرکار میں نوکری پیشہ یا اہلِ دفتر، یا فرقۂ سپاہ میں نہیں سوائے معدود تعداد کے۔ بلکہ اِن سب کا ذریعۂ معاش غیر برہمن ہندوؤں کے لئے دعائے عمر و اقبال اور اُن کے گھروں میں گدائی کرنا یا طبّاخی اور صراحی برداری جیسی خدمات انجام دینا یا کم مرتبے کی دوسری صنعتوں سے معاش حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس سے روپیہ جمع کر کے وہ دکان داری کر لیتے ہیں اور اس سے بھی ترقی کی تو امرا، سے سود پر لین دین شروع کر دیا۔ مگر کشمیری برہمن سب کے سب رشید، صاحبِ تقریر و تحریر اور عقل و ذکا کے حامل ہوتے ہیں۔ اس لئے دوسرے برہمنوں سے بزرگی اور شرافت میں فوقیت رکھتے ہیں کیوں کہ ان میں دوکان دار اور گدا بہت کم پائے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے اعلیٰ پیشہ ور اسی فرقے کے لوگ ہوتے ہیں۔ لہٰذا کشمیری برہمنوں کے

پیشہ ور و ہنرمند دوسروں سے بہتر ہوتے ہیں۔ کھتریوں میں پورب کے باشندے سب کے سب اہلِ حرفہ اور اہلِ بازار ہیں۔ اور ان میں بعضے اپنی ثروت کی وجہ سے دولتمند ہیں۔ ملکی سرکار سے لین دین بھی رکھتے ہیں۔ اس فرقے میں نوکری پیشہ بہت کم لوگ ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ ملازم ہیں وہ بھی دفتروں میں ہیں، سپاہی نہیں ہیں، اور اگر کوئی ہے بھی تو خال خال۔ گویا نادر جو معدوم کے ذیل میں داخل ہے۔ اور پنجاب کے تمام کھتری اہلِ دفتر یا سپاہی یا عاملِ پرگنہ ہوتے ہیں، اِن میں رذیل پیشہ ور اور دکاندار پوربیوں کے مقابلے میں بہت ہی کم ہیں۔ اس صورت میں پنجابی، پوربیوں سے شریف تر ہوتے ہیں۔ پوربیوں میں فارسی جاننے والے بہت کم پائے جاتے ہیں۔ اور راج پوت یا تو راجا اور زمین دار ہیں یا زراعت پیشہ ہوتے ہیں۔ بازاری، اہل کار۔ (دفتری) یا نامرد تو شاذ ہی کوئی ہوتا ہوگا۔ اور بنیے یعنی اگروال، سراوگی اور ڈھوسر، اکثر یا تو دوکان داری کرتے ہیں یا گھر بیٹھے بڑے امراء سے لین دین کرتے ہیں۔ راج پوتوں کے برخلاف اس فرقے میں سپاہی پیشہ، نوکری پیشہ اور حساب داں بہت کم لوگ پائے جاتے ہیں، اور ان میں اہلِ حرفہ بہت کم ہوتے ہیں، مگر وہ لوگ جو اس فرقے کے باره گروہوں کے باہر ہیں، وہ بازاری ہوتے ہیں، نچلے درجہ کے پیشے کرتے ہیں۔ کالپی میں اس گروہ کے دو تین نفر جو معمولی سی اُجرت میں لوگوں کے کانوں کا میل نکالتے ہیں، ماتھر فرقے کے پائے گئے۔ مختصر یہ کہ شرافت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک نسبی اور دوسری حسبی۔ ہندو شرافتِ نسبی کو شرافتِ حسبی پر ترجیح دیتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو ایک صاحب فیل و پالکی کو اپنی لڑکی کا رشتہ ایک بازاری سے نہ کرنا چاہیئے۔ اور ہندوؤں میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ داماد تو دلالی کرتا ہے اور اس کا خسر ہاتھی کی سواری پر چلتا ہے یا اس کا سالا ایک بڑا امیر ہوتا ہے اور بہنوئی بزازی کی دوکان میں پڑا ہوتا ہے یا حلوائی کا خوانچہ کاندھے پر رکھے گلی کوچوں میں گشت لگاتا پھرتا ہے، مگر مسلمانوں میں شرافتِ حسبی معتبر سمجھی جاتی ہے، کیوں کہ ایک امیر

سید کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنی لڑکی ایک ایسے سید کے لڑکے سے منسوب کردے جو عطاری کی دوکان کرتا ہو۔ دوسرے حسبی پیشے تو کس شمار میں ہیں، ہندوستان کی تو یہی رسم ہے، ولایت کے مسلمانوں کے رسم ورواج اور طور وطریقہ کا مجھے پورا علم نہیں ہے کہ ان کا بھی یہی طریقہ ہے یا اس کے برعکس۔ چوں کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت ہے اور اسلام کے غلبہ کی وجہ سے تمام لوگ مسلمانوں کے مطیع وپیروکار ہیں۔ اس لئے ہندوؤں میں جو شخص کھانے پینے میں، تحصیلِ معاش اور حسنِ بیان میں مسلمانوں سے زیادہ قریب ہوتا ہے وہ زیادہ شریف سمجھا جاتا ہے۔ گویا معیارِ شرافت وہ ہے جس کے مسلمان پابند ہیں۔ اس لحاظ سے آتانیا اور کشمیری برہمنوں کے سوائے کھتری اور کایتھ لوگوں کی شرافت بیس اور راج پوت فرقے کی شرافت سے اعلیٰ اور ارفع ہے، کیوں کہ راجپوت لوگ فارسی سے متعارف نہیں ہیں اور ان کی زبان اور لباس شاہ جہاں آباد یا دوسرے مرکزی شہروں کے ساکنوں کی زبان ولباس سے مختلف ہے، اور بیس دوکان داری اور امراء سے لین دین کرنے کی بنا پر اِن سے کم تر ہیں، لہٰذا بیسوں، راج پوتوں، کھتریوں، برہمنوں اور پیشہ ور کایتوں، اہلِ حرفہ اور گداؤں میں شرافتِ نسبی تو برہمن اور نوکری پیشہ کایتھ کے برابر ہی ہوگی، مگر شرافت حسبی میں وہ کم سمجھا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ایک صاحبِ عزت فیل نشین کھتری نے اپنی لڑکی ایک دوکان دار کھتری سے منسوب کردی تو اسے پیشہ و برادری کے لوگوں میں یقیناً فوقیت حاصل ہو جاتی ہے اور وہ شرافت کا درجہ حاصل کرلیتا ہے کیوں کہ اسے خسر کی طرف سے شرافتِ نسبی حاصل ہو جاتی ہے، دلیل ظاہر ہے کہ عمائدِ اسلام میں سے کوئی بھی مسلمان کسی بازاری کی تعظیم کرنا تو درکنار اسے اپنی مجلس میں خوشی سے بٹھانا بھی پسند نہیں کرتا، تو یہ عقل سے کتنا مستبعد ہے کہ جب ایک جلیل القدر اور واجب التکریم ہندو کا داماد اپنے خسر کے ہم مرتبہ ذی اقتدار مسلمانوں کے سامنے آئے تو وہ لوگ اس سے تعظیم سے پیش آئیں۔ مختصر یہ ہے کہ اس فرقے کے اشراف اور غیر اشراف اصطلاحی شرافت

ترجمہ (۷)، ہفت تماشائے مرزا قتیل۔

کی رو سے، جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے قدیم رسومات میں یکساں ہیں اور جدید رسومات میں ایک دوسرے کی ضد۔

جدید رسمیں | چونکہ رسوماتِ جدید میں شرافت اور غیر شرافت کا فرق پایا جاتا ہے لہٰذا ان رسموں کو قدیم پر ترجیح دے کر ان کا بیان پہلے کیا جاتا ہے۔

غیر جماعت کے ہندوؤں کا، جن کو مہذب مسلمانوں کی صحبت میں رہنے کا اتفاق ہوا ہو، یہ دستور ہے کہ لڑکا صبح کو بیدار ہو کر اپنے والد کو سلام کرتا ہے چاہے وہ ایک ہی کمرے میں سوئے ہوئے ہوں، اور ان میں بعض تربیت یافتہ لڑکے اپنے باپ کو "آپ" سے مخاطب کرتے ہیں۔ جو کلمۂ تعظیم ہے، ورنہ عام طور سے دوسرے بالخصوص دلال اور دوکان دار "تو" یا "تم" کہتے ہیں، حالاں کہ رذیل مسلمانوں کی بھی یہی حالت ہے۔ لیکن اُن کو کوئی شریفوں میں شمار نہیں کرتا۔ اور یہ فرقہ شرافتِ نسبی کی رو سے مہذب اور شائستہ ہندوؤں کی برابری کا دم بھرتا ہے، اس گروہ کے اکثر لوگ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے نام کی ہنسلی اپنے بچوں کے گلے میں ڈالتے ہیں اور ان کی نیاز کا کھانا پکواتے ہیں۔ اور ان میں سے بیشتر لوگ شیعی عقیدہ کی طرف مائل ہو کر اپنے بچوں کے نام کا تعزیہ مسلمانوں کے گھروں سے اٹھواتے ہیں، کچھ لوگ صوفیوں کے عقائد کی پیروی کر کے اپنے بھائیوں سے چھپ کر مسلمانوں کو عرس کے لئے روپیہ دیتے ہیں اور کسی چشتیہ، قادریہ یا سہروردیہ بزرگ کا عرس کراتے ہیں، ان میں سے کچھ لوگ اپنی عورتوں کو پردہ میں بٹھاتے ہیں اور مسلمانوں کی تقلید میں انھیں چوپالہ کی سواری میں اپنے رشتہ داروں کے یہاں بھیجتے ہیں۔

شاہ مدار کے نام کی چوٹی | اور شاہ مدار کی نذر کے لئے اپنے بچوں کے سر پر چوٹی رکھتے ہیں۔ جب بچہ اس عمر کو پہنچ جاتا ہے جس کی نیت انھوں نے چوٹی رکھواتے وقت کی تھی تو اسے شاہ مدار کے مزار پر لے جاتے ہیں جو مکن پور میں واقع ہے اور وہاں جا کر اس کے بالوں کو منڈواتے ہیں اور دیگوں میں نذر کا کھانا پکوا کر مساکین، وغربا کو کھلاتے ہیں بعد ازیں اس بچے

کی موت سے بے خوف ہو جاتے ہیں۔

شاہ مدار | شاہ مدار کے حالات کے بارے میں مختلف روایات سننے میں آتی ہیں، بعضے ان کو سید بتاتے ہیں، مگر یہ بات بالکل غلط ہے۔ اس روایت کے منکروں کا کہنا یہ ہے کہ وہ حلب کے یہودیوں میں سے تھے، مدت کے بعد شرفِ اسلام سے مشرف ہوئے اور درویشوں کی جماعت میں شامل ہو گئے۔ چونکہ ان کے سر میں فنافی اللّٰہی کا سودا تھا اس وجہ سے اہل دنیا اور شریعت کے مقلدوں سے ان کو کوئی سروکار نہیں رہا تھا۔ ہندوستانی جوگیوں اور دوسرے فقراء سے تعلیمِ باطنی حاصل کی تھی، اکثر وہ زمین پر پڑے رہتے تھے، اور فرشِ خاک ان کا بستر تھا۔ ایک اور جماعت دوسری روایت بیان کرتی ہے، لیکن بعض لوگوں کے نزدیک تمام روایتوں اور اقوال میں یہی روایت زیادہ قوی ہے کہ وہ ایک یہودی تھے۔ مکہ کے سفر میں سید اشرف جہانگیر، جن کا مزار فیض آباد اور بنارس کے مابین کچھوچھ میں واقع ہے اور خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی اور شاہ مدار ہم عصر تھے۔ وہ امیر تیمور صاحبِ قرآن کے ہم عصر تھے۔ کچھوچھ ایک مقام کا نام ہے۔ مختصر یہ کہ شاہ مدار کی خاک نشینی اور تجرد کی وجہ سے شرافت کی قیود سے آزاد اور جاہل لوگ نیز مسلمانوں میں سے ضعیف عقیدے کے اور گمراہ لوگ خصوصاً پیشہ ور رذیل جیسے سبزی فروش، جلاہے، بھٹیارے، تجارت پیشہ اور رنگریز اور اسی طرح کے لوگوں نے جو اس کے معتقد تھے، انھیں مکن پور میں دفن کر دیا۔ بعضوں کے نزدیک ان کی قبر حلب میں ہے اور مکن پور میں صرف حجرۂ عبادت ہے۔ لیکن یہ روایت کمزور ہے۔ مختصر یہ کہ اپنی حیات میں وہ شریعت اور متانت کی پابندیوں سے آزاد تھے، اور دوسرے صوفیوں کے برعکس ان کا کسی صوفیوں کے خانوادہ سے بھی تعلق نہ تھا، حالاں کہ اہل شریعت اس بات کو بھی حق نہیں سمجھتے ہیں۔

شاہ مدار اور مسلمان | بہر حال ان سے کسی سلسلے کا آغاز نہیں ہوا، لیکن عزت دار لوگوں کے سوا رذیل اور کم قدر مسلمان جوق در جوق ان کے مزار کی پرستش کے لئے جاتے ہیں اور رذالت

اور جہالت کی وجہ سے ان کو مرتبہ میں رسول اور ائمہ اسلام سے بھی بالاتر سمجھتے ہیں بلکہ خدا کے برابر پہنچا دیتے ہیں، چنانچہ آج تک ہر سال دور دراز کی مسافتیں طے کر کے سیاہ جھنڈے اٹھائے ہوئے ہزاروں مرد عورت، بچے بوڑھے، جوان، جوق درجوق مکن پور آتے ہیں۔

اس زمانے میں جہاں تک نظر جاتی ہے چاروں طرف یہی زائرین اور نچلے طبقے کے لوگ اور اس سلسلے کے لاکھوں فقرا، نظر آتے ہیں، کچھ پیشہ ور مسلمان اور بازاری ہندو بھی اس مجمع میں عقیدت کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو اس سلسلے کے مریدوں کی تعداد سکھوں کے پیشوا نانک شاہ پنجابی کے معتقدوں سے زیادہ ہوگی۔ جس طرح ہر شہر کے امرا، اور بازاری لوگوں میں نانک شاہ کے مرید پائے جاتے ہیں اسی طرح شاہ مدار کے مرید بھی جگہ جگہ ملتے ہیں، بلکہ یہ کلیہ سا بن گیا ہے اگر کہیں اثنائے راہ میں کسی جگہ فقیر کا تکیہ ملے، یہ آدمی خواہ کسی قصبہ یا دیہات کا ہو، غالب ہے کہ وہ تکیہ مداری کا ہو اور وہ فقیر شاہ مدار کا مرید ہو۔ اور معدودے چند سنجیدہ اور صاحب علم مسلمانوں کے علاوہ اس گاؤں یا قصبے کے تمام مسلمان چاہے وہ بازاری ہوں یا خانہ نشیں سب شاہ مدار کے مرید اور غلام ہوں گے۔ شاہ مدار کا نام بدیع الدین تھا اور عربی میں مدار کے معنی قرار گاہ کے ہیں اور نجومیوں کی اصطلاح میں ستاروں کے دورہ کرنے کی جگہ کو کہتے ہیں اور صوفیا کی اصطلاح میں یہ قطب کے مراتب میں سے ایک مرتبہ کے ہیں۔ القصہ شاہ مدار کی درگاہ کے مجاور روزانہ علی الصباح تیار ہو کر چاروں طرف قافلوں کے راستے میں بیٹھ جاتے ہیں جب کوئی قافلہ دور سے آتا ہوا دکھائی دیتا ہے تو دوڑ کر ان کے قریب پہونچ جاتے ہیں۔ اگر قافلے کے لوگ مسلمان ہوئے تو انھیں اس طرح سے شاہ مدار کی زیارت کے لئے ترغیب دیتے ہیں کہ مرتضیٰ علیہ السلام، حسن وحسین اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سب القاب مدار صاحب ہی کے ہیں۔ اگر ہندو ہوئے تو کہتے ہیں کہ رام، اوتار، کنہیا جی اور بھوانی یہ سب کے سب شاہ مدار ہی کے روپ ہیں، آیئے اور زیارت کیجیے اور جو دلی تمنا ہو یہاں

مانگے، جلد ہی حاصل ہو گی، مکن پور نامی ایک قصبہ ہے جہاں شاہ مدار کا مزار ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ عقیدۂ راسخ کے ساتھ شاہ مدار کی پرستش زیادہ تر پورب کے ہندوؤں میں اور خاص طور سے کابیوں کے فرقے میں ہوتی ہے۔

سرور سلطان | پنجاب کے ہندو سرور سلطان سے عقیدت رکھتے ہیں۔ مزار ملتان کے قریب نبگاہ نامی گاؤں میں ہے۔ شاہ مدار کی طرح سرور سلطان بھی رذیل مسلمانوں اور شریف ہندوؤں کے حاجت روا سمجھے جاتے ہیں۔ بعضے جہلاء اُن کو بھی اہلِ سادات میں شمار کرتے ہیں، لیکن اس بیان میں کوئی اصلیت اور صداقت نہیں ہے۔ اور شرفاء کی ایک تعلیم یافتہ جماعت اس بات سے متفق ہے کہ خواجہ مودود چشتی، جو خانوادۂ چشتیہ کے بزرگوں میں سے تھے، اور خواجہ معین الدین چشتی رح کا سلسلہ چند واسطوں سے ان تک پہنچتا ہے، وہ ایک قطب الاقطاب کے مرتبے پر فائز تھے، یعنی اگر کسی مقام کا قطب فوت ہو جاتا تو خواجہ ہی کے حکم سے وہاں دوسرا قطب مقرر کیا جاتا تھا۔ ان کے زمانۂ حیات میں سلطان سرور چوروں کے گروہ میں شریک تھے۔ روایت ہے کہ ایک رات سرِ شام ہی سے انھوں نے خواجہ کی خانقاہ کی چھت میں نقب لگانا شروع کیا۔ لیکن انتہائی کوشش کے باوجود صبح تک بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے، اور نقب لگانے کا اوزار بھی ٹوٹ گیا۔ اسی اثناء میں خواجہ کے ایک مرید نے مراقب ہو کر عرض کیا کہ اس وقت ملتان کے قطب کا انتقال ہو گیا، اس کی جگہ کسی دوسرے قطب کا تقرر ہونا ضروری ہے۔ خواجہ کو از روئے کشف چور کا آنا اور ساری رات محنت کرنا معلوم تھا۔ انھوں نے اپنے مرید سے کہا کہ یہ غریب کسی نفع کی توقع لے کر یہاں آیا تھا۔ محنتِ شاقہ کے باوجود اس کی ناکامی دیکھ کر دل نہیں چاہتا کہ وہ اس دروازہ سے خالی ہاتھ واپس جائے۔ رحم کا تقاضا یہی ہے کہ اس کو ملتان کا قطب مقرر کر دوں۔ مرید نے کہا جیسا آپ مناسب خیال فرمائیں۔ الغرض سلطان سرور کو ملتان کا قطب مقرر کر دیا گیا۔ ملتان کے بعضے شرفاء خصوصاً شیخ شہاب الدین

سہروردی کے مرید شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے روضۂ مبارک کے مجاوروں کا کہنا ہے کہ بنگاہ میں ہرگز کوئی قطب دفن نہیں ہیں بلکہ اس گاؤں کے باشندوں نے اس جگہ ایک چمار کا سر دفن کر رکھا ہے۔ حقیقت کا علم اللہ ہی کو ہے۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ ان دونوں روایتوں میں کون سی قرینِ صحت ہے۔ بظاہر دوسری روایت میں عداوت کی بنا پر جھوٹ کا احتمال ہے، کیوں کہ سلطان سرور کے مزار کے مجاوروں کو جس قدر روپیہ ان کے عقیدت مندوں سے حاصل ہوتا ہے۔ بہاء الدین زکریا ملتانی کے مزار کے مجاوروں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا ہوگا۔ چوں کہ ہم پیشہ سے رشک کرنا کوئی نئی بات نہیں بلکہ پرانی رسم ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ اول الذکر صوفی کے مقبرے کے مجاور جھوٹے نہ ہوں۔ بہر حال اس گتھی کا سلجھانا ان کے عقیدت مندوں کو مبارک رہے۔ ہمیں ان باتوں کی تحقیق سے کوئی سروکار نہیں۔

مسلمان اور سرور سلطان البتہ جو کچھ مشہور ہے اور دیکھنے میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ جاہل اور رذیل مسلمان پنجاب کے ہندو شرفا سب کے سب ارادت اور اخلاص سے ان کے آستانے پر سر ٹیکتے ہیں۔ سلاطین تیمور کے تسلط سے قبل کے ہندوستان کے بادشاہوں میں سے کسی نے ان کے مزار پر دو بدخشانی لعل بھی بطور نذرِ عقیدت پیش کئے تھے، اور اسی دن سے ان کا لقب پیر صاحبِ لعل ہوگیا۔

فرقہ براہی اور لُڈی چنانچہ آج تک رذیل مسلمانوں کا ایک فرقہ براہی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ لوگ بڑی عقیدت کے ساتھ ڈھول بجا بجا کر اور ان کا نام گا گا کر پڑھتے ہوئے رقص کرتے ہیں اور سامعین کو بھی نچاتے ہیں۔ پنجاب میں اسی ناچ کو لُڈی کہتے ہیں۔ اس گانے میں یہ تاثیر ہے کہ اکثر ورد مند رذیلوں اور جاہل شریفوں پر رقت کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پنجاب میں جب کسی ہندو لڑکے کی شادی ہوتی ہے تو دو براہی اس کے مکان کے صحن میں آ کر دولھا اور دلہن کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ڈھول بجانا اور گانا شروع کر دیتے ہیں اور جب سرور سلطان کا نام ان کی زبان پر آتا ہے تو پیر اٹھا کر ناچنے

لگتے ہیں، اور جب رقص کا بازار گرم ہو جاتا ہے تو ہندو لڑکا اور اس کی بیوی دونوں اس لڈی میں پراہی کی آواز پر رقص کرتے ہیں۔ ان کے عقیدہ کے مطابق یہ بہت اچھا شگون ہے۔

پراہیوں کے گانے میں تین ہی موضوع ہوتے ہیں یا تو سرور سلطان کی مدح جو پیر لعل تھے یا پھیرو نامی ایک برہمن کا واقعہ بیان کرتے ہیں جو ابتداء میں نانِ شبینہ تک کو محتاج تھا اور بالآخر سرور پر عقیدۂ راسخ کی وجہ سے اس نے ترقی حاصل کی، یا نواب زکریا خان المشہور بخان بہادر ناظم لاہور و ملتان ابن نواب عبد الصمد خاں بہادر دلیر جنگ کے عدل و انصاف کا بیان ہوتا ہے۔ پھیرو، ایک ہندو کا نام ہے اور بعض معتبر راویوں سے سنا گیا ہے کہ معز الدین جہاں دار شاہ جب اپنے والد شاہ عالم بہادر شاہ بن اورنگ زیب عالم گیر خلد مکاں کی وفات کے بعد تخت شاہی پر متمکن ہوا تو اس نے سرور کے نوبت خانے کے لئے چاندی کے نقارے بھیجے تھے۔ اس بات سے عوام میں سرور سلطان کا اعتقاد اور بھی بڑھ گیا۔

سرور سلطان اور ہندو سرور کے ہندو مرید اپنے مذہبی پیشواؤں کو بھی بزرگ مانتے ہیں لیکن درگاہِ الٰہی سے اپنی حاجت روائی کے لئے سرور ہی کا وسیلہ تلاش کرتے ہیں، اور دنیا میں انھیں جو بھی ترقی نصیب ہوتی ہے اسے سرور کی عنایت ہی کا ثمرہ سمجھتے ہیں۔ ہر جمعرات کو ان کی نیاز کا حلوا تقسیم کرتے ہیں اور اس دن ہر گھر کی کسی کوٹھری میں ایک دیا بھی جلاتے ہیں، یہاں تک کہ شاہ جہاں آباد میں بھی کسی کسی ہندو کے یہاں کوٹھری میں سرور کے نام کا چراغ روشن پایا جاتا ہے۔ سرور کے مریدوں کا اعتقاد ہے کہ اگر کوئی ہندو جو سرور کا معتقد ہو بغیر ذبح کیا ہوا کسی جانور کا گوشت قصداً کھالے تو کسی نہ کسی بلا میں ضرور مبتلا ہو جاتا ہے اور اگر سور کا گوشت کھا لیتا ہے تو کوڑھی ہو جاتا ہے یا اس کے جسم پر ایک پھوڑا نکل آتا ہے جس کی بدبو سے جسم میں کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ بہت جلد مر جاتا ہے۔

سرور سلطان کی چھڑیاں جس طرح نچلے طبقے کے مسلمان نزدیک و دور سے جھنڈے لے کر شاہ مدار کے مزار پر ہر سال جمع ہوتے ہیں اسی طرح ہر سال ہر شہر کے باہر سرور کے نیزے بھی

اٹھائے جاتے ہیں اور پراہی ہر جھنڈے کے نیچے ڈھول بجاتے ہیں اور اپنے پیر کی مدح میں گیت گاگا کر ناچتے ہیں، اور دوسروں کو بھی نچاتے ہیں، اور تمام لوگ خواہ ہندو ہوں یا مسلمان جوق در جوق تماشہ دیکھنے جاتے ہیں. نیز تجارت پیشہ لوگ اپنے منافع کی امید میں چھوٹی بڑی دوکانیں نئے نئے انداز سے سجاکر اُن میں انواع واقسام کی مٹھائیاں اور دیگر اشیائے خوردنی چلتے ہیں، اور کچھ لوگ اپنی دوکانوں پر شامیانے بھی لگاتے ہیں، بہرحال اسی ہائے ہو میں ساری رات گزر جاتی ہے. یہ لوگ بنگاہ کے لئے روانہ ہوتے ہیں، لیکن سارا مجمع یہ سفر اختیار نہیں کرتا کیوں کہ جو تماشہ بیں ہیں خواہ وہ معتقد ہوں یا غیر معتقد، شہر کو واپس چلے جاتے ہیں اور بعض دوکان دار بھی اپنی چیزوں کو فروخت کر کے اُن کے ساتھ ہی واپس آجاتے ہیں، لیکن پراہی اور حاجت مند سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں اور کچھ دوکان دار بھی منافع کی غرض سے ان کے ساتھ ہو لیتے ہیں. بنگاہ کو جانے والے زائرین کی تعداد کا اندازہ صرف ایک ہی شہر سے کر لینا چاہیئے. یعنی ایک شہر کی آبادی کو جس میں پراہی اور سرور کے معتقدین اور میلے میں دوکان لگانے والے ہوتے ہیں ان کے مجموعے کو ایک ہزار سے ضرب دینا چاہیئے. کوئی بڑا شہر اس کی آبادی اور کوئی بڑا لشکر اس کے ہنگامے اور رونق کو نہیں پہنچ سکتا ہندوستان میں یہ مثل مشہور ہے کہ اگر رذیلوں اور اجلافوں کا مال پیر نہ کھائیں تو یہ لوگ شرفار کو حقارت کی نظر سے دیکھیں گے اور انھیں خاطر میں نہ لائیں گے. ان فرقوں کے لوگ سال بھر میں جو کچھ کماتے ہیں وہ سارا امکن پور، بنگاہ اور بہرائچ میں، یہ ہندوستان میں ایک قصبہ ہے جہاں مجہول النسب سالار مسعود غازی کا مزار واقع ہے، صرف ہو جاتا ہے۔

سالار مسعود غازی اور مسافت کی دوری کی وجہ سے بعضے اجلاف کا تو تمام سال اِن مقاموں کی آمد و رفت ہی میں گزر جاتا ہے. بنگاہ کو جانے والے سرور پرست ہندؤوں کی بہلیوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے. بہلی، رتھ کی طرح ایک چیز ہوتی ہے جو لکڑی کے دو گول پہیوں پر قائم ہوتی ہے۔

سالار مسعود کی شخصیت بھی شاہ مدار اور سرور سلطان کی طرح ہے، اور کسی بات میں ان سے کم نہیں کہا جا سکتا، پنجاب کے رذیل ہندو اور مسلمان جو سرور سے اعتقاد رکھتے ہیں وہ سرور کی جھوٹی قسم نہیں کھاتے، یہی حال میواتی اور پورب کے باشندوں کا شاہ مدار اور سالار مسعود کے ساتھ ہے۔

سالار کو سید سالار کہتے ہیں، اور انھیں جناب محمد بن حنفیہ کی اولاد میں بتاتے ہیں، انھیں سلطان محمود سبکتگین کا بھانجا بھی کہا جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ وہ اپنے ماموں کے لشکر کے سپہ سالار تھے اور بادشاہ کے حکم سے انھوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا تھا۔

چیتلی قبر ان کے ساتھیوں نے مختلف جگہوں پر شہادت پائی۔ شاہجہاں آباد میں ترکمان دروازے کے قریب اعظم خاں مرحوم خوش طعام کی حویلی کے متصل ایک منقش قبر جو چیتلی قبر کے نام سے مشہور ہے یہ سالار مسعود کے ایک ساتھی سید روشن علی کی قبر بتائی جاتی ہے چیتلی مونث سماعی ہے۔ اور شاہجہاں آباد کی زبان (اردو) میں ہر منقش چیز کو چیتلی کہتے ہیں۔

سالار مسعود کی شہادت خلاصہ یہ ہے کہ سالار مسعود کافروں سے جنگ و جدال کرتے ہوئے بہرائچ پہنچ کر شہید ہوئے تھے۔

سالار مسعود کی شادی اور بیان کیا جاتا ہے کہ اودھ سے ایک منزل کے فاصلے پر رُدَولی نامی قصبہ میں سالار مسعود کی منگنی ہو چکی تھی۔ ہندوستانی رسم کے مطابق عقد کی رات سے ایک ہفتہ پہلے دولھا کے ہاتھ میں ریشم کا ایک دھاگا باندھا جاتا ہے۔ وہ ان کے ہاتھ میں بھی باندھا گیا تھا۔ اتفاق سے عقد کی شب کو ہی یا اس سے دو تین دن پہلے کافروں کے غلبے کی خبر سن کر وہ قصبے سے نکل گئے اور جنگ میں کام آ گئے، اسی وجہ سے ہر سال کی اسی رات کو ان کا پلنگ اور بستر قصبہ ردولی میں ایک مقفل حجرے سے باہر لایا جاتا ہے اور بہت سے لوگ اس کی زیارت کرتے ہیں لیکن جیسا اجتماع بہرائچ میں دیکھا گیا ہے، ردولی میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہوتا۔

سلطان محمود | سلطان محمود یعنی سالار مسعود کے والد ساہو سالار کی قبر لکھنؤ سے دس منزل کی دوری پر سترک نامی موضع میں بتائی جاتی ہے۔ سالار مسعود کی زیارت کو جانے کے ایام میں یہاں بھی بڑا مجمع ہوتا ہے اور تین دن تک ان کے آستانے پر عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ گرد و نواح کے امراء اپنی حاجتوں کے بر آنے پر ان کے مزار پر نیا غلاف چڑھاتے ہیں۔ اور اس عمل کو عقبیٰ کے لئے سرمایۂ سعادت اور دنیوی ترقیوں کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔

مختصر یہ کہ مسلمان فقیر اُن کو شہید اور دوسرے اُن کو ولی کہتے ہیں، اجلاف مسلمانوں کی طرح ہندو بھی اپنے بچوں کے سر پر ان کے نام کی چوٹی رکھتے ہیں اور مقررہ مدت کے اختتام کے بعد بہرائچ جا کر اسے اترواتے ہیں۔ اور پورب کے بعض شرفاء کا سلسلۂ نسب سالار مسعود کے رفقاء تک پہنچتا ہے یعنی یہاں کے سیدوں اور شیخوں کے آباو اجداد ان کے ہمراہ ہندوستان آئے تھے۔ خدا کرے کہ یہ باتیں صحت و صداقت پر مبنی ہوں ورنہ اِن باتوں کے جھوٹ ثابت ہونے سے اکثر معزز خاندانوں کے شجرہ ہائے نسب میں فرق پڑ جائے گا۔

شیخ سدّو | بعض نچلے طبقے کے مسلمان اور کچھ اسی طرح کے ہندو شیخ سدّو کی پرستش بھی کرتے ہیں قبیلوں کے نزدیک شیخ سدّو ایک مجہول النسب شخص ہے اور یہ سالار مسعود اور شاہ مدار اور سرور سلطان سے بھی گئی گزری شخصیت ہے۔ ان کی نذر کے لئے زیادہ تر بکرا اور بکری ذبح کر کے پکائی جاتی ہے۔ یہ کھانا ہر شخص کو نہیں کھلاتے کیوں کہ جو ایک مرتبہ ان کی نذر کا کھانا کھا لیتا ہے اس کی گردن پر سوار ہو کر شیخ سدّو ہر سال اس سے نذر کا بکرا وصول کرتے ہیں یعنی اُس پر واجب ہو جاتا ہے کہ وہ سدّو کے نام کا بکرا ذبح کر کے ان کے معتقدوں کو کھلائے۔ آدمی کی گردن پر سوار ہونے سے مراد یہ ہے کہ جب ان کی نذر کے ایام قریب آجاتے ہیں تو اگر وہ شخص جس نے ان کی نذر کا کھانا کھایا ہوتا ہے نذر کا بکرا چڑھانے کا خیال نہیں رکھتا تو اس کا سر خود بخود چکر کھانے لگتا ہے اور دونوں آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں اور معدے میں ہلکا ہلکا درد شروع ہو جاتا ہے اگر وہ نذر پوری کر دے تو بھلا چنگا ہو جاتا ہے

ورنہ یہ بیماری بڑھتی ہی رہتی ہے، چوں کہ انسان کا واہمہ خلاق ہوتا ہے اور لوگ توہم پرست ہیں اس لئے اُن اجلاف کا ایسے مصائب میں گرفتار ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے حیرت کی بات یہ ہے کہ رذیل عورتیں غسل کے بعد بھڑکیلا لباس پہن کر اور عطر پھلیل لگا کر سر کو دھننا شروع کر دیتی ہیں ——!

اور دوسری عورتیں ان کے اردگرد ڈھولک بجا کر ایک خاص لے میں مدح کے اشعار گاتی ہیں، پھر یہ عورتیں ساز بجانے والی عورتوں کے ساتھ اپنے سروں کو جھماتی ہیں، یہ سر ہلانا اس بات کی علامت ہے کہ شیخ سدّو ان کے اندر حلول کر رہے ہیں اور وہ دنیا و ما فیہا سے بے خبر ہو جاتی ہیں، اور جب سر جھماتے جھماتے ہوش میں آتی ہیں اور تھوڑا سا دم لیتی ہیں تو ساز بجانے والی اور دوسری عورتیں اکٹھا ہو کر اور بعض مرد بھی جو مرتبہ عقل میں عورتوں کے برابر ہوں خواہ ہندو ہوں یا مسلمان اُن سے، جو شیخ سدّو کی ہیئت اختیار کر لیتی ہیں اپنی مراد مانگتے ہیں، اور آنے والے واقعات مثل بادشاہِ عادل کے تخت نشین ہونے یا ملک پر دشمن کے غلبہ پانے یا سفر پر گئے ہوئے کسی عزیز کی موت و زندگی کے متعلق باتیں دریافت کرتے ہیں، اور ان کے کہنے کو الہام غیبی اور وحی آسمانی جانتے ہیں، اور بعضے ایسی عورتوں کے متعلق بدکار اور فاحشہ ہونے کا گمان رکھتے ہیں۔ لیکن یہ بات کلیہ کے طور پر صحیح نہیں ہو سکتی۔ ہاں ان میں سے کچھ ایسی ضرور ہوتی ہیں۔ کیوں کہ تمام عورتوں کا یہ حال نہیں ہوتا۔ شریف مسلمانوں کے گھروں میں بھی شیخ مذکور عورتوں میں حلول کرتے ہیں۔ لہٰذا جو عورت فاحشہ ہے وہ اگر ان چیزوں سے پرہیز بھی کرے تو بھی اس میں ان خرابیوں کے سرایت کرنے کا احتمال ہے۔ لیکن اگر عفیفہ ہے تو ہرگز اس کے بارے میں ایسا گمان نہیں ہو سکتا خواہ وہ حماقت اور نادانی کی بنا پر شیخ سدّو کا بہروپ بھرتی ہے، مختصر یہ کہ شیخ سدّو کے معتقدوں کا کہنا ہے کہ وہ علم تکسیر کے عامل تھے اور اس فن میں پوری دسترس رکھتے تھے نیز بہت زیادہ مرتاض اور ولی اللہ آدمی تھے، ان کی بزرگی اور فضیلت کے منکروں کا کہنا

ہے کہ وہ فاسق تھے اور روم کے بادشاہ کی لڑکی کو اس کے پلنگ اور بستر سمیت موکلوں کے کاندھوں پر اٹھوا منگواتے تھے اور اس پری چہرہ کے وصل سے رات بھر لطف اندوز ہوتے تھے۔ وہ شہزادی روز بروز غم میں گھلی جاتی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد اُس نے اپنی ماں کو اس بات سے مطلع کیا اور ماں نے یہ بات بادشاہ تک پہنچائی۔ بادشاہ نے شہزادی کے خواب گاہ پر پہرہ بٹھا دیا تاکہ تمام رات جاگ کر شہزادی کے پلنگ کے اٹھالے جانے والوں کو گرفتار کریں، لیکن وہ موکلوں میں سے کسی کو نہ دیکھ سکے۔ بس اتنا نظر آتا تھا کہ شہزادی کا پلنگ ہوا کے کاندھوں پر اڑا جاتا ہے۔ اس امر میں پوری کوشش وسعی کے باوجود جب ان لوگوں کو اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی تو انھوں نے بادشاہ کی خدمت میں حقیقت حال عرض کی۔ بادشاہ نے عقلمندوں کو بلوا کر اس مسئلہ کے متعلق مشورہ کیا۔ انھوں نے عرض کیا کہ اِس وقت اس سے بہتر کوئی اور دوسری صلاح نہیں ہو سکتی کہ ملکۂ آفاق رات کے وقت گرم جوشی اور اختلاط کی حالت میں اُس سے اُس کے شہر کا نام پوچھ لے۔ اور پھر بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا جائے، پھر کچھ لوگوں کو مناسب انعام کا لالچ دے کر اس شہر میں بھیجا جائے۔ وہ لوگ بظاہر اس کے مریدوں یا شاگردوں کے زمرے میں داخل ہو کر اس کے مسکن میں سکونت اختیار کرلیں اور اس فکر میں رہیں کہ جب وقت وہ بدبخت جنابت کی حالت میں ہو یا آرام کے لئے جائے تو اس پر قابو پا کر اس کا کام تمام کر دیں۔ بادشاہ نے عقلمندوں کی یہ رائے بہت پسند کی اور اسی پر عمل پیرا ہوا۔ بالآخر ایک روز حالتِ جنابت میں ان لوگوں نے شیخ کو واصل بہ جہنم کر دیا، اور اس بلا سے شہزادی کو نجات مل گئی۔ بہر حال اس حکایت کے ناقل بھی شیخ کی فضیلت کے انکار کے باوجود عقل و دانش سے ہزاروں فرسنگ کے فاصلے پر ہیں۔ عجب نہیں کہ ان کی عورتیں بھی شیخ کا قالب اختیار کرتی ہوں۔ شیخ سدو کا مزار امروہہ میں ہے۔

ہندوؤں کی بعض ادر رسوم ہندو دروزہ کو برت کہتے ہیں اور برت کی دو قسمیں ہیں۔ نرجل،

کہ اس طرح کا روزہ رکھنے والا دوسرے دن کی صبح تک نہ کچھ کھاتا ہے نہ پیتا ہے، پھر صبح سے شام تک روزہ رکھتے ہیں یا نصف النہار یا قریب ظہر کے (سہ پہر) افطار کرتے ہیں۔ افطار کے بعد روزہ دار کی غذا مٹھائی جو کہ سنگھاڑہ کی بنی ہوتی ہے اور جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے یا شکر کے پیڑے ہوتے ہیں۔

موت کی رسمیں جب کوئی شخص مرتا ہے تو اس کے لڑکے پر یہ واجب ہے کہ وہ اسی وقت اپنے سر، ڈاڑھی اور سبل کے بال بالکل منڈوائے، پھر اپنے عزیزوں اور پڑوسیوں کے ساتھ باپ کے جنازہ کو کاندھے پر لے کر دریا کے کنارے جلانے کی غرض سے جائے، اور اگر ماں مرے تو اس صورت میں بھی لڑکے پر یہی عمل واجب ہوتا ہے۔ عرفِ عام میں یہ لوگ جنازہ کو ارتھی کہتے ہیں اور بال منڈوانے کی رسم کو بھدرہ کہا جاتا ہے۔ ہندوؤں میں ماتم کی رسم چار دن تک چلتی ہے۔ برخلاف مسلمانوں کے جن کے ہاں تیسرے دن رسومِ ماتم ختم ہو جاتی ہیں۔ جس کا باپ مرا ہو اس پر واجب ہے کہ ماتم کے ان چار دنوں میں، اگر کوئی خاص وجہ مانع نہ ہو تو نہ سر پر ٹوپی رکھے نہ دستار باندھے* جس سے ستر ڈھکا رہے، اور جوتا بھی نہ پہنے بلکہ کنکریوں اور کانٹوں سے پیروں کی حفاظت کے لئے صرف لکڑی کی کھڑاؤں استعمال کرے۔ جب ساٹھ سے زیادہ اور ستر کے لگ بھگ عمر کے بوڑھے باپ کا انتقال ہو اور اس کے پوتے یا پرپوتے ہو چکے ہوں تو اس کے لئے رونا پیٹنا لڑکے پر لازم نہیں ہے بلکہ جنازے کے آگے آگے اس کے قرابت دار، اور ان کی اولاد، اور دوسرے پڑوسی لوگ اور اس کی اپنی اولاد و پوتے اور پرپوتے گاتے بجاتے اور آپس میں چہلیں کرتے ہوئے دریا کے کنارے تک جاتے ہیں، اور اس کے جنازہ پر نقرئی اور طلائی پھول بھی بکھیرتے ہیں تاکہ وہ محتاجوں کے ہاتھ لگیں اور ان کے کام آئیں اور ان کے جنازے پر چھت گیری نہیں ہوتی اور کفن میں لپٹے ہوئے مردہ کو ہر ایک راہ گیر دیکھتا ہے۔ اگر کسی کی عمر اتنی دراز ہو کہ اس کے پوتے کے پوتے ہو جائیں تو اس کو ایک طلائی زینہ پر کھڑا کرتے ہیں۔ یعنی سونے کا ایک چھوٹا سا اور جین بنا کر اس کے پیروں تلے رکھتے ہیں۔

* بلکہ صرف ایک رومال لپیٹ لے اور لباس بھی پہنا ممنوع ہے اور زیر جامہ کے بدلے صرف ایک تاگڑی باندھے

سوگ | مختصر یہ کہ ایک جوان آدمی کی موت پر حمامی کی بیوی اُس متوفی کے گھر کی عورتوں یعنی ماں، بہن، چچی، دادی اور خالہ کے مجمع میں آکر ان کو ماتم کے لئے کھڑا کرتی ہے اور گریہ آور اندوہگیں آواز میں نوحہ خوانی کرتی ہے تاکہ وہ عورتیں بھی اس کے ساتھ خود وہ الفاظ کہہ کر سر و سینہ پیٹیں۔ یہ ماتم ایسا ہوتا ہے کہ اس سے در و دیوار کو بھی رونا آجاتا ہے۔ یہ طرز نوحہ پنجاب کے کھتری فرقے کی خصوصیات میں سے ہے۔ اس فرقے کے پورب کے باشندے بھی پنجابیوں کی تقلید کرتے ہیں لیکن ان کے ماتم میں وہ شدت نہیں ہوتی، اگر کوئی بوڑھا مرتا ہے تو عورتیں بھی دل سے ماتم نہیں کرتیں۔ حالانکہ بظاہر سر و سینہ پیٹتی ہیں۔

پروہت | اور دلاک عورتوں کا حال یہ ہے کہ کھتریوں میں سارست برہمن کو، جوان کا پیر و مرشد ہوتا ہے پروہت کہتے ہیں۔ اور ایسا نہیں ہے کہ کھتریوں کا ہر ایک گروہ (فرقہ) ایک ہی پروہت پر اکتفا کرتا ہو بلکہ ہر ایک پیشہ کے لوگوں کا الگ الگ پروہت ہوتا ہے، یعنی برہمنوں کا ایک گروہ کھتریوں کے ایک فرقے سے تعلق رکھتا ہے تو دوسرا دوسرے فرقے سے۔ اور کھتریوں کے فرقوں میں پروہت کے بعد دتیسر بھی ہوتا ہے۔ یہ پنجابی زبان میں ترقی خواہ اور دعا گو کو کہتے ہیں۔ اِن کی تین قسمیں ہیں، ایک تو بادہ فروش، دوسرے دلاک جو کھتریوں میں اپنے مخصوص لوگوں کی موتراشی کرتا ہے اسے پنجابی میں ججمان کہتے ہیں، تیسرے ڈوم جسے میراثی بھی کہتے ہیں۔ اور ان کی عورتوں کو مراثن کہا جاتا ہے۔ ہندی میں مطرب کا ترجمہ ڈوم ہے، حجام ہمیشہ ہندو ہوگا اور بادہ فروشوں میں بعضے ہندو اور بعضے مسلمان بھی ہوتے ہیں۔ البتہ ڈوم قدیم زمانے سے مسلمان ہی ہیں۔ یہ لوگ نوکری نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ اپنے ججمانوں کی دولت پر بسر اوقات کرتے ہیں، کھتریوں کے ہاں شادی بیاہ کے دنوں میں اُن کی عورتیں زنان خانوں کی مہتمم اور مختار ہوتی ہیں اور یہ بات صرف کھتریوں پر ہی موقوف نہیں ہے بلکہ بعض ہندوؤں کے علاوہ جو شاذ و نادر ہیں، تمام ہندوؤں کے فرقے بر سبیل بدلیت ان چاروں فرقوں سے خصوصی تعلق رکھتے ہیں۔ بعضے ڈوموں کی لڑکیاں، جو حسین و جمیل، شوخ و طناز اور چالاک

ہوتی ہیں، امیروں کے گھروں میں گانے بجانے کی تقریب میں جاتی ہیں اور عالم تنہائی میں صاحبِ خانہ یا اُس کے لڑکے کے ساتھ بے حجاب ہوجاتی ہیں، خواہ زرِ نقد کی امید میں یا اس کے حسن و شباب پر فریفتہ ہو کر اس کے ساتھ حظِ نفسانی اٹھاتی ہیں، اور جب یہ مرحلہ بھی طے کرلیتی ہیں تو لولیوں کی طرح حجاب سے باہر نکل کر ہر ایک شخص کے ساتھ جو کوئی بھی انھیں روپیہ دیتا ہے چاہے وہ مسلمان ہو یا یہودی ہو یا نصرانی، جسم فروشی کرتی ہیں، پھر انھیں حجمانوں کے گھر میں نہیں گھسنے دیا جاتا۔ دلاک کو ہندی میں نائی اور اس کی عورت کو نائن کہتے ہیں۔ انھیں اگر میراثی اور میراثن بھی کہہ دیا جائے تو غلط نہیں ہے۔

گیا | باپ کے مرنے کے بعد لڑکے کا گیا جانا نہ صرف خود اس کے لئے تحصیلِ ثواب کا باعث ہوتا ہے بلکہ اس کے باپ کی روح کو بھی ثواب پہنچتا ہے، ان کے مذہب میں گیا جانا حجِ اکبر سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ لیکن دولت مندوں کے سوائے دوسرے کسی شخص کو یہ دولت میسر نہیں آتی۔ گیا، عظیم آباد (پٹنہ) کے قریب ہندوؤں کی ایک عبادتگاہ ہے، اور ہر ہندو ہر سال کسی مقررہ دن پر اپنے باپ کی نذر کا کھانا پکوا کر برہمنوں کو کھلاتا ہے اور ساتھ ساتھ انہیں نقدی بھی دیتا ہے۔ اس عمل کو سرادھ و کناگت کہتے ہیں۔ سرادھ و کناگت دونوں ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں، لیکن تمام ہندو اس پر ایک ہی دن عمل نہیں کرتے ہفتے کے سات دنوں میں سے ہر شخص اس دن جس دن اس کے باپ نے دنیا سے کوچ کیا تھا اور ہر سال اس مہینے اور ہفتے کے اسی متعین دن کو کھانا برہمنوں کو کھلاتا ہے۔ ایسے دن کے کھانے سے نان، پلاؤ اور گوشت پکوانا مقصود نہیں ہوتا بلکہ مذکورہ دن کے کھانے میں گوشت سے پرہیز کیا جاتا ہے۔ لہذا کھانے کی وہی چیزیں ہوتی ہیں جو گھی میں تل کر پکائی جاتی ہیں یا دوسرے لوازمات میں گھی میں تلی ہوئی سبزی اور میٹھا ہی ہوتا ہے۔ بندرت کے بعضے ہندوستانی گھروں میں اڑد کی کالی دال اور روٹی بھی پکائی جاتی ہے اور دعوت میں

کھانے کی نوعیت اور برہمنوں کی تعداد میزبان کی حیثیت پر موقوف ہوتی ہے۔ بعضے جو بہت مفلس ہیں ایک ہی برہمن کو کھانا کھلانے پر اکتفا کرتے ہیں، اور کناگت میں یہ شرط ہوتی ہے کہ اگر ایک برہمن کے کھلانے کی حیثیت ہوتی ہے تو متوفی بوڑھے کا لڑکا دوسرے برہمن کو نہیں بلاتا، اور اگر سفر میں ہوتے ہیں تو جو بھی برہمن وہاں مل جائے وہ کافی ہے۔

لڑکے کی شادی کے رسوم اور لڑکے کی شادی کی یہ رسم ہے کہ پروہت کی بیوی لڑکے والے کی طرف سے جاکر لڑکی والوں کے ہاں پہلے سلسلہ جنبانی کرے۔ اگر طرف ثانی کو راضی پاتی ہے تو واپس آکر لڑکے کی ماں کو حقیقت حال سے آگاہ کرتی ہے۔ اور بعد ازیں اس طرف کی بزرگ عورتیں مثلاً ماں، دادی، چچی، خالہ اور بڑی بہن جو بھی زندہ موجود ہوں، پروہت اور نائن اور بادہ فروش کی عورت اور ڈومنی کو ہمراہ لے کر لڑکی والوں کے ہاں جاتے ہیں، پھر لڑکی کی سیرت اور صورت کے حسن و قبح اور اس کے گھر کی عورتوں کے طور طریقے کے متعلق پوری معلومات حاصل کرنے کے بعد مصری کی ایک ڈلی لڑکی کے منہ میں ڈالتے ہیں اکثر صغر سنی ہی میں لڑکی کو شوہر کے حوالے کر دیا جاتا ہے، مسلمانوں کے برخلاف اس معاملے میں سات سال سے گیارہ سال تک توقف کیا جاتا ہے اور اس کے سوائے جو کچھ ظہور میں آتا ہے وہ مفلسی اور غربت کی وجہ سے ہے۔ لڑکے کی شادی تو جوان ہونے پر بھی کی جاسکتی ہے لیکن اگر لڑکی کی عمر دس سال سے زیادہ ہو جائے تو لڑکی کے والدین پر دانہ پانی حرام ہو جاتا ہے جب تک کہ اس کی شادی نہ کر دیں۔ مصری کی ڈلی کھلانے کے بعد لڑکی کے ہاتھ میں انگوٹھی بھی پہناتے ہیں، بعد ازیں لڑکی کے گھر کی عورتیں لڑکے کے گھر پروہت، نائن اور بادہ فروش کی عورت اور ڈومنی کو ساتھ لے کر جاتی ہیں، بلکہ ان کے شوہر بھی اگر لڑکے کے دروازے پر بیٹھ جاتے ہیں، لڑکے کو بھی مصری کی ڈلی کھلاکر اُسے بھی انگوٹھی دیتے ہیں اور واپس لوٹ آتی ہیں اگر اس مدت میں یعنی رخصتی ہونے سے پہلے لڑکا فوت ہو جاتا ہے تو ایسی صورت میں لڑکی کی دوسرے سے شادی کر دیتے ہیں۔ لیکن اگر

شادی ہو جانے کے بعد یہ حادثہ وقوع پذیر ہو تو بیوہ لڑکی اپنی ساس کے ساتھ بیٹھی رہتی ہے یا اگر بدرجۂ مجبوری شوہر کے گھر والوں میں کوئی فرد باقی نہ رہا ہو یا مفلسی کی وجہ سے اس کے نان نفقہ کا بوجھ نہ اٹھا سکتے ہوں تو وہ اپنے ماں باپ کے گھر آجاتی ہے، اور یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کا عقد کسی دوسرے شخص کے ساتھ کر دیا جائے۔ مختصر یہ کہ اس بیوہ کے لئے اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں کہ یا تو وہ اپنی باقی عمر سوگ میں گذار دے یا ستی ہو جائے۔

ستی ستی سے مراد وہ عورت ہے جو اپنے شوہر کے ساتھ آگ میں زندہ جل جائے ہندی میں ستی کے لغوی معنی ہیں شوہر کے علاوہ کسی دوسرے شخص سے تعلق نہ رکھنا اور اصطلاحاً مطلب وہی ہے جو بیان کیا گیا۔ اور ست دو قسم کا ہوتا ہے، یا تو عورت اپنے شوہر کے ساتھ جل جائے یا اس کی وفات کے بعد ترکِ لذّات کر دے۔ یعنی کھانا پینا، پہننا وغیرہ چھوڑ دے۔ بعضوں کے نزدیک پہلی صورت دوسری سے زیادہ مشکل ہے اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ دوسری صورت زیادہ تکلیف دہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ست لوک، آسمان کے اس مقام کا نام ہے، جہاں ستی عورتیں رہتی ہیں، چوں کہ ان کے عقیدہ کے مطابق ست لوک میں ہر وہ شے جس کی ستی عورت خواہش کرے بآسانی مل جاتی ہے، مگر وہی نہیں ملتا، اس لئے ستی کے سوار ہونے کے وقت اسے تھوڑا سا دہی کھلا دیتے ہیں۔

ستی ہونے کا طریقہ قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص فوت ہو جاتا ہے اور اس کی بیوی ستی ہونے پر اصرار کرتی ہے تو اس کے ماں باپ اور ساس سسر پہلے اسے اس بات سے روکتے ہیں اور اس سے وعدہ کرتے ہیں کہ ہم تجھے کھانا کپڑے دیں گے۔ اگر وہ ان کے وعدوں پر اعتماد کر لیتی ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ رو پیٹ کر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں۔ پھر وہ نئی نویلی دلہنوں کی طرح ہاتھوں اور پاؤں میں مہندی لگاتی ہے

اور نتھ پہنتی ہے جو بیوہ عورتوں کے لئے ممنوع ہو جاتی ہے۔ پھر سرخ لباس زیب تن کر
دلہنوں کے سے دوسرے سنگھار کرتی ہے۔ اس کے شوہر کو ارتھی پر لٹا دیا جاتا ہے اور
شاہانہ شان وشوکت کے ساتھ، جس میں نوبت، نقارے، ہاتھی اور گھوڑے اور دوسرے
ہندوستانی ساز ہوتے ہیں، نیز سنہری اور نقرئی ہودجوں سے سجے ہوئے ہاتھی اور خوش رنگ
گھوڑے، پیادہ اور سوار فوج بھی ساتھ ہوتی ہے۔ اس طرح یہ جلوس ستی ہونے والی عورت
کو ایک طلائی زین سے آراستہ گھوڑے پر سوار کر کے لے جاتا ہے۔ ستی کے ہاتھ میں ایک
سالم ناریل دے دیا جاتا ہے تاکہ وہ راستے بھر اسے دائیں ہاتھ سے اچھال کر بائیں میں اور
بائیں سے دائیں بدلتی رہے۔ چند آدمی مضبوطی سے گھوڑے کی لگام تھامے رہتے ہیں
تاکہ وہ گھوڑے سے اتر کر بھاگ نہ جائے۔ اگرچہ ستی کی سواری کا گھوڑا بہت ہی سدھا ہوا
ہوتا ہے، اور ستی کا جلوس حاکمِ وقت کے دروازے کے سامنے سے نکلتا ہے۔ کبھی کبھی حاکم
بھی اس جلوس میں شریک ہو جاتا ہے۔ یہ بات داخلِ آئین ہے کہ چاہے حاکم ہندو ہو
یا مسلمان وہ ستی کے جلنے سے پہلے اس کی خواہش کے مطابق روپیہ دینے کا وعدہ کرتا ہے۔
اگر وہ دیکھتا ہے کہ ستی روپیہ لینے کے لئے راضی نہیں ہوتی تو مجبوراً وہ گھر واپس ہو جاتا ہے۔
ستی کے جلوس کے ساتھ نوبت بجانے کا حکم بادشاہوں اور امراء کی طرف سے ہے، اور جب
ستی لکڑیوں کے انبار پر بیٹھ کر اپنے شوہر کے سر کو اپنے زانوؤں پر رکھ لیتی ہے تو اس وقت
بھی حاکم یا بادشاہ کی طرف سے کوئی شخص جا کر اُس سے آئندہ زمانے کا حال پوچھتا ہے۔
تاکہ بادشاہِ وقت اور اس کی بیوی کے حق میں اس کی زبان سے دعائے خیر نکلے جو اس کی
دولتِ دوام اور درازیٔ عمر کا موجب ہو۔ بادشاہ یا حاکم کے علاوہ دوسرے لوگ بھی ستی
سے بعض باتیں دریافت کرتے ہیں۔ اب اس انبار میں چاروں طرف سے آگ لگا دی جاتی
ہے، یہاں تک کہ ایک ہی لمحے میں دونوں جل کر خاک ہو جاتے ہیں۔ ستی کے جلوس کی شان
وشوکت اور اس کے ہمراہ لوگوں کے ہجوم کا انحصار حاکم کے شکوہ اور شہر کی آبادی پر ہوتا ہے۔

ہندوؤں میں ستی کی اتنی عزت کی جاتی ہے کہ اسے تحریر میں لانا دشوار ہے۔

رسم ستی اور مسلمان بعضے مسلمانوں کے نزدیک زندہ ستی ہونا جہنم کا ایندھن بن جانے کے مترادف ہے مگر اس خیال کے بہت کم مسلمان پائے جاتے ہیں، کیونکہ نیچے درجے کے مسلمانوں کو چھوڑ کر شرفاء میں جوق جوق مسلمان ستی کو کاملانِ عشق میں سے سمجھتے ہیں اور اس کے اس عمل کو عشق کا مظاہرہ مانتے ہیں۔ اور ستی کو شریف ترین عورتوں میں شمار کرتے ہیں اور یہ لوگ اس عورت کے حال پر جو عالم شباب میں شوہر کے سر کو اپنے زانوؤں پر رکھ کر خندہ پیشانی سے جل جاتی ہے، زار زار روتے ہیں۔ ہندوؤں میں یہ بھی قاعدہ ہے کہ لکڑی کے تودہ میں آگ لگاتے وقت اگر ستی اپنے شوہر کا ساتھ چھوڑ کر باہر نکل آئے تو پھر اس کے وارث اسے اپنے گھر میں داخل نہیں ہونے دیتے، بلکہ یہاں تک کہ جس کھانے کو اس کا ہاتھ لگ جائے اسے ہاتھ نہیں لگاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس وقت تک ستی گھر پر ہے اگر اس کا ارادہ بدل جائے تو اُس میں کچھ مضائقہ نہیں لیکن جب وہ عورت اور اس کا مردہ شوہر ایک مقام پر ہو گئے تو دونوں پر مُردہ ہونے کے حکم کا اطلاق ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اُس ستی کے ہاتھ کا کھانا جو آگ کے خوف سے اپنے شوہر کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ آئی ہو ایسا ہی ہوتا ہے جیسے کوئی کسی مردے کے ہاتھ کا کھانا کھالے۔ لیکن آگ سے ستی کے بھاگنے کا واقعہ شاذ و نادر ہی وقوع میں آتا ہے۔

کھتریوں کی شادی بیاہ کے رسوم اب یہاں سے کھتریوں کی رسومِ شادی کا بیان کرتا ہوں۔ جب کسی کھتری کے لڑکے کی شادی ہوتی ہے تو شبِ عروسی سے چند روز پہلے لڑکے کو نہلا کر زعفرانی لباس پہناتے ہیں اور شرط یہ ہے کہ اس کو نہلانے اور بدن ملنے میں اُن نائیوں کے علاوہ جن کو میراثی کہتے ہیں، کوئی دوسرا شریک نہ ہو، نہانے سے پہلے جو لباس اس کے جسم پر ہوتا ہے اس کو یہی لوگ لے جاتے ہیں، اور اسی طرح اُس دن لڑکی کے والدین بھی دلہن کو آراستہ کرتے ہیں اور مالنیں ہرے پتوں کی مالائیں بنا کر لڑکے اور لڑکی کے مکانوں پر

شگون کے لئے آویزاں کرتے ہیں۔ ہندی میں اس کو بندھوار کہتے ہیں، لڑکے اور لڑکی کو نہلانے اور انہیں رنگین لباس پہنانے کی اس رسم کو مانجھے بٹھانا کہتے ہیں، مانجھے کا مطلب ہے لڑکا اور لڑکی اس زمانے میں کھیل کود وغیرہ میں حصہ نہیں لے سکتے، کسی کے گھر آجا نہیں سکتے اور لڑکا بغیر ہتھیار کے (جو مرد کا زیور ہے) گھر کے باہر نہیں نکل سکتا۔ یہ بھی رسم ہے کہ ایک انگشتری ریشم میں باندھ کر لڑکی اور لڑکے کو پہناتے ہیں، اسے کنگنا کہتے ہیں، اور اسی دن سے دونوں گھروں میں ڈومنیاں بدھائی گانا شروع کر دیتی ہیں، کم حیثیت اور غریب آدمیوں کے گھر تو یہی ڈومنیاں جمع ہو جاتی ہیں البتہ دولت مندوں کے ہاں دوسری ڈومنیاں بلکہ کولیاں (طوائفیں) بھی آکر رقص کرتی ہیں، دوست واحباب عزیز و اقربا اور دور پڑوس کے عورت مرد جمع ہو کر کھانے اور مٹھائیاں کھاتے ہیں اور دن رات گانا سننے اور ناچ دیکھنے میں مشغول رہتے ہیں، لیکن اس رقص و سرود پر بس نہیں ہوتا، دولھا کی سالیاں، کنبے برادری کی عورتیں اور اس کی بہنیں ایک جگہ جمع ہو کر ڈھولک بجاتی ہیں اور رسیلی آواز میں سٹھنی گاتی ہیں۔

سٹھنی | سٹھنی ہندی کے چند الفاظ ہیں، جن کا مجموعہ خاص وزن اور قافیوں پر مشتمل ہوتا ہے، اس کے بول بہت فحش ہوتے ہیں اور مردوں کے لئے مخصوص ہے۔ گاتے وقت عورتیں جس شخص کا نام چاہتی ہیں، اس میں شامل کر لیتی ہیں۔ بعضوں کا کہنا ہے کہ یہ امیر خسرو کی ایجاد ہے، اللہ ہی بہتر جانتا ہے، لیکن امیر خسرو کے بعد دوسرے لوگوں نے سٹھنیاں اختراع کی ہیں اور اب بھی موزوں کرتے ہیں۔ یہ مردوں پر موقوف نہیں، عورتیں بھی فحش الفاظ جمع کر کے سٹھنیاں موزوں کر لیتی ہیں اور اس میں برادری اور پڑوس کے وضیع و شریف مردوں اور عورتوں، کنیزوں، غلاموں اور نوکروں کے نام بھی شامل کر لیتی ہیں اور بلند آواز سے بے دھڑک گاتی ہیں، اگر اس زمانے میں یہ عورتیں کسی ضرورت سے لڑکی کے گھر یا کسی دوسری جگہ جاتی ہیں تو سب پیدل اور بے پردہ ہو جاتی ہیں اور

کوچہ و بازار میں ہر دس قدم پر ٹھہر ٹھہر کر ایک فحش ستھنی گاتی ہیں اور پھر بڑھ جاتی ہیں، اسی طرح پھر کچھ دور چل کر ٹھہر جاتی ہیں اور یہی ہنگامہ برپا کرتی ہیں، یہاں تک کہ اُن کی منزل مقصود آجاتی ہے، اسی طرح گاتے بجاتے رنگ رلیاں مناتے ہوئے راستہ طے کرتی ہیں، اگر لڑکی کا گھر چند منزلوں کے فاصلے پر واقع ہو اور لڑکے کے قرابت داروں کے لئے سواری کے بغیر سفر طے کرنا ممکن نہ ہو تو یہ عورتیں بہل اور رتھ کی سواری میں چلتی ہیں اور جب نئے شہر میں داخل ہوتی ہیں تو کارواں سرائے تک بلند آواز سے ستھنیاں گاتی جاتی ہیں، جب وہ صبح ہوتی ہے جس کی شام کو لڑکا شادی کے لئے لڑکی کے گھر کے لئے سوار ہو گا تو سورج نکلنے سے پہلے لڑکے کو اُس گھوڑی پر سوار کر کے جو اس کی سواری کے لئے متعین ہو چکی تھی، لڑکی کے گھر لے جاتے ہیں۔ وہ لڑکا اُسی رنگین لباس میں ہوتا ہے جو کچھ دیر پہلے اسے پہنائے گئے تھے، اور یہ بھی لازمی ہے کہ اس وقت لڑکا اپنے کاندھے پر شمشیر ڈال کر سوار ہو اور تمام مسافت اسی طرح طے کرے، پھر لڑکی کے گھر پہونچ کر وہ لکڑی کے ایک تخت پر بیٹھتا ہے۔ وہاں ایک برہمن اس کے سامنے شگون کے لئے کچھ منتر پڑھتا ہے اور اسے رخصت کرتا ہے، جب لڑکا گھر واپس آتا ہے تو ذرا دن چڑھنے پر اس کے والدین مصری، مٹھائی اور میوہ ناکوس اور گور کہ اور کچھ دوسری چیزوں سے بھرے ہوئے خوان لڑکی کے گھر روانہ کرتے ہیں۔

شہ بالا اور دولھا سے کم عمر کے کسی لڑکے کو بھی اس کے پیچھے گھوڑے پر بٹھاتے ہیں۔ اس لڑکے کو ترکی میں ساقدوش اور ہندی میں شہ بالا کہتے ہیں۔

برات جب اس طرح دن گذر جاتا ہے اور تارے نکل آتے ہیں تو دولھا کے والدین کی حیثیت کے مطابق برات کا مجمع اس کے گھر کے سامنے جمع ہوتا ہے پھر برہمن آتے ہیں اور مناسب طریقہ سے شگون بچارتے ہیں، جب ان تمام ضروریات سے فارغ ہو جاتے ہیں تو دولھا کو نہلا کر اس کی گردن میں زنار باندھتے ہیں، کیوں کہ

بغیر زنار کے اُسے کھتری ہی نہیں کہا جاسکتا۔ کچھ کھتری تو شادی ہونے سے پہلے ہی لڑکے کی گردن میں زنّار باندھ دیتے ہیں اور بعضے شادی کی رات کو باندھتے ہیں پہلی رسم تو تمام زنار بند ہندوؤں کا طریقہ ہے اور دوسری صورت بعض لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے غرض یہ کہ نہلانے کے بعد جامہ زرباف (سنہری جامہ) جو شادیوں کے موقع پر کرایہ پر لیا جاتا ہے، دولھا کو پہناتے ہیں۔ اور چاندی کا تاج جسے مُکٹ کہتے ہیں، اس کے سر پہ رکھ کر اُسے گھوڑی پر سوار کرتے ہیں اور اُس کے سر پہ چتر لگایا جاتا ہے۔ کھتریوں کے نزدیک دولھا کی سواری کے لئے گھوڑا، ہاتھی یا پالکی میں سے کوئی سواری بھی باعثِ برکت وسعادت نہیں سمجھی جاتی۔ اس مقصد کے لئے صرف گھوڑی ہی کام آتی ہے۔ گھوڑی کی سواری کو شاہانہ سواری سمجھا جاتا ہے، بلکہ ہندی زبان میں عورتیں لڑکوں کو دعا بھی یہ دیتی ہیں کہ "خدا تجھے گھوڑی پر چڑھائے"۔ یعنی تیری شادی ہو جائے۔ یہ سواری کھتریوں کی ہی خصوصیت ہے، دوسرے ہندوؤں کا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ گھوڑی پر سوار ہوتے وقت لڑکے کے دروازے پر خوش الحانی سے عورتیں جو گانا گاتی ہیں، اسے بھی گھوڑی ہی کہا جاتا ہے۔ اپنے گھر سے دولھا کو سوار کرکے باجے تاشے کے ساتھ اور آتشبازی چھوڑتے ہوئے دھوم دھڑکے سے اسے دلہن کے گھر تک لے جاتے ہیں، دولھا کو گھوڑی سے اتار کر معہ اس کے ہمراہیوں کے، جو ہندی میں براتی کہلاتے ہیں، دولہن کے گھر کے قریب کسی مکان میں بٹھا دیا جاتا ہے جسے لڑکی والوں نے ہمسایہ سے عاریتاً کرایہ پر حاصل کیا ہوتا ہے یا وہ اس کا نجی مکان ہوتا ہے۔ یہ مکان براتیوں کے لئے بڑے پیانہ پر سجایا جاتا ہے اور اسے ہندی میں جنواسہ کہتے ہیں۔ جب رات کا آخری پہر یا اس سے کچھ زیادہ وقت باقی رہ جاتا ہے تو دولھا کو اس کے والد، بھائیوں اور قریبی رشتہ داروں کے ساتھ دلہن کے گھر میں لاتے ہیں، اور اب برہمن سنسکرت کے وہ اشلوک پڑھتے ہیں جو شادی کے موقعوں کے لئے مخصوص ہوتے ہیں۔ لکڑی کے ایک ڈھیر میں آگ روشن کرکے لڑکی کے دوپٹہ کا ایک پلّو

لڑکے کے پلّو سے مضبوط باندھ کر دونوں کو آگ کے چاروں طرف چند بار چکّر لگواتے ہیں۔
اس عمل کے بعد گویا لڑکے اور لڑکی کے درمیان میاں اور بیوی کا رشتہ قائم ہوجاتا ہے۔
جب تک ان دونوں کو ہوَن کے چاروں طرف چکّر نہ لگوائیں اس وقت تک یہ رشتہ پیدا نہیں ہوتا۔ اگر اس عمل سے پہلے شوہر پر کوئی آفتِ ناگہانی نازل ہوجائے تو دلہن کے والدین کو پورا اختیار ہے کہ وہ جس شخص سے چاہیں لڑکی کا دوسرا رشتہ کردیں، لیکن اس عمل کے بعد اگر اُسی رات کو شوہر کا انتقال ہوجائے اور لڑکی سو سال کی عمر بھی پائے تو بھی دوسرے مرد سے رشتہ قائم نہیں کرسکتی، ہندی میں اس عمل کو پھیرا کہتے ہیں، اور دلہن کے دوپٹے کے چھور کو دولھا کے پلّو سے باندھنے کو گٹھ جوڑ کہتے ہیں بعض لوگ تو دولھا کو برات کے ساتھ اسی صبح کو رخصت کردیتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ براتیوں کو تو رخصت کردیا جاتا ہے مگر دولھا کو دو تین دن کے بعد بھیجتے ہیں۔ لیکن دولھا کے رخصت ہونے کے دن براتی پھر آکر جمع ہوتے ہیں، اور یہ بھی رسم ہے کہ جب دولھا، دلہن کو اپنے ہمراہ لے کر والدین کے گھر پہنچتا ہے تو اس کی ماں دروازے پر کھڑی ہوکر پانی سے بھرا ہوا ایک کٹورا دولھا اور دلہن کے سروں پر واری کرتی ہے اور پھر وہ پانی پینے کا ارادہ کرتی ہے مگر لڑکا بڑی پھرتی سے اپنی ماں کے ہاتھ سے پانی کا یہ برتن چھین لیتا ہے اور اسے پینے نہیں دیتا۔
یہ بات بھی سامعین کے ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ لڑکی کو شادی کی رات سے پہلے نہلاتے وقت لڑکی والے اس کے بدن کا میل جمع کرلیتے ہیں اور اس کو ہم وزن آٹے میں گوندھ کر ایک ٹکیا پکاتے ہیں اور وہ دولھا کو کھلاتے ہیں، لیکن جس دولھا کے والدین نے پہلے ہی اسے اس بات سے آگاہ کردیا ہوتا ہے، وہ نہیں کھاتا، ورنہ اکثر لڑکے کھا لیتے ہیں۔
دلہن کے تمام رشتہ داروں کو اڑوس پڑوس کے لوگوں کو اور اس کے ماں باپ کے نوکروں کو خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں اور دوسرے مرد عورت جو خرید وفروخت کی غرض سے دولھا

کے گھر آمدورفت رکھتے ہیں، ادھر کے لوگوں میں سے جس کے منہ میں جو بھی آتا ہے بکتا رہتا ہے اور یہ لوگ دم سادھ لیتے ہیں خصوصاً سالے اور سالیاں تو دولھا کو بُری طرح چھیڑتی ہیں اس میں ساس بھی حصہ لیتی ہے۔

اگر دولھا دلہن میں خانہ داری کی صلاحیت ہے تو خیر ورنہ طرفین کی صغر سنی کی صورت میں دلہن پھر اپنے والدین کے گھر واپس آجاتی ہے۔ اپنے اور شوہر کے سن بلوغ کو پہنچنے تک وہ میکے ہی میں رہتی ہے۔ جب شوہر جوان ہو جاتا ہے تو وہ آکر بیوی کو لے جاتا ہے اسے ہندی زبان میں گونہ اور پنجابی میں مکلاوہ کہتے ہیں جب وہ دوبارہ اپنی بیوی کو اپنے گھر لاتا ہے تو لڑکے کی ماں پہلے کی طرح اس موقع پر بھی ہاتھ میں پانی کا کٹورا لے کر دروازہ پر کھڑی ہوتی ہے اور لڑکا اسی طرح وہ برتن ماں کے ہاتھ سے چھین لیتا ہے، اس کے بعد جیساکہ شب عروسی کے ذیل میں بیان کیا گیا، اسی طرح عورت اور مرد کے پلوؤں کو آپس میں باندھتے ہیں، پھر مرد کے کندھے پر شمشیر ڈال کر اسے آگے کرتے ہیں اور بیوی اس کے پیچھے چلتی ہے اور قریبی رشتے اور پاس پڑوس کی عورتیں ان کے پیچھے پیچھے گاتی بجاتی ان دونوں کو کسی پکے کنوئیں پر لے جاتی ہیں، اس اثنا میں اگر ہزار بار، ہزار بازاری شریف و رذیل اور دوسرے لوگوں سے ان کا آمنا سامنا ہو تو بھی وہ ان کی بالکل پرواہ نہیں کرتی۔ کنوئیں پر پہنچنے کے بعد دولھا کو چاہیے کہ ایک چھوٹی سی لٹیا کے گلے میں ایک ریشمی ڈوری کا پھندا لگا کر اسے ایک ہاتھ سے پانی میں ڈالے اور جب وہ لٹیا پانی میں غوطہ کھانے لگے تو اسے اوپر کھینچ لے۔ اور پھر گھر واپس آجائے، لیکن مباشرت ان رسومات کی تکمیل پر موقوف نہیں ہوتی، جب بھی زن و مرد میں اس کی اہلیت پیدا ہو جائے وہ جب اور جہاں چاہیں مباشرت کر سکتے ہیں، اس کے لئے ان پر کوئی پابندی نہیں ہوتی۔

دھنگانا دھنگانا بھی ایک رسم ہے اور اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ دلہن کے گھر والے انعام کی لالچ میں دولھا کے گھر والوں اور سمدھنوں پر دروازہ بند کر دیتے ہیں، یہ راجپوتوں

کی رسم ہے لیکن کھتریوں میں اگر کوئی شخص ان کی تقلید کرے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ جب کسی کھتری کی لڑکی بیاہ کر اپنے شوہر کے گھر آتی ہے تو جب تک اُس کے کوئی بچہ نہیں ہو جاتا اس وقت تک اسے گوشت کھانے سے نہیں روکتے مگر حمل قرار پانے کے بعد اُسے اس نعمت سے محروم کر دیتے ہیں۔ بعض لوگ وضعِ حمل کے بعد یہ پابندی عائد کرتے ہیں، اکثر عزت دار لوگ خواہ ہندو ہوں یا مسلمان جب اس شہر میں وارد ہوتے ہیں جہاں ان کے شہر کی لڑکی بیاہی گئی ہو تو وہ اس شہر کے باشندوں کے گھر پانی نہیں پیتے لیکن بڑے شہروں میں ایسا ممکن نہیں ہوتا بلکہ قصبوں میں ہوتا ہے کیوں کہ بڑے شہروں میں کثرتِ آبادی کی وجہ سے ان باتوں کا نبھانا مشکل ہے۔ یہاں تک کھتریوں کی رسوم شادی کا بیان تھا حالاں کہ ان میں سے بہت سی رسمیں دوسرے فرقوں میں بھی مشترک ہیں۔

کشمیری برہمن | اب کشمیری برہمنوں کے کچھ حالات بیان کرتا ہوں، ان میں کچھ لوگ تو قدیم الایام سے اِسی بہشت نشان خطّے (کشمیر) کے باشندے ہیں، اور کچھ دکن سے کشمیر پہنچے ہیں، کچھ قنوج سے گئے ہیں۔ ان میں ہر ایک خاندان کے آدمی کے لئے ایک الگ لقب ہے اور اسی لقب سے وہ پہچانا جاتا ہے اور یہ ان ہی لوگوں پر موقوف نہیں، وہاں کے مسلمانوں کے بھی مختلف لقب ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان میں سے جو شخص کوئی پیشہ اختیار کر لیتا ہے وہ اسی سے پہچانا جاتا ہے۔ کھانا پکانے والے اسی جماعت کے لوگ ہیں، اور وہ باورچی کہلاتے ہیں، اور ان میں جو شخص تحصیلِ علم کر لیتا ہے اور غربت سے تنگ آکر اپنی برادری کے لوگوں میں کسی کے ہاں بچوں کی تعلیم کی خدمت قبول کر لیتا ہے وہ تمام عمر اخوند یا معلّم ہی کہلاتا ہے۔

عورتوں میں پردہ کا رواج | ان کی عورتیں اپنی برادری کے مردوں سے پردہ نہیں کرتیں بالفرض ان سے اگر کوئی شخص ہفت ہزاری کے منصب پر فائز ہو جائے اور دوسرا شخص

کسی کے ہاں طبّاخی کے صیغے میں دو رو پیہ پر ملازم ہو تو قاعدہ یہ نہیں ہے کہ اس امیر کی بیوی اس فقیر سے اپنا مُنہ چھپائے، جب اس کا جی چاہے وہ بے روک ٹوک اس کے زنان خانے میں جا سکتا ہے اور اس پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔

کوچہ و بازار میں پیدل اور بے پردہ پھرنے کے باوجود اس فرقے کی عورتیں بہت پاک باز اور عفیف ہوتی ہیں۔ ان لوگوں میں دیکھا گیا ہے کہ شوہر کے مرنے کے بعد عورت ستی ہو جاتی ہے حالانکہ ہندوؤں کے دوسرے فرقوں کی عورتیں بھی ایسا کرتی ہیں لیکن دوسرے فرقوں میں نُدرت و اتفاق سے ایسا ہوتا ہے اور ان لوگوں میں یہ رسم کلیہ کا حکم رکھتی ہے۔

زنّار بندی کی تقریب اس فرقے میں بچّے کی زنّار بندی کی تقریب سے زیادہ خوشی کا کوئی دوسرا موقع نہیں ہوتا۔ اِس خوشی کے موقع پر یہ لوگ ہزاروں روپیہ بلکہ اس سے بھی زیادہ بڑی فراخ دلی سے صرف کر دیتے ہیں۔ اور قسم قسم کی مٹھائیاں تیار کرا کر مقررہ حصّوں کے مطابق برادری کے لوگوں کے گھروں پر بھیجتے ہیں اور رقص و سرود کی محفلیں آراستہ کرتے ہیں۔

متبنّیٰ کا معاملہ ان لوگوں میں جو شخص لاولد ہو وہ اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ اپنی برادری میں سے کسی کے لڑکے کو گود لے لے تاکہ اس کے مرنے کے بعد وہ لڑکا اس کے مال و اسباب اور دولت کا وارث بنے، اور ہندوؤں میں ماں باپ کی نجات کے واسطے جو اعمال اور رسمیں ہیں اُن کو ادا کرے۔ کہا جاتا ہے کہ متبنّیٰ کے اعمال صالح اس کے حقیقی ماں باپ کے لئے کسی طرح بھی آخرت میں مفید ثابت نہیں ہوتے، البتہ جو کچھ وہ اپنے منہ بولے باپ کے لئے کرتا ہے وہ سود مند اور نافع ثابت ہوتے ہیں۔ یہ متبنّیٰ بھی اِسی لقب سے پکارا جاتا ہے جو اس کے منہ بولے باپ کا لقب ہے۔ اگر گود لینے کے بعد اُس کے مُنہ بولے ماں باپ سے کوئی اولاد پیدا ہو جاتی ہے تو ایسی صورت میں اگر لڑکا

ہوتا ہے تو اس متبنیٰ کا چھوٹا بھائی کہلاتا ہے اور لڑکی ہے تو چھوٹی بہن، اور منہ بولے باپ کے مرنے کے بعد بھی متبنیٰ لڑکا میراث کا حق دار ہوتا ہے اور وہ لڑکا نہیں ہوتا جو اس کے صلب سے بعد میں پیدا ہوا تھا۔ جب تک حقیقی لڑکا کم عمر رہتا ہے اور اس پر نابالغ ہونے کا اطلاق ہوتا ہے، متبنیٰ لڑکے کے بارے میں معلوم ہونے کے باوجود بھی کبھی اس کے دل میں یہ خیال نہیں گذرتا کہ یہ ساری دولت میرے باپ کی ہے، جب تک وہ بچہ ہے، بڑے بھائی کی زیادتیوں کو بھی برداشت کرتا ہے اور جب وہ جوان ہوجاتا ہے اور چھوٹے بھائیوں کی طرح اس متبنیٰ کا رشتۂ ادب ملحوظ رکھتا ہے لیکن اگر وہ کج رفتاری اور بدشعاری کو اپنا شیوہ بنائے تو ایسی صورت میں بڑے بھائی کو اختیار ہے کہ اُسے گھر سے نکال دے خواہ کچھ اُسے روپیہ پیسہ دے دلا کر یا بغیر کچھ دئے دلائے۔ حاکم کو اس معاملہ میں مداخلت کی مجال نہیں ہوتی یعنی وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم نے اس کے باپ کے مال پر قبضہ کر رکھا ہے۔ مختصر یہ کہ حقیقت میں متبنیٰ ہی پدر خواندہ کا لڑکا سمجھا جاتا ہے۔ اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ لاولد لوگوں میں سے کوئی شخص اپنے نواسے کو گود لے لیتا ہے اور وہ لڑکا اپنے باپ کو بہنوئی اور اپنی ماں کو بہن اور چھوٹے بڑے بھائی کو بھانجا سمجھتا ہے۔ اور وہ لوگ بھی یہی رشتہ ماننے لگتے ہیں، یعنی اُس کا باپ ہرگز اسے اپنا لڑکا نہیں سمجھتا، اس کی ماں اور بھائیوں کا بھی یہی حال ہوتا ہے، اور باپ ہی کا کیا کہنا کہ جب وہ اس کو سالا، ماں اس کو بھائی اور بھائی اسے ماموں سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی لڑکا کسی لونڈی سے یا کسی دوسری قوم کی عورت کے بطن سے پیدا ہوا ہو تو اس بچے کو باپ کی وراثت کا حق نہیں پہنچتا، میراث کا مختار کل متبنیٰ ہی ہوگا، چاہے وہ عمر میں اس لڑکے سے چھوٹا ہو، جو لونڈی یا دوسری عورت سے پیدا ہوا ہے، اور یہ اس وجہ سے ہے کہ ہندوؤں میں اولاد کی شرافت کا تعلق ماں سے ہے باپ سے نہیں۔ اسی لئے برہمن اور کھتری کمر میں زنّار باندھتے ہیں، اور بعض لوگ جو دولت کے لٹیرے ہیں ان قیود کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے روپیہ پیسہ صرف کر کے کسی ایسے

کم نسب لڑکے کو زنار بندھوا دیتے ہیں وہ ہرگز قابلِ اعتبار نہیں ہے۔ غیر شریف لڑکے کے ہوتے ہوئے بھی وراثت کا حق شریف زادہ نواسے کو پہنچتا ہے، لیکن عالی شان راجاؤں کی طرح دولت مندوں کی وراثت کا حق کارکنوں کے صلاح و مشورہ سے طے ہوتا ہے، اگر نواسہ نالائق، شریر خصلت اور کمینہ طبیعت کا واقع ہوا ہے تو متوفی کی جاہ و ثروت کی بقاء کی غرض سے غیر شریف لڑکے کو بھی میراث پہنچ جاتی ہے۔

شادی کی رسمیں | لڑکے اور لڑکی کی شادی سے متعلق اس گروہ کی اپنی رسمیں ہیں۔ برات کے دن لڑکے کی سواری کے لئے گھوڑی کے علاوہ کوئی دوسری سواری ہوتی ہے خواہ گھوڑا ہو خواہ ہاتھی۔ ان لوگوں میں کسی شخص کی لڑکی سے اپنے لڑکے کا بیاہ کرنا اور پھر اس کے لڑکے کو اپنی لڑکی دینا معیوب نہیں سمجھا جاتا اس کے برعکس کھتریوں میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس قبیلے میں وہ لوگ اپنی لڑکی بیاہتے ہیں اسی میں پھر اپنے لڑکے کا بیاہ نہیں کرتے، یہاں کے کایتوں کا حال کشمیر کے ہندوؤں یعنی وہاں کے برہمنوں سے مطابقت رکھتا ہے، پھیرے کی رسم ہندوؤں کے تمام فرقوں میں رائج ہے اور ضروری خیال کی جاتی ہے۔ یعنی لڑکے اور لڑکی کو آگ کے چاروں طرف چکر لگواتے ہیں۔ کایتوں کی شادی کی تقریب میں کھانے کی دعوت پر رات کو کایتوں کے تمام فرقوں کے لوگ جمع ہوتے ہیں، اور انھیں کھانا اور شراب مہیا کی جاتی ہے، حتیٰ کہ انانی فرقے کایتھ بھی ہوتے ہیں جنھیں کایتھ اپنے قبیلے میں شمار نہیں کرتے (اور رات کی خاص دعوت میں اپنے بھائی بندوں کے سوا کسی دوسرے کو اپنے گھر میں نہیں آنے دیتے۔ ان کے ہر ایک فرقے میں دولھا کی سواری الگ الگ ہوتی ہے۔ بعضے اس کو گھوڑے پر اور بعضے پالکی پر جسے ہندی میں میانہ کہتے ہیں، سوار کرتے ہیں۔ میانہ میں دولھا کو ایک کم عمر لڑکے کے ساتھ مسند پر بٹھاتے ہیں اور دوسرے چاروں لڑکوں کو آگے پیچھے کھڑا کر دیتے ہیں جن میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک چونری ہوتی ہے۔ ان چھ لڑکوں کو کہار پالکی پر اٹھاتے ہیں جو نفیس

کپڑوں سے مزین کی جاتی ہے اور برات کے ہمراہ دلہن کے گھر تک جاتے ہیں۔

اور بعض لوگوں میں بھی دولھا کی سواری کے لئے ہاتھی استعمال کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا بشرطیکہ اس کی استطاعت ہو۔ مختصر یہ کہ ہندوؤں میں شادی کی بعض رسمیں مثلاً پھیرہ یا سہرہ اور بعض دوسری رسمیں مشترک ہیں۔

سہرا | سہرا ایک چیز ہوتی ہے۔ جسے زرد پھولوں سے گوندھ کر بنایا جاتا ہے اور شبِ عروسی میں اُسے دولھا کے چہرہ پر اس طرح باندھتے ہیں کہ اس کا چہرہ ڈھک جاتا ہے، البتہ بعض رسموں میں ان کے درمیان کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ اکثر لوگ شادی سے ایک دو ماہ قبل ہندوستان کی مخصوص مٹھائیوں کے علاوہ گنڈورہ بنا کر برادری کے ہر گھر میں عموماً فی کس ایک گنڈورہ کے حساب سے بھیجتے ہیں اور کبھی امتیاز کی رعایت سے فی کس دو دو یا چار چار گنڈورے بھی بھیجتے ہیں۔

گنڈورہ | اور گنڈورہ کھانڈ کی گول ٹکیاں خمیری روٹیوں کی مانند ہوتی ہیں اور اِن کا وزن صاحبِ شادی کی خواہش کے مطابق آدھ سیر سے۔ دو سیر تک ہوتا ہے انھیں برادری کے گھرانوں میں تقسیم کرنے کے بعد اپنے ہندو اور مسلمان دوست و آشنا کے گھروں میں بھی بھیجتے ہیں۔

مُردے کو جلانے کی رسم | مردے کو جلانے کی رسم ان ہی فرقوں میں رائج ہے جو اہلِ شریعت ہیں۔ ورنہ دوسرے لوگ مُردے کو دفن کر دیتے ہیں یا دریا میں بہا دیتے ہیں اور سنیاسیوں کے فرقے میں ایک صاحبِ ریاضت اپنے آپ کو زندہ ہی سپردِ خاک کر دیتا ہے یعنی وہ اپنے چیلوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ ایک قبر کھود کر اس میں اسے لٹا دیں اور اوپر سے قبر کو بند کر دیں، اس کو سمادھ کہتے ہیں۔

اور تمام شرفا یعنی کھتری، برہمن، کایت اور راجپوت ایک بیوہ لڑکی کی دوسری شادی ہرگز نہیں کرتے، اور شاہانِ تیموریہ کو اپنی لڑکیاں دینے کی یہ جدید رسم قدیم

رسموں میں شامل نہیں ہوسکتی کیوں کہ انھوں نے اپنی طبیعت کے برخلاف بدرجۂ مجبوری ذی اقتدار بادشاہوں کے اس خوف سے فرمان کو قبول کرلیا کہ مبادا تکرار اور نزاع کی صورت میں وہ ملک و مال کو تاخت و تاراج کرنے پر آمادہ ہو جائے، لہٰذا جو عمل طوعاً و کرہاً ظہور میں آتا ہے وہ رسموں میں داخل نہیں ہے کیوں کہ رسم وہ ہے جو کسی مجبوری کی بنا پر عمل میں نہ آئے اور اس پر عمل نہ کرنے سے عمل کرنا فوقیت رکھتا ہو، اور جتنا بھی اس پر عمل کیا جائے وہ سرورِ خاطر کا باعث ہو۔

راجپوت راجپوت قوم کے جاہ و جلال والے راجا اپنے وزراء کے ساتھ اور ان لوگوں کے ساتھ جو وزیروں کے مساوی ہوں، برابری کی سطح پر ملاقات کرتے ہیں اور جو شخص ان سے کم مرتبہ ہوتا ہے اسے اپنے برابر جگہ نہیں دیتے، بلکہ وزراء اور اُن کے ہم پلّہ لوگوں کی اولاد کو بھی اس طرح اپنی مسند پر جگہ دیتے ہیں کہ بڑا تکیہ جسے ہندی میں گاؤ تکیہ کہتے ہیں، ان کی پشت پر نہ ہو، بلکہ صاحبِ مسند کی بائیں اور دائیں جانب رکھی جانے والے دو تکیوں میں سے ایک تکیہ ان کے سامنے ہوگا چاہے وہ اس کو زیرِ زانو رکھیں یا علیحدہ رکھدیں، چار زانو ہو کر بیٹھنا بھی ان کے نزدیک تہذیب کے خلاف ہے، دو زانو ہو کر بیٹھنا چاہیئے۔ کشمیری برہمنوں کے برعکس ہندوؤں کے دوسرے فرقوں کی طرح راجپوتوں میں بھی عورت کے ستی ہونے پر اتفاق ہے اور نیز راجاؤں میں یہ قاعدہ نہیں ہے کہ کوئی کم قدر شخص کسی عالی جناب کے ساتھ جو مرتبے میں صاحبِ خانہ کے برابر ہو، اگر کسی راجا کے گھر آئے تو مہمان کو چاہیئے کہ پہلے وہ اپنے ہمسر لوگوں کے ساتھ یا تنہا میزبان کی مجلس میں آئے، پھر وہاں بیٹھ کر اس شخص کو طلب کرے جسے اپنے ساتھ لے گیا ہے، یہ اہتمام اس وجہ سے ہے کہ بعضے راجا نجابت اور شرافت، دنیاوی مرتبہ و عزت میں بادشاہ کے خاندان سے مساوی درجہ رکھتے ہیں، اگرچہ جاہ و حشمت میں ان سے کم تر ہوں اس لئے مال و دولت

اور ظاہری تجمل کی کمی کی بنا پر بعض ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ جو ظاہری شان وشوکت میں ان سے برابر ہوں، توقیر و احترام سے پیش آتے ہیں، اور ایک ہی مسند پر بیٹھ کر گفتگو کرتے ہیں، اور یہی لوگ جوان کے ساتھ برابری کا دعویٰ کرتے ہیں، عالی شان راجاؤں کو اپنا آقا اور ولی نعمت اور اپنی امیدوں کا مرکز سمجھتے ہیں، اگر ایسا نہ بھی سمجھیں تو ان کے ہمسر پھر بھی نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ تارک الدنیا فقیروں کے سوا کوئی دوسرا شخص اس وقت تک اُن کی مجلس میں باریابی حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اسے اپنے خادم یا نوکر کی مثل نہ سمجھیں، لہٰذا راجاؤں کی برابری عالی شان راجاؤں کے ساتھ اور کم مرتبہ اشخاص کی برابری باحشمت راجاؤں سے اس طرح ثابت ہو گی تو اس احتمال کی گنجائش ہے کہ کسی دن کوئی شخص کسی متوسط درجے کے راجا کے ساتھ کسی عالی شان راجا کے گھر جا پہنچے اور وہ تعظیم وتکریم جو درحقیقت اس راجا کے واسطے ہو وہ بظاہر اُس کو بھی حاصل ہو جائے چاہے یہ بزعم خود ایسا سمجھے یا دوسرے یہ گمان کریں۔

ہندوؤں کی عورتوں میں ناک میں نتھ، بازوؤں پر دست بند اور کلائیوں میں چوڑیاں ہونا اس بات کی علامت ہے کہ اس کا شوہر زندہ ہے، چوڑیاں مختلف رنگوں کی کانچ سے بنائی جاتی ہیں اور یہ کانچ وہی ہے جس سے آئینے بنتے ہیں، اِن راجاؤں کے علاوہ دکن میں راجپوتوں کی ایک شاخ ایسی بھی ہے جو اپنی لڑکیاں اپنے بھانجوں سے بیاہ دیتے ہیں، لیکن تمام راجپوتوں میں یہ رسم عام طور سے نہیں ہے۔ اور دکنی برہمنوں میں بھی اکثر عورتیں ستی ہو جاتی ہیں، چونکہ کشمیریوں کی اصل بھی دکن ہی سے ہے تو ان میں ستی ہونا اسی اصل کی رعایت سے بطور رسم مشترک کے پایا جاتا ہے۔

ہندوؤں کی عورتوں میں پردہ تمام ہندوؤں میں ایک شریف عورت اپنے سُسر، جیٹھ، چچازاد بھائیوں اور ان کی اولاد سے جو عمر میں اُس کے شوہر سے بڑے ہوں، پردہ کرتی

ہے۔ کنیزوں اور خادماؤں کے سوائے اپنی ساس اور دوسری عورتوں کی موجودگی میں بھی وہ نقاب ڈالے رہتی ہیں۔ اس معاملہ میں کشمیری عورتوں کی وہی رسم ہے جو مسلمان عورتوں میں ہے اور جس کا بیان اگلے باب میں ہوگا، یہ سب فرقے (جن کا اوپر بیان ہوا) ہندوؤں کے طبقۂ اشراف میں شمار ہوتے ہیں۔

شودر | اب رذیلوں کا بیان شروع کرتا ہوں، جو شودر کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں، اُن کے چند گروہ ہیں۔ مثلاً جاٹ، اہیر، کہار، باغبان (لودھ)، کنبی، دھوبی اور کلال وغیرہ، مگر وہ کلال نہیں جو شودروں میں محسوب ہونے کے باوصف، شرفا کا تتبع کرتے اور خود کو ویش بتاتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات (یعنی ان کا ویش ہونا) محض بے اصل ہے، مختصر یہ کہ غیر شریف قومیں شرفا میں مروجہ تمام رسوم کی قید سے آزاد ہیں۔ اُن میں ایک عورت چار شوہر کرلیتی ہے اور ان کے علاوہ بھی دوسرے مردوں سے دادِ عیش دیتی ہے۔ مگر پردہ کے معاملے میں شریفوں کی تقلید کرتی ہیں۔ شراب پینا، ڈھول بجانا اور مردوں اور عورتوں کا باہم رقص کرنا، کہاروں کی رسموں میں سے ہے۔

رقصِ کہروا | رقصِ کہروا جو ہندوستانی کسبی عورتوں میں رواج پاگیا ہے، دراصل کہاروں کی عورتوں کے لئے مخصوص ہے۔ اس رقص کا طریقہ یہ ہے کہ کوئی حسین وجمیل نوعمر عورت کسی مرد کے سر سے اس کی رنگین پگڑی اتار کر اپنے سر پر رکھ لیتی ہے اور گیتوں کے کچھ مخصوص بول خاص ڈھن اور طریقے کے ساتھ ادا کرتی ہے اور اسی طرح رقص کرتی ہے جیسے کہار اور اُن کی عورتیں شراب کے نشے کے عالم میں کرتی ہیں، شوقین نوجوان بہت بن ٹھن کر ایسی مجلسوں میں حاضر ہوتے ہیں۔ دوسری قوموں کے بارے میں بھی کہاروں کی اس کیفیت سے قیاس کرلینا چاہیئے، وہ تمام عیوب جن سے شرفا کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں وہ سب اِن میں پائے جاتے ہیں۔

باب ششم

ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرت اور آئین

ہندوستان میں مسلمانوں کے چار فرقے شرفا میں شمار کئے جاتے ہیں یعنی مغل، سید، شیخ اور افغان۔ مغل سے مراد ان اصلی مغلوں سے ہے جن کے کچھ گھرانے ولایت میں تھے مگر ولایت، ایران اور توران کے لوگوں کی اولاد کو چاہے وہ کسی بھی شہر کے باشندے ہوں، ہندوستان میں مغل اور مغل بچہ ہی کہتے ہیں۔ اگر وہ شریف النفس اور حلیم ہے تو مغل کہلاتا ہے۔ اگر بانکا، شہدا، اور ہنگامہ پرور ہے تو "مغل بچہ" کہا جاتا ہے۔ جو شخص ایران سے ہندوستان میں وارد ہوتا ہے اُسے عام طور سے آقا کہا جاتا ہے چاہے وہ شریف ہو یا نوکری پیشہ ہو، یا سپاہی ہو، یا رذیل اور بازاری ہو۔ اور بعض سادات اور علماء کی اولاد یا دفتر کے اہلکاروں کی اولاد کو بھی مرزا کہتے ہیں۔ شاید اس لفظ کی اصل امیرزادہ تھی، میم سے پہلے ہمزہ کو، جو فارسی میں الف ہوتا ہے، حذف کر دیا گیا یا یہ ہوگا کہ میر بھی سردار کو کہتے ہیں۔ وہ میرزا کی اصل رہی ہوگی جو حذفِ یائے کے بعد رواج پا گیا۔ اور میر یا تو جداگانہ فارسی کا لفظ ہے یا امیر کا مخفف ہے جو الف کے حذف ہونے سے بن گیا۔ چوں کہ سیدوں میں بیشتر علماء اور شرفاء اور دوسرے اربابِ کمال گذرے ہیں، یہ لوگ اِن چند لفظوں سے جو اُن کے نام کے ساتھ تعظیماً آتے ہیں مشہور ہو گئے ہیں۔ یعنی کچھ لوگ

میر کہلانے لگے کچھ مرزا۔ اور کچھ لوگ سلسلۂ مادری کی بنا پر، جو کسی قزلباش کی لڑکی ہو آغا کہلاتے ہیں۔ لیکن اپنی سادہ دلی کی وجہ سے ہندوستان کے لوگ ہر ولایتی کو مُغل سمجھتے ہیں اور شرافت کے ہم قدر و ہم پایہ جانتے ہیں۔ سادات کے علاوہ دوسرے لوگ بھی جو قابلیت کے جوہر اور رشادت سے آراستہ ہو کر بادشاہوں کی خدمت میں پہنچ گئے ہیں اور ایران میں میرزا کے لقب سے مشہور رہے ہیں، چاہے وہ اصل میں شیخ ہی ہوں، ہندوستان آکر وہ اور ان کی اولاد میرزا ہی بن گئی ہے۔ اور توران سے یا تو خواجہ زادے آتے ہیں جن میں کچھ سید ہوتے ہیں اور کچھ شیوخ۔ اگر وہ خواجہ عبداللہ احرار کی اولاد سے ہوں، یا خواجہ محمد پارسا کی نسل کے ماوراء النہری ہوتے ہیں وہ لازماً شیخ ہوتے ہیں سید نہیں ہو سکتے۔ اگر وہ مخدوم اعظم کی اولاد میں ہے، یا نقشبندی ہے تو سید ہو گا کیوں کہ مخدوم اعظم کا سلسلۂ نسب امام علی رضا پر منتہی ہوتا ہے۔ پھر اس کے سید ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ اگرچہ بعض ایرانی اپنے مذہبی تعصب کی وجہ سے انہیں سید نہیں سمجھتے۔ اگر کوئی شخص اصل میں سید ہو اور ایک گروہ اس کی سیادت کو جھٹلانے والا پیدا ہو جائے تب بھی وہ سید ہی رہے گا اور اگر جعلی سید ہے تو چاہے لاکھوں آدمی اس کی سیادت کے مؤید و معترف ہوں وہ سید نہیں ہو سکتا۔ اور تورانیوں کے مورثِ اعلیٰ خواجہ بہاؤالدین نقشبند، جن کے مرید کے مرید خواجہ عبداللہ احرار تھے، ان کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ صرف دو لڑکیاں تھیں، جنھیں انھوں نے دو سید زادوں سے منسوب کر دیا تھا، چونکہ انھوں نے وصیت کے مطابق اپنے نواسے کو جانشین اور خلیفہ مقرر کیا تھا، ان کے انتقال کے بعد ان کے نواسے نے خود کو ان کا فرزند مشہور کر دیا اور ان کی اولاد بھی نقشبندی بن گئی روایاتِ صادقہ کے مطابق خواجہ نقشبند، شیخ صدیقی ہیں۔ اور محمد بن ابی بکر کی اولاد سے تھے۔ سید ہرگز نہ تھے۔ اگرچہ بعضے تورانیوں یا ہندوستانیوں کے اعتقاد کے مطابق، جو مذہبی تعصب زیادہ رکھتے ہیں، وہ سید تھے، لیکن اب تمام نقشبندی، خواجہ زادگان کہلاتے ہیں۔ کیوں کہ وہ خواجہ کے داماد کی اولاد میں ہیں جو سید تھے پس جس طرح توران میں خواجہ زادے کچھ

میر یا خواجہ یا خوجہ، خوجہ جی یا خوجم کہے جاتے ہیں، ہندوستان میں بھی اسی لقب سے معروف ہیں۔ اِس کے سوا یہ کہ وہاں اوزبک کو بیگ کہا جاتا ہے اور یہاں میرزا۔ اس طرح ہندوستان میں چند قسم کے مغل اور سیّد ملتے ہیں۔ ایک تو اصلی سیّد جن کے بزرگ عرب یا ایران یا توران کے شہروں سے آکر ہندوستان میں آباد ہو گئے، دوسرے دنبالہ سادات، جو توران کے قاعدے کے مطابق سیّد ہیں۔ وہ یہ کہ توران میں شرافت ماں کی طرف سے معتبر سمجھی جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص اوزبک کا لڑکا ہو مگر اس کی ماں سیّد ہے تو اسے میر صاحب یا سیّد صاحب کہیں گے۔ جب اوزبک زادہ اس طرح سیّد بن گیا تو خواجہ احرار کے سیّد ہونے میں کیا قباحت ہے؟ لیکن یہ سیادت عرب و ایران میں پایۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ اہلِ سنت و جماعت کی سیادت کو شیعہ حضرات اسی لئے معتبر نہیں سمجھتے کہ وہ شاید تورانیوں کی اولاد سے ہوں۔ تیسرے سادات لقبی ہیں جیسے میر جعفر و میر کاظم تونی۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ تون ایک قبیلہ ہے جو میر کے لقب سے ملقب ہے وہ تو سیادت کے ہرگز مدعی نہیں ہیں لیکن اُن کی اولاد میں سے جو ہندوستان آکر بس گئے ہیں اور اپنے آبائی القاب سے شہرت پا گئے ہیں، ان میں سے کسی نے شرافتِ حسبی کے باعث جو اسلام میں معتبر سمجھی جاتی ہے، کسی سیّد کی لڑکی سے نکاح کر لیا اور اس کی اولاد بے خبری میں سیّد بن بیٹھی۔ بعض لوگ رئیسوں میں عزت حاصل کرنے کے لئے قصداً مرزا کا لقب استعمال کرتے ہیں اور اُسے دعوائے سیادت کے لئے قوی دلیل سمجھتے ہیں۔

چوتھے کشمیریوں کا وہ فرقہ ہے جن کے نام کے آخر میں میر آتا ہے جیسے ابوالحسن میر و شرف الدین میر، ان کی اولاد ہندوستان آکر اس لقب کا یہ فائدہ اٹھاتی ہے کہ میر جو نام کے آخر میں آتا ہے اسے شروع میں لگا کر سیّد بن جاتی ہے۔

پانچویں وہ لوگ ہیں جو تنگیٔ معاش سے جاں بلب ہو کر نذر و نیاز حاصل کرنے

کے لئے یا ہندی کے مرثیے پڑھ کر سیّد ہو گئے ہیں۔ ان میں کچھ لوگوں کو علم یا دولت سے یہ شرافتِ حسبی حاصل ہو جائے تو دعوائے سیادت کے لئے یہی دلیل بن جاتی ہے۔

سیّدوں کے اکثر لے پالک اور غلام بھی سیادت کے مدعی ہو گئے ہیں اور دعوائے سیادت میں سب پہ بازی لے گئے ہیں۔ اگر ان لوگوں کو سیدوں کی چھٹی قسم شمار کیا جاوے تو مناسب ہے۔ اور ساتویں عطر فروش ہیں۔ جنھیں گندھی کہتے ہیں۔ یہ جب تک عطر کا صندوقچہ ہاتھ میں لے کر گلی گلی گھومتے ہیں یا بازار نشین رہتے ہیں میر صاحب کہلاتے ہیں، لیکن یہ شرفا میں اپنی سیادت کا اظہار نہیں کرتے۔ مگر جب بازار ترک کر دیتے ہیں یا کتابوں سے کچھ ربط پیدا کر لیتے ہیں یا ساز و سامان میسر آنے پر گھوڑا اور ہتھیار لے کر سپاہیوں میں نوکر ہو جاتے ہیں تو سادات کو اپنا برادر بتانے لگتے ہیں۔ آٹھویں ڈوم کا فرقہ ہے۔ یہ بھی قصبوں میں میر صاحب کہلاتے ہیں لیکن یہ بے چارے اپنے تئیں سادات اور دوسرے مسلمانوں کا دعاگو ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن ان میں جسے موسیقی نہ آتی ہو وہ مرثیہ خوانی کے ذریعے اپنے وطن کے سوا کسی دوسرے شہر میں جا کر روزی کماتا ہے یا سپاہیوں میں بھرتی ہو کر کسی امیر کی سرکار میں نوکر ہو جاتا ہے۔ چوں کہ ڈوم کی اشراف میں قدر و منزلت نہیں ہے، اپنے حفظِ آبرو کے لئے لوگوں میں اور اپنے یار دوستوں میں خود کو سیّد ظاہر کرتے ہیں۔

یہی حالت مغل کی ہے کہ ان کی بھی چند قسمیں ہیں۔ ایک تو ایران و توران کے لوگوں کی اولاد جو خواجہ زادوں اور سیدوں کے علاوہ ہے۔ دوسرے ساداتِ شیعہ کے غلام اور لے پالک۔ مغل سنی بھی ہوتے ہیں اور شیعہ بھی۔ تیسرے وہ مرد نو مسلم صاحبِ کمال جو بغیر دولت کی لالچ کے بطور خود اس شہر میں جہاں کا حاکم مغل ہو، اسلام قبول کر لے۔

اسی طرح شیوخ کی بھی چند قسمیں ہیں۔ ایک تو اصلی ہیں۔ ان کی دو شاخیں ہیں، ایک قدیم الاسلام جیسے صدیقی و فاروقی و عثمانی اور دوسرے صحابہ کی اولاد، دوسرے جدید الاسلام

جیسے گنبو اور پراچے اور خوجے اور بہرہ اور بکہ کی اور صدیقیانِ ملتان۔

دوسری قسم نومسلم جس نے حال ہی میں یہ سعادت حاصل کی ہو۔

مگر افغان کا حال یہ ہے؛ کہ ملک طالوت کے دو لڑکے تھے۔ ایک کا نام برخیا تھا اور دوسرے کا ارمیا۔ برخیا ہی کا نام آصف بتایا جاتا ہے۔ جو حضرت سلیمانؑ کا وزیر تھا۔ اور ارمیا کا لڑکا افغان نامی تھا۔ اس کی اولاد میں قیس بن عبدالرشید نے حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبتِ مبارک کی سعادت حاصل کی تھی۔ چونکہ اس کا نسب افغان بن ارمیا پر منتہی ہوتا ہے، اس کی اولاد بھی مسلمانوں میں افغان کہلائی۔ اس طرح افغانوں کی اصل عرب سے ہے۔ حضرت خلیفہ ثانی کے زمانہ خلافت میں شاید قیس کا لڑکا پشاور اور ہرات کے درمیانی علاقے کا انتظام کرنے کے لئے مامور رہا تھا تاکہ یہاں اسلام کو فروغ دے۔ چوں کہ اس نے وہ ملک اپنی قوت بازو سے فتح کیا تھا، اس علاقے کی حکومت کا پروانہ خلیفہ وقت سے حاصل کر کے ان پہاڑی علاقوں میں سکونت اختیار کی۔ اس ملک میں اس کی اولاد بہت پھیلی۔ چناں چہ آج تک بھی موجود ہے۔ اگر ہندوستان کے دوسرے شہروں یا دنیا کے دوسرے علاقوں میں یہ لوگ پائے جاتے ہیں تو وہیں سے آئے ہوئے ہیں۔ چوں کہ اس ملک کو، جو کابل اور پشاور کے مابین دامنِ کوہ میں واقع ہے روہ کہتے ہیں۔ اسلئے وہاں کے افغان روہیلہ کہلائے۔

ان میں فرقہ سڑابن، کلانی سے زیادہ شریف ہے۔ یہ لفظ اصل میں کلانڑی تھا، اور زبان افغانی (پشتو)، کا لفظ ہے۔ یہ گڑھے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ کہتے ہیں؛ کسی عورت نے ایک بچے کو گڑھے میں پھینک دیا تھا۔ اتفاق سے فرقہ سڑابن کا ایک افغان اُدھر سے گذرا، اسے بچے پر ترس آیا، اسے اٹھالیا اور اپنی اولاد بناکر پرورش کیا۔ چوں کہ کلانٹر (گڑھے) سے نکالا گیا تھا۔ اس کا نام کلانڑی رکھ دیا۔ بعض لوگ قابلیت سے

یا ہندوستانیوں کی صحبت کے اثر سے کلائی بھی کہتے ہیں۔ لیکن صحیح وہی ہے، نون غنہ اور رائے ثقیلہ (ڑ) کے ساتھ۔ بہرحال اس بچّے کی اولاد کلانڑی کہلائی۔ کلانڑی کی کئی قسمیں ہیں۔ جیسے بنگش، آفریدی، دلازاک، خٹک، رک زئی وغیرہ۔

سڑابن کی بہت سی جدا جدا شاخیں ہیں۔ یہاں ان کا شمار کرنا غیر ضروری ہے۔

سڑابن اور کلانڑی کے سوا غشت اور بیٹن، بھی دو فرقے ہیں۔

غرض یہ کہ ہندوستان میں پٹھان دو قسم کے ہیں۔ ایک تو اصلی سڑابن یا کلانڑی یا غرغشت اور بیٹن پٹھان۔ دوسرے ان پٹھانوں کے غلام یا وہ جوان کے دارالحکومت میں خوشی خاطر سے مسلمان ہو گیا ہو۔

یہ چار فرقے جو ہم نے گنائے ہیں، ہندوستان کے اشراف میں سے ہیں۔ بشرطیکہ انھوں نے اپنے حسب کی نگاہداری کی ہو یعنی اگر کوئی مغل بدرجۂ مجبوری تحصیلِ رزق کے لئے سقّہ گری کا پیشہ اختیار کرے گا تو وہ شریف نہیں رہا۔ وہ مغلوں کی برادری سے خارج ہو جائے گا۔ اس کے بعد وہ اپنے لڑکے کے لئے کسی سقّے ہی کی لڑکی سے رشتہ طے کر سکتا ہے۔ اور اپنی بیٹی بھی سقّوں ہی میں منسوب کرے گا۔ اور شریفوں میں سے کوئی بھی اس کے بیٹے یا بیٹی سے رشتہ کرنا پسند نہیں کرے گا۔ اور سیدوں کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ خواہ اُن کی سیادت سندی ہو۔ حَسَب بدل جانے کی حالت میں اس کی قرابت بھی اپنے ہم پیشہ لوگوں ہی میں ہوگی۔ اور اس کی سیادت بھی نامقبول اور از کار رفتہ سمجھی جائے گی۔

بہت سے نہادت اپنے تئیں سید یا افغان ظاہر کرتے ہیں۔ کچھ مغل یا شیخ ہونے کا بھی دعویٰ رکھتے ہیں۔ لیکن ان کی رشتہ داریاں آپس ہی میں ہوتی ہیں۔ شرفا میں انھیں کوئی نہیں پوچھتا۔ ان کی سیادت بھی شریفوں کے نزدیک نامعتبر ہوتی ہے۔ افغان بھی اگر شیر فروشی کا پیشہ کرلے یا بازار میں حقہ پلانا شروع کر دے تو شرافت کے معیار سے ساقط ہو جاتا ہے۔ اسی طرح شیخ جو پیشہ اختیار کرلیتا ہے اسی پیشے سے موسوم کر دیا جاتا ہے۔

نچلے درجے کے پیشے اختیار کرنے پر اس کا شمار شریفوں میں نہیں کیا جاتا۔ چاہے وہ تینوں خلفاء میں سے کسی کی اولاد میں ہو۔ مثلاً خوجے ہندوستان میں ایک نومسلم فرقہ ہے۔ یہ لوگ بنازی، خیمہ فروشی اور عطاری سے بسر اوقات کرتے ہیں۔ یہ نہ شریف ہیں نہ رذیل ہیں۔ بیچ کے درجے میں گنے جاتے ہیں۔ اور اپنی ہی برادری میں رشتے کرتے ہیں۔ اور پراچہ بھی ایک فرقہ ہے۔ یہ لوگ خیمے، خوان، رسیاں وغیرہ شادیوں میں کرائے پر دیتے ہیں اور کرائے کا وہ لباس بھی جو داماد کو شبِ عروسی میں پہنایا جاتا ہے، انھیں لوگوں سے ملتا ہے۔ ان کی قرابت اور نجابت کا حال بھی خوجوں کے مانند ہے۔ کلیری بھی نومسلم ہیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ غلّہ، جلانے کا تیل اور گھی وغیرہ چیزیں بازار میں فروخت کرتے ہیں اور گایوں، بھینسوں وغیرہ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لاتے لے جاتے ہیں۔ اس میں جو کچھ منافع ہوتا ہے اس سے گذر اوقات کرتے ہیں۔ اور بُہرہ یا بوہرہ، ملتان، ٹھٹھہ، سورت وغیرہ کے اطراف میں تجارت کرتے ہیں۔ یہ لوگ شرافتِ حسب و نسب کے بارے میں مذکورہ بالا تینوں فرقوں پر قدرے فوقیت رکھتے ہیں لیکن ان کی رشتہ داریاں غیروں میں نہیں ہوتیں۔ جو کچھ بھی ہوتا ہے آپس ہی میں ہوتا ہے۔ ان میں دو جماعتیں ہیں ایک تو چھوٹی جماعت کہلاتی ہے۔ یہ سب اثنا عشری ہیں۔ دوسری بڑی جماعت۔ ان میں سب سنّی مذہب ہیں۔

اور صدیقیان ملتانی میں سے بیشتر شیعہ ہیں۔ ان میں تجارت پیشہ، حاجی اور عتباتِ عالیات کے زائرین بھی ہوتے ہیں۔ ان کی قرابتیں بھی اپنی ہی برادری میں ہوتی ہیں۔ کنبو کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ یہ سب سے زیادہ شریف ہیں۔ لیکن چوں کہ حفظِ نسب کی خاطر یا غرورِ شرافت کے باعث یہ اپنی قوم کے باہر قرابت نہیں کرتے۔ اس لئے شیخ، سید یا مغل کے ساتھ ان کا شمار نہیں ہوتا ورنہ عزت میں یہ اِن سبھوں کے برابر ہیں۔ جب کہ مذکورہ بالا فرقوں کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہے۔

شاہجہان آباد میں جو ہندوستان کی راجدھانی ہے، اور دوسرے شہروں میں بھی جہاں دلّی والے ہوں گے سیدوں اور مغلوں کے درمیان رشتہ داریاں ہوتی ہیں۔ چاہے سیّد کی سیادت اور مرزا کی مرزائی سندی ہو یا غیر سندی لیکن شرط یہ ہے کہ وہ بادشاہ کے دربار میں یا امرا کی سرکار میں پہنچ رکھتا ہو۔ یہ لوگ سپاہیوں میں یا امیروں کے مصاحبوں میں کم و بیش نوکر ہیں، اور کسی دوکان پر نہ کبھی خود بیٹھے ہوں اور نہ ان کے بزرگ بیٹھے ہوں، ان دو میں سے کوئی کشمیری الاصل بھی نہ ہو۔ البتہ اگر فریق ثانی کو اس کی خبر نہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اور پسر دایہ یا آتون۔ بھائی یا بیٹا یا بھتیجا یا ان کے گھرانے کی کوئی عورت بھی اس امیر کی نوکر ہو۔ کچھ لوگ اِن قیود میں گرفتار ہیں اور کچھ نے دولتِ ظاہری پر نظر کرتے ہوئے اِن پابندیوں کو اٹھا دیا ہے۔ اور کبھی ایسے رشتے بھی ہوتے ہیں کہ عالمِ بے خبری میں بیٹی کسی امیر کے غلام زادے کو دیدی۔ اسی وجہ سے اسلام میں قرابت کے لئے حسب کی قید رکھی گئی ہے۔ کیوں کہ یہ لوگ تو جس کسی کے نام میں مرزا کا لقب دیکھتے ہیں یا اسے چال ڈھال سے معقول پاتے ہیں اور وہ بظاہر صاحبِ مقدور نظر آتا ہے، اس سے قرابت اختیار کر لیتے ہیں اور اِن باتوں کی تحقیق کے چکر میں نہیں پڑتے۔ اور اگر کوئی انصاف سے دیکھے تو غلام کی اصلیت ایک بازاری یا شاگرد پیشہ آدمی کی طرح نہیں ہے۔ کیوں کہ ہندو اور مسلمانوں سے انہیں اشراف زادوں کو بعض حرام زادے شرارت پیشہ جل دے کر لے جاتے ہیں۔ یا قحط کے زمانے میں ان کے ماں باپ انھیں بیچ دیتے ہیں۔ اور وہ لوگ جو تھوڑا سا خدا کا خوف بھی رکھتے ہیں، اُن کو تھوڑی قیمت میں غلام کی حیثیت سے فروخت کر دیتے ہیں۔ اور کچھ بے رحم خدا ناترس ان بے چاروں کو محبوب بنا کر ان کی بہت سی قیمت حاصل کرتے ہیں اس صورت میں اِن لوگوں کا ذلیل ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ مگر فروخت ہونے کے بعد کنجوس لوگوں کی صحبت میں پہونچے۔ مفلس آقا کی خدمت میں دوڑنے، اور رکیک کاموں

کے کرنے، مثلاً سائیسی، باورچی گری، چلم برداری، کی وجہ سے اِن میں رذالت پیدا ہو جاتی ہے۔ البتہ جو شخص متمولِ آقا اور امیر کا موردِ عنایات ہے، البتہ وہ کچھ حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔ اور ہرگز اس میں خساست کا اثر باقی نہیں رہتا۔ اہلِ حزم اور محتاط لوگ البتہ ان کی تعظیم کرنے لگتے ہیں لیکن قرابت داری سے کنارہ کش رہتے ہیں۔ پس شہریوں کی قرابت اس بات پر مقید ہے کہ سید اپنی لڑکی ایسے مغل زادہ کو دیتا ہے جس پر مرزا کا اطلاق ہو سکے اور خواجہ زادہ کو بھی۔ اور شیخوں میں سادات، مرزا اور خواجہ سے قرابت داری نہیں ہوتی، چاہے خواجہ زادہ کی اصل شیخ ہی ہو۔ لیکن جس کسی کو شیخ صاحب کہہ کر پکارا جاتا ہے، اس کا لڑکا شہر میں کسی مرزا یا سید یا خواجہ کا داماد نہیں ہو سکتا۔ اور اگر وہ کسی شیخ کی لڑکی لے لیں تو وہ لڑکی مذکورہ بالا تین فرقوں کی کسی لڑکی کی طرح عزت حاصل نہیں کر سکتی۔ اور افغان کا بھی یہی حال ہے۔ حسین خان ورک زئی نام کا کوئی شخص کسی مرزا حیدر بیگ، و خواجہ نصر اللہ اور میر نور اللہ کا داماد نہیں ہو سکتا؛ اور اگر ہو بھی جائے تو عالمِ ناداری میں یا روٹی کی خاطر ہو گا۔ اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ جیسے بعضے مسلمان اپنی لڑکی فرنگیوں کو دیدیتے ہیں۔ غلام سے مراد، مغل امیر کے غلام ہوتے ہیں یا خواجہ سے، نہ کہ شیخ صاحب کے غلام سے۔ خلاصہ یہ کہ بعضے لوگ قرابت کے وقت طرفین کی شرافت ڈھونڈھتے ہیں اور بعضے والد کی شرافت کو کافی سمجھتے ہیں، اور ماں کے نسب سے کوئی تعلق نہیں رکھتے چاہے وہ کنیز ہو یا رنڈی ہو یا کوئی اور ہو۔ بعضے اپنی حماقت سے اور بہادری کے غرور میں مولویوں اور طبیبوں کو اپنے گروہ سے باہر سمجھتے ہیں لیکن ایسے عقل سے پیدل کم ہی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ جماعت یعنی اطبا اور فضلا عزت میں سپاہی لوگوں کو نہیں پہنچتے۔

نکاحِ بیوگان بیوہ لڑکی کو دوسری شادی سے محروم رکھتے ہیں؛ چاہے وہ سولہ سال یا اس سے بھی کم عمری میں بیوہ ہو گئی ہو۔ اور اس معاملہ میں اِن لوگوں اور تعصبات کے شرفا، کا حال قطعاً ہندوؤں کا سا ہے۔ کہ اپنی انتہائی جہالت کے باعث شریعت کے احکام پر عمل نہیں کرتے۔ ایسا کرنے والے کو نہایت ذلیل، کمینہ اور کم رتبہ سمجھتے ہیں۔ اگر لڑکی بذاتِ خود ہزار مردوں سے تعلق پیدا کرلے تو اس سے نہیں جھجکتے۔ مگر اپنی خوشی اور دلی رغبت سے اس کا نکاح ایک دوسرے مرد سے نہیں کرتے۔

ایک واقعہ سنا گیا ہے کہ ایک ہندوستانی حج و زیارت کے لئے گیا ہوا تھا۔ اور عرب کے کسی شہر میں کسی ضرورت کی وجہ سے چھ مہینہ تک ٹھہر گیا۔ وہاں اس شہر کے رہنے والے ایک شخص سے بہت زیادہ دوستی پیدا کرلی۔ وہ شخص بھی اس خیال سے کہ یہ غریب الوطن اور نووارد تھا۔ ... دوسروں سے زیادہ اُسے عزیز سمجھنے لگا۔ دونوں صبح و شام ساتھ ساتھ رہتے تھے اور دونوں میں بہت دانت کاٹی تھی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ وہ عرب جوان کچھ دنوں تک اُس ہندوستانی کے گھر نہ آیا۔ اور اس نے اس کی جدائی کو بہت زیادہ محسوس کیا۔ ہفتہ دس دن کے بعد وہ ملا۔ صاحبِ خانہ نے اس سے گلہ کرنا شروع کیا۔ اس نے جواب دیا کہ میرے بھائی کیا کروں؟ میری ماں کا فلاں عرب سے نکاح تھا۔ اور میرے سوائے وہاں کوئی ایسا مرد نہ تھا جو مجلس کا انتظام کرتا۔ اس وجہ سے عقد کی رات کو اہل مجلس کو شربت پلانے میں مصروف تھا۔ اور پہلے تین چار دن ضروری سامان جمع کرنے میں گذر گئے۔ ہندوستانی مرد نے یہ بات سن کر لاحول پڑھا۔ اُس کا دوست بہت شرمندہ ہوا۔ اس نے دوستی کو بالائے طاق رکھا اور قاضی کے سامنے آکر حقیقتِ حال بیان کی۔ قاضی نے کچھ لوگوں کو اس کے ساتھ کر دیا تاکہ وہ ہندوستانی

کو گرفتار کر کے لائیں۔ قاضی نے کہا کہ اے شخص باخدا کو حاضر و ناظر جان کر کہو کہ کیا یہ سچ ہے کہ اُس کی ماں کے نکاح کی خبر سن کر تو نے لاحول پڑھی تھی ہندستانی نے جواب دیا۔ بالکل سچ ہے۔ اور میں نے ٹھیک پڑھی تھی۔ کہ میں پینتالیس سال کا ہونے کو آگیا۔ اس مدت میں کبھی بھی ہندوستان میں ایسا قصہ میرے سننے میں نہیں آیا تھا۔ پس ثابت ہوا کہ وہاں کے باشندے سارے کے سارے بے دین اور کافر ہیں، محض نام کے مسلمان ہیں۔ اور شرع شریف کی ہرگز پیروی نہیں کرتے اسلام کے احکام تو یہی ہیں جو اس ملک میں رائج ہیں۔ جب اس برادرِ دینی سے یہ بات سنی تو بے اختیار زبان سے لاحول نکلا اور حیرت اس بات پر ہوئی کہ ہم نے پینتالیس سال اپنی عمر عزیز کے کافروں میں ضائع کئے۔ الحمد للہ اب مسلمانوں کی معاشرت نصیب ہوئی ہے۔ قاضی نے کہا کہ اگر تم نے اس نیت سے کہا، تو اللہ کی تم پر رحمت ہو۔ تم گنہگار نہیں ہو۔ پس اس عرب کو اشارہ کیا تاکہ اُس ہندوستانی سے بغل گیر ہو کر صاف دلی سے معذرت کرے۔ اور دونوں آپس میں شیر و شکر ہو کر وہاں سے رخصت ہوئے۔

رسوماتِ شادی مختصر یہ کہ ہندوستان کے مسلمان بیٹے اور بیٹی کی شادی میں چند رسموں کو چھوڑ کر جیسے آگ کے گرد چکر لگانا، باقی ساری رسمیں ہندوؤں کی طرح کرتے ہیں۔ جیسے لڑکی اور لڑکے کو زرد کپڑے پہنانا اور کلائی میں ریشمی کلادہ باندھنا، عقد سے فارغ ہونے تک دولھا کا ہاتھ میں لوہے کا ہتھیار پکڑے رہنا۔ اور اسو ہے ہیں عورتوں کا ستھنی گانا۔ عام تجمّل اور آرایش کے ساتھ دولھا کا دولہن کے گھر ساچق لے جانا جو اہلِ ہند سے مخصوص ہے۔ لیکن نکاح میں اختلاف واقع ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ شبِ عروسی سے پہلے پڑھتے ہیں اور بعضے اسی رات کو اور بعض خاندانوں میں دولہا اور دلہن کے ماں باپ اور طرفین کے دیگر اقرباء کے

درمیان ظرافت کا بھی رواج ہے ۔ اور ساقدوش دمقنع شہر میں بہت کم ہے ۔

ساچق مختصر یہ کہ ساچق کے دن دولہا کو مسند پر . . بٹھاتے ہیں اور چھوٹے اور بڑے اس کے دائیں بائیں بیٹھتے ہیں ۔ باپ ، چچا ، ماموں اور بڑے بھائی کو بھی اس مسند سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ۔ ساچق کی صورت یہ ہے کہ مٹکیوں کو پوت کر اُن پر پھول بوٹے بناتے ہیں ۔ ان میں نُقل بھری جاتی ہے جو شکر اور چنے سے تیار ہوتی ہے ۔ اور پستہ ، بادام اور مصری سے پُر کرتے ہیں اور چار مٹکیوں کو ایک تخت پر رکھتے ہیں ، ہر ایک تخت کو ایک مرد اٹھاتا ہے ۔ اور ان تختوں کی کمی وبیشی لڑکے کے والد کی مالی حالت پر مبنی ہے ۔ اور اسی طرح آرائش کے تختے جو کاغذ اور ابرق کو کاٹ چھانٹ کر کاغذی پھول کے درختوں کو سبز پھولوں کے ساتھ ان تختوں میں جماتے ہیں ، اور میوہ دار درخت بناتے ہیں جیسے سیب انجیر ، انگور ، انار اور دوسرے ہندوستانی میوے مثلاً از قسم نارنگی اور شریفہ اور ان کے علاوہ پری طلعت عورتوں اور ہر قسم کے مرد یعنی مغل ، فرنگی اور دکھنی لوگوں کے کاغذی مجسمے بنا کر سب کو جدا جدا ایک تخت پر بٹھاتے ہیں ۔ اور یہاں بھی چیزوں کی کمی وبیشی طرفین کی حیثیت پر موقوف ہے ۔ اور علاوہ ازیں قند اور میوہ کے چند خوان ہوتے ہیں ۔ اور پھولوں کے ہار اور دوسرے زیور مثلاً بازو بند ، اور دست بند دلہن کے لئے بناتے ہیں اور اپنے آشناؤں اور بھائی بندوں کو ساتھ لے کر حسب حیثیت ہاتھی یا گھوڑے یا میانہ پر اور عورتوں کو حیثیت کے مطابق میانہ ، چوپالہ اور ڈولی پر سوار کر کے اور دولہا کو ہاتھی پر اور بعضے اپنے خاندان کی رسم کے مطابق گھوڑے پر بٹھا کر اس شان وشوکت کے ساتھ نقارہ اور نوبت بجاتے دولہن کے گھر تک جاتے ہیں ۔

شیخ فرید کا پوڑہ سب سے زیادہ لطف کی بات یہ ہے کہ شیخ فرید ، جو حضرت عمر

کی اطلا دیں ایک بزرگ ہوئے ہیں۔ جن کا مزار ملتان کے پاس پٹن نامی جگہ میں زیارت گاہِ خلائق ہے اور جو خواجہ معین الدین چشتی کے خلیفہ اور مرید خواجہ قطب الدین کے مرید تھے اور امیر خسرو کے پیرو مرشد شیخ نظام الدین بدایونی کے مرشد تھے جو نظام الدین اولیا، سلطان المشائخ کے نام سے مشہور اور شاہ جہان آباد میں مدفون ہیں، چناں چہ آج تک ان کی اولاد پٹن میں چوتھی محرم کو، اُن کے عرس کے دن رنڈیوں کے ناچ میں رات رات بھر جاگتی ہے۔ مسلمانوں کی شادی میں بھی ان کا دخل کُل ہے۔ یہاں تک کہ شیعوں میں بھی یہ رسم ہے کہ وہ بھی شکر لے کر اسے کاغذ میں باندھتے ہیں اور اس کو بابا فرید کا پوڑہ کہتے ہیں۔ اور وہ ساچق کے دن دوسری چیزوں کے ساتھ دلہن کے گھر جاتا ہے۔ جب شیعوں کا یہ حال ہے تو پھر سنّی جو ان سے دل وجان عقیدت رکھتے ہیں کیوں نچلے بیٹھنے لگے۔

اگر کوئی چاہے کہ شادی میں بابا فرید کا پوڑہ نہ ہو تو ممکن نہیں کہ اُس کی بات اثر کر جائے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہندوستان میں شادی عورتوں کے اختیار میں ہوتی ہے۔ اور عورتیں اگر وہ چیزیں جو شادی بیاہ کے لوازم میں سے ہیں، شادی میں نہ پائیں تو ملول اور کبیدہ خاطر ہو جاتی ہیں اور اس شادی کو مبارک نہیں سمجھتی ہیں۔ چوں کہ سنّی لوگوں کے گھروں میں ایک امیر سے لے کر فقیر تک یہی رسم جاری وساری تھی، اثنا عشری مذہب کی عورتوں نے بھی یہ رسم اپنالی۔ اب یہ رسم ہر ایک گھر میں رائج ہو گئی۔ اگر کوئی شخص اس کو توڑنا چاہے تو عورتوں کو بدشگونی کے خیال سے ساری رات نیند نہیں آتی اور اس قسم کی شادی کو بہت برا اور منحوس خیال کرتی ہیں۔ اور شادی کے بعد جو کچھ مثلاً درد سر، درد شکم، بخار، داماد کی قوتِ باہ میں فساد اور اولاد کی موت یا دولہا دولہن کی موت سامنے آتی ہے۔ اس کو اس رسم کے توڑنے کے سبب سے سمجھتی ہیں،

عورتوں کے نزدیک جو کچھ ہوتا ہے، اس کی وجہ رسومات کا ترک کرنا ہوتا ہے۔

توہم پرستی | بعض گھروں میں کنواری ہونا مبارک نہیں سمجھا جاتا۔ اسی طرح مربّہ اور اچار بھی مدّت العمر دوست کے گھر سے یا بازار سے لے کر کھاتے ہیں گھر میں تیار نہیں کرتے۔

مختصر یہ کہ جب دولہن کے گھر پہنچ جاتے ہیں تو دولہا کو اس مسند پر بٹھاتے ہیں جو دولہن کے گھر والوں نے اس کے لئے بچھائی ہوتی ہے۔ اور یہ خلعت اُس کے سوا ہوتا ہے جو اس کے پیلے کپڑے پہن کر خانہ نشین ہونے کے دن آتا ہے۔

اور کھانا اور جوڑہ دلہن کے گھر سے دولہا کے لئے آتا ہے، اس کے لئے زرِ نقد بھی دیا جاتا ہے۔ یہ شادی کی ضروری شرط ہے۔ اسے خلعت میں شامل سمجھا جاتا ہے۔ اس مد میں سو روپے تو مفلس آدمی بھی دیتا ہی ہے۔ ورنہ ہزاروں تک نوبت پہونچتی ہے۔

رقص و سرود | چوں کہ یہ قاعدہ ہے کہ دولہا کی سواری کے ساتھ ناچنے والی بھی عروس کے گھر جاتی ہے۔ لہٰذا دولہا کے بیٹھنے کے بعد رقص شروع ہوتا ہے۔ جب دو پہر رات گذر جاتی ہے تو گلاب سے معطر کیا ہوا مصری کا شربت پیش کیا جاتا ہے لیکن یہ شربت شیشۂ جالیسری میں خاص طور پر لایا جاتا ہے اور اس کو نفیس کپڑے سے ڈھانکتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ دولہن کے طرف کے لوگ ارباب عزت اور معزز حضرات اس شربت کو اس صورت سے مجلس میں لاتے ہیں کہ جگ تو ایک کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور چینی یا شیشہ کے چھوٹے چھوٹے پیالے چاندی یا کسی دوسری دھات کی تھالی میں رکھے ہوئے کسی دوسرے آدمی کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ پہلے شربت دولہا کو پلاتے ہیں۔ اُس کے بعد دوسروں کو۔ دولہا کو یہ لازم ہے

کہ شربت کے چکھنے کے بعد پانچ روپے یا کم یا ایک دو اشرفی اس تھال میں، جو پیالے کے نیچے ہے، اپنے ہاتھ سے ڈال دے۔ پھر کلی کرتا ہے اور ایک دو روپے یا اس سے زیادہ لگن میں بھی ڈالتا ہے۔ اور دوسرے لوگ بھی شربت چکھنے کے وقت زرِ نقد تھالی میں ڈالتے ہیں۔ لگن میں ڈالنا اُن کی خوشی پر مبنی ہے۔ اگر ان کی حیثیت ہو تو کوئی مضائقہ نہیں؛ ورنہ لازمی نہیں ہے۔ اور اگر تھالی میں نہ ڈالیں تو مجلس کے لوگوں میں ذلیل ہوں گے۔ یہ شربت چکھنے کے لئے ہوتا ہے پینے کے لئے نہیں۔ بعضے تو لبوں سے چھو کر پیالہ رکھ دیتے ہیں۔ مگر مقررہ رقم تھالی میں ضرور ڈال دیتے ہیں۔

ہندوؤں کی شرکت صاحبِ مجلس سے آشنائی کی وجہ سے ہندو لوگ بھی اس مجلس میں شریک ہوتے ہیں اور قاعدہ کے مطابق یا بے خبری میں شربت ان کے سامنے لے جایا جاتا ہے۔ بے چارے بِنا چکھے اپنی حیثیت کے مطابق تھال میں زر ڈال دیتے ہیں۔

اس کے بعد دولہا اُسی شان و شوکت کے ساتھ اپنے گھر واپس آتا ہے۔

حنابندی ساچق کے اگلے دن یا اس کے دو تین دن بعد اگر کوئی وجہ مانع نہ ہو تو شب حنا بندی قرار پاتی ہے۔ اُس کا طریقہ یہ ہے کہ دلہن کے گھر سے اس طرف کے لوگ دولہا کے واسطے مہندی اس صورت میں لاتے ہیں کہ آرائش کے تختے جو ساچق کے روز دولہا کے گھر سے آئے تھے، اسی جگہ چھوڑ دئے جاتے ہیں۔ کیوں کہ قاعدہ یہ ہے کہ واپسی کے وقت داماد کے ساتھ آرائش واپس نہیں آتی۔ بلکہ حنا بندی کی رات کو دلہن کے گھر سے اُس کے گھر پہونچا دیتے ہیں تاکہ شادی کی رات کو فریقِ ثانی اسے دوبارہ برات کے ساتھ لے کر آئے۔ اور دوسرے سامان۔ مثلاً نقارہ، ضروری ساز اور آتش بازی کے ہمراہ بھائی اور

دولہا کے ہمراہی دوسرے عورت و مرد اور رقص کرنے والی عورتیں آگے آگے ہوں. لیکن دولہا کے ماں باپ اور بڑا بھائی جو عمر کے لحاظ سے باپ کے برابر ہو، حنا کے ہمراہ نہیں جاتا بلکہ ساچق کے روز اور شادی کی رات کو بھی مجلس میں نہیں بیٹھتا. اگر کسی ضرورت کی وجہ سے بیٹھے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ اور باپ کسی بھی صورت میں نہیں بیٹھتا۔ اور جو لوگ بیٹھتے ہیں وہ خالص ہندوستانی نہیں ہیں۔

بہر حال دولہا کے گھر سے ساچق کے آنے کا شام کا وقت مقرر ہے۔ اور حنا رات کو لاتے ہیں۔ اس کا وقت مقرر نہیں ہے کہ اول شب میں لائیں یا آخر شب میں. بعض لوگ رات کا چوتھائی حصہ نہیں گذرنے پاتا کہ حنا پہنچاکر اور شربت پی کر واپس چلے آتے ہیں۔ اور بعضے آدھی رات تک نوبت پہونچا دیتے ہیں۔ اور بعض لوگ تو جب رات کا آخری حصہ باقی رہ جاتا ہے اس کام سے فارغ ہوتے ہیں. مختصر یہ کہ حنا پہونچانے کے بعد دولہا کو زنان خانے میں بلاتے ہیں تاکہ رشتے کی سالیاں اُس کے ہاتھوں پاؤں میں مہندی لگائیں: اور جب عورتیں مہندی لگا چکتی ہیں تو دولہا کو چاہیئے کہ اپنی حیثیت کے مطابق ان کو کچھ روپے دے. جس کو ہندی میں نیگ کہتے ہیں۔ ان میں سے جو کوئی دولہا سے عمر میں بڑی ہوتی ہے دولہا کو سلامی دیتی ہے۔ اور یہ بہت آسان ہے کیوں کہ جو زر دولہا ان کو بطور نیگ دیتا ہے، دوسرے چند روپیوں کے ساتھ پھر اُسے مل جاتے ہیں۔

مختصر یہ کہ حنا بندی کی حالت میں باہر دولہا کے طرف کے لوگوں کے سامنے مردانہ مجلس میں دونوں طرف کی ناچنے والیاں باری باری رقص کرتی ہیں اور عورتوں کی مجلس میں ڈومنیاں (سرودِ بدھائی) گاتی ہیں. اُس رات کو

اس مجمع کی ہر عورت حسب منشا، دولہا کو فحش باتیں سناتی ہے۔ کوئی شخص اس کے حال پر مزاحم نہیں ہوتا۔ وہ بے چارہ کان لٹکائے سنتا رہتا ہے، چاہے وہ عورتیں اتنی بے حیثیت ہوں کہ ان سے زیادہ بے مرتبہ اور کوئی نہ ہو۔ اور یہ عورتیں ساس کی کنیزیں، یا دایہ کی لڑکیاں، کنجڑنیں یا بھنگنیں ہی کیوں نہ ہوں کیوں کہ یہ سب اس کو اپنا داماد سمجھ کر اِن حرکات کا ارتکاب کرتی ہیں۔ اور دولہا کے ماں باپ اور بہنوں کی خوشی سے ان کی خوشی کم نہیں ہوتی۔ اور اپنے خیال میں اس دن بہتر سے بہتر لباس جو ان کے گھر میں ہوتا ہے، پہنتی ہیں اور گھر کی مامائیں بھی دولہا سے خاص ربط رکھتی ہیں۔ اور مہترانی بھی صبح و شام گھر میں آتی جاتی رہتی ہے اور اس کا شوہر (مہتر) دیوان خانے میں کماتا ہے کیوں کہ وہ حرم سرا میں باریاب نہیں ہو سکتا۔ اور مالن بندھوار لاتی ہے جو دولہا دولہن کے دروازے پر باندھی جاتی ہے۔ اور علاوہ ازیں دونوں گھروں میں میوے اور سبزی بھی پہونچاتی ہے۔ لیکن ان میں سے ہر ایک کے گھر بندھے ہوئے ہوتے ہیں۔ مذکورہ عورتوں کا تعلق دولہا کے گھر سے ہے اور اس صفت سے موصوف عورتیں دولہن کے گھر سے متعلق ہیں۔ اور دوسری عورتوں مثلاً سقہ کی بیوی وغیرہ کا بھی ایسا ہی حال ہوتا ہے۔ جب یہ بے قدر پیچ عورتیں انتہا فحش بکتی ہیں اور ذرا سا بھی نہیں جھجکتی ہیں تو اس سے قیاس کر لینا چاہئے کہ گھر والی عورتیں کیا کچھ نہ کہتی ہوں گی۔ سالیاں بھی ایسی ہی چھیڑ خانی کی باتیں کرتی ہیں۔ ضروری مراسم کے ادا کرنے کے بعد اسی طرح سے شربت پلایا جاتا ہے جس طرح دولہا والوں کی طرف سے سسرال والوں کو شربت پلایا جاتا ہے، جس طرح سسرال والوں نے دولہا والوں کو پلایا تھا۔ اور تھالی میں روپیہ لے کر سمدھن کو دیدیا جاتا ہے۔ اِس کے بعد مرد اور عورتیں رخصت ہو کر گھروں کو واپس ہوتے

جز (۱۰) ہفت تماشائے مرزا قتیل،

ہیں۔ اس کے اگلے دن شبِ عروسی ہوتی ہے۔ یہ بات پوشیدہ نہ رہے کہ ساچق اور حنابندی کی رات میں فصل ہو جانا تو قدیم رسم ہے اور اس میں کوئی قباحت نہیں لیکن مہندی اور شادی کی رات میں کوئی فصل نہیں ہو سکتا۔

برات | مختصر یہ کہ جب برات کی رات آتی ہے تو سرشام ہی سے برادری کے لوگ اور دوست و احباب، وضیع و شریف، دولہا اور دولہن کے گھر جمع ہونے لگتے ہیں۔ اور اسی وقت سے دولہا زرد لباس پہن کر مسند پر بیٹھ کر عورتوں کے رقص کا تماشا دیکھنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ جب ناچنے والیوں میں سے ایک عورت ناچتے ناچتے تھک جاتی ہے تو اس مجمع کا منتظم جسے بھڑوا کہتے ہیں، مجلس کے کسی معمر آدمی کے اشارے پر اسے بیٹھنے کا حکم دیتا ہے اور کسی دوسری طوائف کو ناچنے پر مامور کرتا ہے۔ اس موقع پر یہ ضروری ہے کہ دولہا اس طوائف کے سامنے جو رقص کر چکی ہے، عطر، پان ددھنیا جو چاندی کے برتنوں میں ہوتا ہے، پیش کرے۔ اسی وقت ان برتنوں کو پھر ان چیزوں سے بھر دیتے ہیں تاکہ دوسری بار کام آئیں۔ اور دولہا کے سوار ہونے کے وقت تک یہ ہنگامہ اسی طرح جاری رہتا ہے۔

بعض گھروں میں یہ رسم ہے کہ دولہا کو رات کے آخری وقت میں سوار کرتے ہیں۔ اس کی تفصیل یوں ہے۔ کہ پہلے اس کو غسل کرا کر، زردوزی کا لباس جو مع سہرا کے پراچہ کے گھر سے کرایہ پر آتا ہے، پہنائیں۔ اس کے بعد اس کے سر سے سہرا لٹکاتے ہیں۔ بعدازیں اس کے گلے اور کاندھوں پر پھولوں کی بدھیاں ڈالتے ہیں۔ جب اس کام سے فارغ ہو جاتے ہیں تو اس خاندان کی رسم اور آئین کے مطابق ہاتھی پر یا گھوڑے پر سوار کر کے بڑے تجمل کے ساتھ یعنی آرائش، روشنی، آتشبازی اور ساز و نوبت خانہ کی قسم کی دوسری چیزوں کے ساتھ دولہن کے گھر کے لئے روانہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ فیل نشان سب سے آگے ہو۔

اس کے بعد آرائش اور آرائش کے پیچھے تختِ رواں. یعنی ناچنے والی عورتوں کے چند تخت جن کو زرباف کے کپڑوں سے سجا کر مالک ان طوائفوں کو ہر ایک تخت پر بٹھاتے ہیں، اور جیسا کہ لکھا جا چکا ہے یہ سب چیزیں کرایہ پر لائی جاتی ہیں۔ مذکورہ طوائفیں دولھا کے پیچھے تختِ رواں پر کھڑے ہو کر بدھائیاں گاتی ہیں، اور اصول کے مطابق تھوڑا ہاتھ کو اوپر اٹھاتی ہیں. لیکن یہ عورتیں عزت دار نہیں ہوتیں، سب کم قدر ہوتی ہیں۔ ورنہ اگر کوئی شخص دس ہزار روپے بھی دے تو بھی طوائف تخت پر نہ بیٹھے گی۔ اگر تفریحِ طبع کی غرض اور خوش اختلاطی کے سبب سے چند گھڑی بیٹھ جائے تو کوئی مضائقہ نہیں. کسی کی خاطر سے نہیں بیٹھے گی. کیوں کہ عورتوں کا تخت پر بیٹھنا، مرد کے کاندھے پر سوار ہونے کے برابر ہے۔ اور یہ جو کہا گیا کہ تفریحِ طبع کے لئے بیٹھے تو بیٹھے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ انسان اپنے گناہ کے پاداش میں اپنے ہمعصروں اور برابر والوں میں ذلیل ہوتا ہے۔ ورنہ تقدیر سے کسی کو بھی چارہ نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص چوری میں پکڑا جائے اور ایک عادل حاکم کے حکم سے اس کا ہاتھ کاٹ لیا جائے تو اس کی مخلوق کے نزدیک ناک کاٹے جانے کے برابر ذلّت نصیب ہوتی ہے اور اگر وہی ہاتھ جنگ میں کٹ جائے تو اس کی عزت دوبالا ہو جاتی ہے. اسی طرح کھیلنے والے لڑکے اور نوجوان ہمیشہ ورگدھے پر سوار ہو کر اسے ادھر ادھر گھماتے پھرتے ہیں تو اس سے کوئی بھی ذلیل وخوار نہیں ہوتا ہے۔ صرف اتنا ہے کہ بڑے بوڑھے ناراض ہوتے ہیں. مختصر یہ کہ نوبت کے علاوہ دوسرے ساز بھی آرائش کے ہمراہ ہوتے ہیں۔ اور دولہا کے گھوڑے یا ہاتھی کے سامنے روشن چوکی بجاتے ہیں۔ روشن چوکی سے مراد مٹی کے دو چھوٹے نقارہ ہیں جن کو لکڑی سے نہیں ہاتھ سے بجاتے ہیں۔ اور اس کی آواز کو بانسری کی آواز سے رنگین تر کرتے

ہیں۔ قاعدہ ہے کہ ساز بجانے والے دولہا کے باپ اور دوسرے بزرگوں کے آگے آگے بشرطیکہ بازاری ہوں، پاپیادہ دولہا کے گھوڑے کے ساتھ چلتے ہیں اور یہ جماعت ہندو بزازوں اور کم مایہ صرافوں اور علاقہ بند مسلمانوں وغیرہ اور اسی طرح کے دوسرے لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ روشن چوکی بجانے والے بانسری بجاتے ہوئے اپنے چہروں کو اُن کی طرف کرتے ہیں اور انتظار کرتے ہیں اور ساز بجانے میں بڑے اہتمام سے کام لیتے ہیں۔ اور جب تک دولہا کا باپ یا اُس کے دوسرے رفقاء انہیں بطور انعام کوئی چیز نہیں دیدیتے اس وقت تک اس جگہ سے اپنا قدم آگے نہیں بڑھاتے۔ بعضے چار پانچ پیسے دیتے ہیں اور بعض لوگ اُسی مقدار میں چاندی جو ہیئت میں روپے کی شکل کی ہوتی ہے، انعام میں دیتے ہیں۔ اگر اس سے زیادہ دیدیں تو ان کا دیوالہ پٹ جائے۔ کیوں کہ یہ لوگ سخت لالچی ہوتے ہیں۔ دس قدم بھی آگے نہیں چلیں گے اور پھر رُک جائیں گے اور دولہن کے گھر تک ایسا ہی ہوگا۔ اور اگر ہر مرتبہ ایک ایک روپیہ بھی دیا جائے تو وہاں تک پہونچنے کے لئے بہت سا روپیہ چاہیئے۔ یہ رسم رذیل مسلمانوں کی اور شریف ہندوؤں کی ہے۔ لیکن وہ ہندو جو امیروں، وزیروں اور سلطانوں کے ملازم ہیں اور بعضے صاحب مقدور مہاجن اس بلا سے محفوظ ہیں۔

یہ ذکر بطور جملہ معترضہ تھا۔ اب میں اپنے اصلی بیان کی طرف آتا ہوں، دوسرے تمام لوگ گھوڑے اور ہاتھی کی سواری پر دولہا کے پیچھے ہوتے ہیں اور برات مہتمم لوگوں کے سوائے براتیوں میں سے کوئی بھی شخص دولہا کی سواری سے آگے نہیں چلتا۔ جب دولہن کے دروازے پر پہونچتے ہیں تو بعض لوگ دولہا کے لئے گھر کا دروازہ بند کر دیتے ہیں۔ اور جس وقت تک دھنگانا، جو راجپوتوں کی رسم ہے اور جس کا اوپر ذکر آچکا ہے، نہیں لے لیتے، دروازہ نہیں کھولتے۔ مختصر یہ کہ اس

زر کے دید ینے یا دینے کا وعدہ کرنے کے بعد دولہا کو مسند پر بٹھا دیتے ہیں اور رقص شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر شبِ عروسی سے پہلے نکاح عمل میں آ گیا ہو تو دولہا کو حرم سرا میں طلب کیا جاتا ہے۔ ورنہ نکاح کے بعد بلایا جاتا ہے اور وہی شربت، جس کا ساچق کے ضمن میں ذکر آ چکا ہے۔ پھر شبِ عروسی میں براتیوں کو پلاتے ہیں۔ اگر نکاح پہلے ہو چکا ہے تو شربت دوبارہ پلایا جاتا ہے یعنی ایک بار ساچق میں اور ایک بار شبِ عروسی میں؛ اور اگر پہلے نکاح ہو چکا تھا تو تین بار شربت پلایا جاتا ہے، ورنہ دو بار۔ اور ہر تینوں یا دونوں مرتبہ تھالی کے بھاگ جاگ جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ جب دولہا عورتوں کی مجلس میں جاتا ہے تو وہاں ایسی رسمیں ادا ہوتی ہیں جن کے اظہار سے وہ مردوں میں شرماتا ہے۔ تیرہ چودہ سال کا داماد ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ وہ اس کو برداشت کر لیتا ہے۔ اس سے زیادہ عمر ہو تو اِس میں رسوائی ہے۔ حالانکہ شادی کے دن ڈاڑھی اور مونچھ والے مرد کو زرباف کا جامہ اور پھولوں کے ہار پہنانا اور سہرا باندھنے سے بھی لوگ اُس پر ہنستے ہیں کیوں کہ یہ بھی ایک کم عمر کے دولہا کو زیب دیتا ہے۔ لیکن عورتوں میں جو چھیڑ چھاڑ سے رسوائی ہوتی ہے وہ اس سے بھی زیادہ ہے۔ مختصر یہ کہ اس طرح کی شادی ایک امرد کے لئے مناسب حال ہے؛ لیکن ڈاڑھی مونچھ والے کے لئے نکاح سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔

ایک خاص رسم رسموں میں سے ایک رسم یہ ہے کہ بعضے گھروں میں دولہا کے منہ میں لگام لگا کر، لگام دولہن کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ اور اکثر اس کو گھوڑے کی طرح کھڑا کر کے اس کی پیٹھ پر زین رکھتے ہیں اور دولہن کو اس پر سوار کرتے ہیں تاکہ جس طرف کو وہ عنان گھمائے دولہا بھی اُسی طرف کو گھومے اس حرکت کی علتِ غائی دولہن دولہا کا اتحاد ہے۔ یعنی تمام عمر ایک ایسے

گھوڑے کی طرح جو اپنے سوار کا تابعدار ہوتا ہے، شوہر بھی اپنی بیوی کا تابعدار رہے۔ کبھی یہ رسمیں صبح تک تمام ہو جاتی ہیں اور کبھی دن نکلنے تک چلتی رہتی ہیں۔ اِن کے بعد سٹھنیاں گائی جاتی ہیں جو فحش سے بھری ہوتی ہیں۔ ان میں داماد کے ماں باپ کی مذمت بھی ہوتی ہے۔ دولہا باہر آجاتا ہے تو دولہن کو پالکی میں سوار کرتے ہیں جس پر زربفت کا یا سادہ غلاف چڑھایا جاتا ہے۔ پھر اسی شان و شوکت کے ساتھ جیسے رات کو برات آئی تھی۔ صبح کو براتی رخصت ہوتے ہیں اور آگے آگے آتش بازی چھوٹتی جاتی ہے۔ تختِ رواں بھی ہوتا ہے اور دولہن کا جہیز بھی۔

جہیز | جہیز کا حال یہ ہے کہ دولہن والے کی حیثیت پر موقوف ہے۔ بعض لوگ ایک ہاتھی یا دو ہاتھی مع نقرئی ہودج کے اور چار پانچ گھوڑے مع سنہری و روپہلی زین و اسباب کے اور چند اونٹ جن پر عمدہ لباس اور برتن اور آفتابے مٹکے، تانبے کے برتن اور چاندی کی تھلیاں مزدوروں کے سر پر لادکر اور عمدہ سامان سے بھرے ہوئے صندوق اور سونے یا چاندی کا چھپر کھٹ بھی جہیز میں دیتے ہیں۔ یہ سب سامان دولہا کے گھوڑے اور دولہن کی پالکی کے آگے آگے روانہ کرتے ہیں۔ جہیز اس سے بھی زیادہ ہوتا ہے لیکن اس کا تعلق بیٹی والے کے حوصلے اور حیثیت سے ہوتا ہے۔ اور یہ رسم ہندوستان کے تمام باشندوں میں جاری ہے۔ کیا ہندو اور کیا مسلمان۔ ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق داماد کو جہیز دیتا ہے۔

فرقۂ کنبوہ اور رسمِ جہیز | صرف کنبوہ جہیز نہیں دیتے اور عروس کے گھر ساچق بھی نہیں لاتے۔ اور نکاح میں یا شبِ عروسی کو یا حنابندی کی رسم کے موقع پر شربت پلانے کے بعد براتیوں سے نیوتہ بھی نہیں لیتے۔ کیوں کہ یہ لوگ فرطِ غیرت سے ان

کاموں کو مکروہ سمجھتے ہیں۔ شادی کے بعد لاکھ دو لاکھ جو کچھ بھی میسر ہوتا ہے، نقد اور جنس کی صورت میں داماد کو پہنچا دیتے ہیں۔ لیکن داماد کے ساتھ ساتھ جہیز نہیں بھیجتے۔ تاکہ دوکان دار، راہ گیر اور دوسرے تماشہ بین گھروں کی چھتوں کے اوپر سے اس کو دیکھیں۔ اسے یہ لوگ اچھا نہیں سمجھتے۔ اور شربت پلانے کے بعد روپے اس لئے نہیں لیتے کہ بعض نادار حاضرین شرمندہ ہوں گے۔ یا بعض لوگ قرض لاکر دیں گے اور انھیں زیر باری ہوگی۔ وہ ان رسموں کو مذموم سمجھتے ہیں، چاہے وہ مذموم نہ ہوں۔ لیکن دوسروں کی شادی میں اِن رسموں پر روپیہ بے دریغ خرچ کرتے ہیں۔ اور آج سے پہلے اس فرقے کے مسلمانوں میں یہ رسم بھی تھی کہ اگر اِن میں سے کسی کا داماد نکاح کے بعد اور رخصتی ہونے سے پہلے ہی ارا گیا، یا کسی مرض میں گرفتار ہو کر گذر گیا تو لڑکی بیوہ عورتوں کا لباس پہن لیتی تھی۔ لیکن اب یہ بات نہیں رہی اب دوسرے مسلمانوں کی طرح یہ بات صرف نکاح کے بعد ہی ہوتی ہے۔ نکاح سے پہلے، اپنی لڑکی کا عقد کسی دوسرے شخص سے کر دینا بھی اب جائز ہو گیا ہے۔ مگر بعض خود سر اور خود رائے مسلمان آج تک اسی رسم کو اچھا سمجھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ کسی داماد سے منگنی کر دینا اور پھر دوسرے سے عقد کر دینا غیرت سے بعید ہے۔ یہ غیرت بھی ایسی ہی ہے جیسے ڈاڑھی منڈانا، کیوں کہ چاہے ان کا سر اڑا دیا جائے لیکن ڈاڑھی مونڈنے سے باز نہیں آتے۔ اور اسے اپنے ہم چشموں میں آبرو کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

بہر حال دو لہا دولہن ایک بستر پر سوتے ہیں اور کچھ ہو رہتا ہے؛ تو عورتیں ساز کے ساتھ ترانۂ تہنیت گانا شروع کرتی ہیں۔ اور خون آلود وہ چادر جس پر وہ دونوں سوئے تھے، دولہن کے گھر بھیجی جاتی ہے تاکہ برادری اور پڑوس کی عورتیں اسے دیکھ لیں؛ اور جس رات کو داماد دولہن سے پہلی بار ہم آغوش ہوتا ہے

تو بعض عورتیں بھی پردے کے پیچھے کھڑی ہو جاتی ہیں اور پردے کی آڑ میں سے تاک جھانک کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض شرمیلی طبیعت کے لوگ اُس رات کو کچھ نہیں کرتے اور عورت اور مرد کے موردِ طعن و تشنیع ہوتے ہیں۔ خون آلودہ چادر دولہن کے گھر جانے کے بعد پنجیری پکا کر تقسیم کرتے ہیں۔ پنجیری میں خربوزہ کے بیج، شکر اور گھی کے ساتھ بھون کر میدے یا سوجی میں ملائے جاتے ہیں۔ یہ خوشی دولہن کے ماں باپ کے لئے اصل شادی سے زیادہ ہوتی ہے اور ٹھیک بھی ہے۔ کیوں کہ اگر اس موقع پر داماد کی قسمت سو جائے اور وہ کچھ نہ کر سکے تو سارے رنگ میں بھنگ مل جاتی ہے۔ اور اگر پہلے ہی سے اِن چیزوں میں کوئی کور کسر رہ جائے اور یہ شادی ظہور میں آئے تو سارا غم و غصہ جو اس قصور کے واقع ہونے سے دل میں پیدا ہوا ہو، کافور ہو جاتا ہے۔

رسم چوتھی جب شادی کو چار دن گذر جاتے اور دولہن اپنے شوہر کے ساتھ میکے واپس جاتی ہے تو دونوں خاندانوں کی عورتیں وہاں جمع ہوتی ہیں اور فرطِ خوشی سے رنگین پانی ایک دوسرے پر چھڑکتی ہیں۔ اور سب کے کپڑے رنگ دیتی ہیں۔ اِس کے بعد پھولوں کے زیور مع چند ٹوکریوں کے جس میں ہری ترکاریاں، مثلاً بیگن، شلجم، اور دوسری ایسی ہی چیزیں اور پھل پھلار یا فصلی میوے مثلاً خربوزے ہوتے ہیں، اور ہندوانہ وغیرہ داماد کے گھر سے لے جا کر دولہا دولہن کو بنھاتے ہیں اور فریق ثانی کے زن و مرد متفق ہو کر یہی پھل اور ترکاریاں داماد کے اور دولہن کے اور ان کے قبیلے کی عورتوں کے پھینک کر مارتے ہیں۔ اسی طرح دولہن والیاں بھی کرتی ہیں۔ دولہا بھی خوب زور سے پھل اور ترکاریاں اُن پر پھینکتا ہے۔ یہ مجلس چوں کہ حرم سرا کی عورتوں میں ہوتی ہے سوائے بچوں کے اور دولہن کے چھوٹے بھائیوں کے اور کوئی مرد وہاں بار نہیں پا سکتا۔ اِن ترکاریوں اور پھلوں کے علاوہ چوب گل،

یا باریک اور منقش زردوزی کا کام کئے ہوئے سیاہ و سرخ لکڑی کے گولے یا
زردوزی سے کڑھی ہوئی گیندیں بھی اس جنگ میں استعمال ہوتی ہیں. لیکن
افسوس ہے اس داماد پر جو کار ضروری نہ کر پائے اور یہ چوٹیں اس کے نصیب میں
ہوں. کیونکہ اُسے تو عورتیں لعن طعن کے زخموں ہی سے مار ڈالتی ہیں اور اس
جنگی کھیل میں چوٹ پھینٹ بھی لگ جاتی ہے. عورتیں اور بچے دھڑا دھڑ گرتے
ہیں، منھ سوج جاتے ہیں، اور پٹھانوں میں تو بعض بعض کی بینائی جاتی رہتی ہے۔

نذر و نیاز کی رسمیں ہندوستان کی شیعہ عورتیں، سُنی عورتوں کے اثرِ صحبت
اور اپنی جہالت کے باعث بعض اکابرِ صوفیہ کی نذر کا کھانا پکاتی ہیں. اور ان کو
مِن جملہ اولیاء و مشکل کشا سمجھتی ہیں. مثلاً سید جلال بخاری، جو امام زماں علی نقی،
علیہ السلام کے لڑکے جعفر کذاب کی نسل کے ایک مرد تھے. ان کے والد کا نام
سید ابو المؤید تھا. وہ سہروردی سلسلے میں شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی سے بیعت
تھے، جو شیخ شہاب الدین سہروردی کے خلیفہ تھے. اور مخدوم جہانیاں جہانگرد
ان کے نواسے تھے. بچوں کی سلامتی کے لئے عورتیں چاول پکا کر مٹی کے برتن
میں بھرتی ہیں اور دہی اور شکر اس پر ڈال کر شریف اور غریب مسلمانوں کو کھلاتی
ہیں. اور سید احمد کبیر، جن کا مزار راجپوتوں کے ملک میں پہاڑ کی ترائی میں واقع
ہے، ان کی نذر کی گائے ذبح کر کے اُس کے کباب خود کھاتی ہیں، اور دوسروں
کو بھی کھلاتی ہیں. بچا ہوا گوشت ابدال لوگ، جو ان کے مرید کہلاتے ہیں، نقد
پیسہ سے خرید کر لے جاتے ہیں. یہ ابدال لوگ گائے ذبح ہونے کے وقت
کوئلے روشن کرتے ہیں. جب وہ خوب دہک جاتے ہیں تو برہنہ ہو کر ان کوئلوں
پر لوٹتے ہیں. یہاں تک کہ وہ بجھ جاتے ہیں. اِن کے بدن کو کوئی نقصان نہیں
پہونچتا. اس وجہ سے وہ شیعہ جو جاہل ہیں اور علمِ دین سے بے بہرہ یا عقل سے کورے

ہیں، ان کے کمال کا لوہا ماننے لگتے ہیں۔ ایسی حالت میں شیعہ عورتیں ان پر جتنا بھی عقیدہ رکھیں، تھوڑا ہے۔ بعض بزرگ اس کو ابدالوں کا شعبدہ یا سحر سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگ صاحبِ نذر کی کرامت جانتے ہیں۔ اور کچھ سمجھتے ہیں کہ ابدال بچوں کو ابتدائے عمر سے آگ پر لوٹنے کی مشق کراتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی کھال سرد اور بے حس ہو جاتی ہے۔ بعض یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ بدن پر کوئی دوا مل کر یہ حرکت کرتے ہیں۔ کچھ کا خیال ہے کہ نظر بندی کرتے ہیں۔

بہر حال یہ سب قیاس اور عقیدے بیکار ہیں۔ اصل میں یہ ان کی چالاکی اور پھرتی ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھ سے ایک شخص کو دیکھا جس نے آگ میں سے ایک دہکتا ہوا کوئلہ اٹھایا اور اسے جاڑوں کے موسم میں کبھی اس ہاتھ میں، کبھی اس ہاتھ میں منتقل کرتا ہوا لے کر چلا یہاں تک کہ وہ کوئلہ سرد ہو گیا۔ اور اس کے ہاتھ کو کچھ گزند نہیں پہنچا۔ یہ ابدال خود ہی اس لقب سے ملقب ہو گئے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ فرقۂ صوفیہ کے اکابر میں سے ہوں۔ وہ (فرقہ صوفیہ کا ابدال تو) سارے خاندان میں کوئی ایک پیدا ہو جاتا ہے اور ان لوگوں میں دودھ پیتے بچے سے نوّے سال کے بوڑھے تک ہر شخص اسی لقب سے مشہور ہے۔ بس وہاں (صوفیہ میں) ابدال مرتبۂ درویشی کی وجہ سے کہلاتا ہے اور ان لوگوں میں گروہ کے نام کی وجہ سے۔ ان نالائقوں کا خیال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منصبِ نبوت چالیس ابدالوں کی سفارش سے ملا تھا جن میں ایک سید احمد کبیر بھی تھے۔ بس یہاں اتنا ہی کہنا کافی ہے تفصیل میں تو بڑی طوالت ہے۔

تعزیہ داری اور تعزیہ سوائے اہلِ بیت علیہم اسلام کے موالی کے، جو سنیوں میں روافض کے نام سے مشہور ہیں کوئی نہیں نکالتا۔ سنی بھی مجلس میں جا کر روضہ خوانی کرتے ہیں، خطبہ اور مرثیہ پڑھتے ہیں، واقعۂ کربلا فارسی اور مرثیہ ہندی میں سنتے

ہیں اور رد تے ہیں. لیکن خود تعزیہ دار نہیں ہیں ۔ اس جگہ شریف سنّیوں کا ذکر ہے ورنہ سنّیوں میں بھی نچلے طبقے کے سب لوگ تعزیہ دار ہیں۔ محرم میں ہر دکان کے سامنے تعزیہ پایا جاتا ہے۔ مگر ان لوگوں کی تعزیہ داری ہندوؤں کی تعزیہ داری کے مانند ہے، جو اپنی برادری میں نمود و نمائش کے لئے تابوت بناتے ہیں۔ اور اہلِ سنت میں بھی بعض جاہل جو اشراف کی اولاد ہیں، جوانی کے غرور اور سرکشی کی وجہ سے عشرہ کے دن لڑائی جھگڑا کرنے کے لئے یا دوسرے تعزیہ داروں کے ساتھ راہ چلنے میں یا پنچ لوگوں کی صحبت کے اثر سے جوئے خانے میں یا ایسی ہی کسی جگہ پر جاتے ہیں اور اپنے باپ کی فرماں برداری میں اپنے گھر تعزیہ بھی رکھتے ہیں۔ اور جو شخص بھی اس کی زیارت کرنے آتا ہے، اس پر چار یار کا نعرہ لگا کر سُنّی ہونے کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ اِن لوگوں کے خیال میں ہر زیارت کرنے والا رافضی مذہب ہوتا ہے۔ چوں کہ اثنا عشری مذہب کے ماننے والے محرم میں سیاہ یا سبز لباس اور بعض اہل احتیاط نیلے کپڑے بھی پہنتے ہیں، سُنّی اپنے بچوں کو سبز کپڑے اور سبز و سرخ ڈوریاں پہناتے ہیں اور جوان بھی پہنتے ہیں اور محبتِ ائمہ علیہم السلام میں فرقۂ امامیہ پر غلبہ دکھانے کے لئے دس دن تک گوشت بھی نہیں کھاتے۔ اکثر گھی بھی نہیں استعمال کرتے اور شبِ عاشورہ کو چہل منبر کی زیارت کے لئے جاتے ہیں اور ہر منبر پر حصولِ مطلب کے لئے منت کا ڈورا باندھتے ہیں۔ امامیہ مذہب کے جوان بھی اس رسم کے رواج عام حاصل کر لینے کی وجہ سے چہل منبر کی زیارت کرتے ہیں۔

تورانی نسل کے لوگوں میں اور اُن کے اَخلاف میں یہ رسم تھی کہ امیرالمومنین علیہ السلام کی نذر کا دسترخوان بچھاتے تھے۔ اس پر کھانے چن دیتے تھے۔ پھر منتظر رہتے تھے کہ جناب امیرالمومنین تشریف لائیں گے اور ان میں سے بعض کھانے

نوش فرمائیں گے۔ اس لئے ان کے اعتقاد کے مطابق ایک وقت مقرر تھا، پھر اُن کھانوں پر جنابِ امیر کے دست مبارک کے نشانات ڈھونڈھتے۔ نذر کھانے پر فاتحہ دینے کا طریقہ تورانیوں میں اور ان کی اولاد میں رائج تھا۔ اب اماموں کے اِن پیروں میں بھی رواج پاگیا ہے جو ایرانی الاصل ہیں۔

اور تعزیہ جو اُن لوگوں کی ایک اصطلاح ہے وہ ضریح اور صندوق یا اسی قبیل کی دوسری چیزوں سے عبارت ہے جو رنگ برنگ کا ہوتا ہے۔ لکھنؤ میں خدا کے فضل سے ہندو بھی تعزیہ دار، مرثیہ گو اور مرثیہ خواں ہیں۔ اور سنی تو مسلمان ہیں ہی اس سے کیا ہوتا ہے، کہ وہ بعض باتوں میں شیعوں سے اختلاف رکھتے ہیں۔ بالجملہ شیعوں کے نزدیک مذہب مخالف کے جاہل ان کے علما سے بہتر ہیں اور اثنا عشری مذہب کے علماء اس مذہب کے جُہال سے بدرجہا غنیمت ہیں۔ یہاں شہر کے لوگوں کی رسموں کا بیان ختم ہوا شیعوں کا بھی اور سنیوں کا بھی۔

ہندی کے چند لفظوں کی وضاحت | اب قصبات اور گاؤں کے باشندوں کا ذکر شروع کرتا ہوں لیکن اس سے پہلے ہندی کے چند لفظوں کی وضاحت کرتا ہوں، جن کا پہلے ذکر آچکا ہے۔

پوڑہ اُس کاغذ کو کہتے ہیں کہ کوئی دوا یا خشک مٹھائی یا کوئی اور چیز اس میں باندھی جاتی ہے۔ چناں چہ فرید گنج شکر کے پڑے میں شکر باندھی جاتی ہے۔

جوڑہ کے معنی ہیں بالضرورت دو چیزوں کا ایک جگہ ہونا۔ جانوروں کے نر اور مادہ بھی اس میں داخل ہیں۔ اس کے علاوہ پہننے کے کپڑوں پر بھی اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے اور شادی کے بیان میں کہنے والے کے مراد یہی معنے ہوتے ہیں۔

تھالی ایک برتن کا نام ہے چاندی کا ہو یا تانبے کا۔ یا کسی اور دھات کا یہ چھوٹا خوانچہ ہوتا ہے جس کے کنارے قدرے اٹھے ہوئے ہوتے ہیں۔

نیگ، بیگ کے وزن پر ہے۔ دولہا حنا بندی کے دن اپنی سالیوں کو جو کچھ دیتا ہے وہ نیگ کہلاتا ہے۔

روشن چوگی، روشن کے معنی نور اور چوگی بمعنی معروف۔ مرکب لفظ ہے۔

سہرا وہ جو شبِ عروسی کو دولہا کے سر پر باندھا جاتا ہے۔

قصبات اور گانوئں کے باشندوں کا ذکر

واضح رہے کہ بعض پٹھانوں کا رشتہ سیّد، مرزا، یا خواجہ کے ہاں بطور شاذ ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ آپس میں میل جول کر کے کبھی اپنے اُن عیوب سے جو ان میں ہیں نکل آتے ہیں ورنہ افغان کی زبان اور وضع کا درست ہونا بہت دشوار ہے۔ یہ جہاں بھی ہوں فوراً پہچان لئے جاتے ہیں۔ نفاستِ طبع تو اُن لوگوں میں خلقی طور پر نہیں ہے کسی ہو تو ہو۔ لیکن بہادری اور تہوّر کے اوصاف خلقی طور پہ رکھتے ہیں۔ اس فرقے میں نامرد (بزدل) بہت ہی کم پایا جاتا ہے۔ ذرا سی بات پہ برہم ہو کر مرنے مارنے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے اِن لوگوں میں مصاحبت پیشہ آدمی یا مجلس کے قابل انسان بہت کم ملتا ہے۔ دوسرے فرقوں میں یہ بات نہیں ہے۔ پٹھان اور شیخ کے درمیان شہر میں بھی رشتہ داریاں نہیں ہوتیں جس طرح شہر کے تینوں فرقے۔ افغان کے زن و مرد کو ان کے بتیھے کی وجہ سے اپنا شریک حال نہیں سمجھتے۔ شیخوں کو بھی کنجوس، پست فطرت، اور پیٹ بھراؤ چیزوں کے کھاتے پر گذارا کرنے کے باعث اپنے برابر نہیں گردانتے۔ اور شیخوں کے نزدیک بازاری لوگوں سے جیسے عطّار، علاقہ بند یا حکاک وغیرہ رشتہ جوڑنا کچھ عیب کی بات نہیں ہے۔ بازاری مسلمانوں میں عطّار کا سب سے زیادہ شریف فرقہ ہے۔ یہ لوگ شرفائے کے نزدیک بیٹھ سکتے ہیں۔ جو لوگ بے مقدار اور نودولیتے

ہیں وہ ان کی تعظیم بھی کرتے ہیں۔ اِس کے بعد مہرکن، علاقہ بند اور صحاف آتے ہیں۔ بزاز مسلمان ہندوستان میں نہیں پائے جاتے۔ اِن کے بعد مجلسی حیثیت کے لحاظ سے حلوائی اور رنگریز ہیں۔ لیکن اِن میں شرفاء کے پاس بیٹھنے کی لیاقت نہیں ہوتی۔ باقی قصاب، سبزی فروش، لوہار، رددگر اور خراطی۔ یہ لوگ آپس میں ہم مرتبہ ہیں۔

نوکری پیشہ لوگوں کا حال اب نوکری پیشہ لوگوں کا ذکر کرتا ہوں۔ پیادے۔ جن کا کام امراء کے گھر کی حفاظت کرنا، اور آقا کی سواری کے وقت اس کے ہم رکاب چلنا اور نگہبانی کرنا ہوتا ہے۔ بعض آشنا بھی اِن کے عہدے پر مقرر ہوتے ہیں۔ شاگرد پیشہ خدمت گار دوسروں پر عزت و شرافت میں ڈینگ مارتے ہیں۔ لیکن اُن میں اور چوبداروں میں انیس بیس کا فرق ہوتا ہے اور فراش اِن دونوں سے کمتر ہیں۔ یہ معاملہ باعتبار پیشہ کے ہے۔ کیوں کہ یہ ہوسکتا ہے کہ نسب کے اعتبار سے خدمت گار اور فرّاش، چوبداروں پر ترجیح رکھتے ہوں کیوں کہ چوبدار چاہے ہندو ہوں یا مسلمان ایک خاص فرقہ قوم کلال سے علاقہ رکھتے ہیں؛ جو ہندو اور مسلمانوں کے نزدیک کم مرتبہ فرقہ ہے۔ اور خدمت گار یا فرّاش ہونا نجیب زادوں سے متصوّر ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شرفازادے اُمّی ہونے کے عالم میں یا افلاس کی وجہ سے خدمتگاری اور فرّاشی کا کام قبول کرلیتے ہیں۔ پس اس گروہ میں جہاں دس رذیل ہیں دو ایسے بھی مل جاتے ہیں جو ازروئے نسب شریف ہوں۔ اگرچہ حسب کے اعتبار سے سب برابر ہیں۔ کیوں کہ خدمت گار کو کوئی بھی اپنے ساتھ ایک ہی برتن میں کھانا نہیں کھلاتا میں نے فرض کیا کہ بعض امیروں کے خدمت گار شرفاء کے ساتھ نشست و برخاست رکھیں اور کچھ کھاپی بھی لیں لیکن اِن کا حال ہر جگہ یہی نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جب

یہی خدمت گار اپنے آقا کے کسی ہمسر و ہم مرتبہ کے سامنے جائے گا تو اسے بیٹھنے کا حکم نہیں ملیگا۔ پس دستر خوان پر کھانا تو بڑی بات ہے۔ اور شریف آدمی پھٹے پرانے لباس میں بادشاہ و شاہزادے، وزیروں اور امرائے جلیل الشان کی محفل کے سوا جہاں بھی جائے گا اسے بٹھایا جائے گا اور کھانا بھی ساتھ کھائے گا۔ اور دلاک حسب و نسب دونوں اعتبار سے ذلیل ہے۔ اور حسبی اعتبار سے اُسے صرف اتنا مرتبہ حاصل ہے کہ اگر اپنے فن میں کامل ہے تو آقا کے سامنے دوسرے خدمت گاروں کے برابر ہوگا۔ کیوں کہ اسے مجلس میں بیٹھنے اور دستر خوان پر آقا کے ساتھ کھانا کھانے کی اجازت نہیں مل سکتی۔ یہ حال امراء کے نوکری پیشہ دلاک کا ہے۔ اس سے زیادہ اس کا حسب نہیں ہے۔ اور نسب تو ظاہر ہی ہے۔ کیوں کہ اس فرقے کی حقیقت یہی ہے کہ گلی گلی گھومتے ہیں تاکہ کسی کا سر مونڈدیں اور روٹی کھالیں۔ اور اس فرقے کے بعض لوگ جو دکاندار یا جراح ہو گئے ہیں وہ بازاریوں میں داخل ہیں بعضے ہندو اور مسلمان اِن کو حکیم صاحب کہتے ہیں اور کبھی یہ کسی امیر کے دستر خوان پر کھانا بھی کھا لیتے ہیں لیکن پھر بھی انھیں اشراف میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ اِن کی رشتہ داریاں اپنے ہم قوموں سے منقطع نہیں کی جا سکتیں۔ امیروں کے گھر یہ لوگ کسی ضرورت سے بلانے پر جاتے ہیں، کسی زخم یا پھنسی کے علاج کے لئے۔ اگر انھیں اَشراف کے ساتھ کھانا کھانے یا امراء کی محفل میں بیٹھ جانے کا موقع مل جائے تو ان کی شرافت کے لئے بس اتنا ہی مفید ہے کہ یہ لوگ اپنے ہم چشموں میں ذرا سر بلند ہو جاتے ہیں۔ اگر شرفاء کے سوا کسی کو اتنا صبر مل جائے کہ بغیر بلائے کسی امیر کے دروازے پر نہ جائیں تو امراء کا ان سے ملاقات کا طرز ہی دوسرا ہوتا ہے۔ باورچی بھی خدمتگار کے رتبے کو نہیں پہنچتے۔ اگرچہ اس فرقے میں بھی شرافتِ نسبی کا احتمال رہتا ہے کیونکہ

اکثر امیر زادے اور شریف زادے باورچیوں کی صحبت میں رہ کر کھانا پکانے کے طور طریقے سیکھ لیتے ہیں اور دورۂ فلک سے انقلاب کے ہاتھوں مجبور ہو کر اِس فن کو ذریعۂ معاش بنا لیتے ہیں، اور رفتہ رفتہ جب انھیں شرفا میں اعتبار حاصل نہیں رہتا تو اپنے ہم پیشہ لوگوں میں قرابت کر لیتے ہیں۔ اس کی ابتدا یوں ہی کہ ایک مالدار باورچی جس نے کسی امیر والا قدر کے ہاں رہ کر دولت جمع کر لی تھی کسی شریف زادے سے اپنی بیٹی کا نکاح کرنے کا اِرادہ کرتا ہے۔ اگر کوئی ایسا شریف نہیں ملتا جو اپنے لڑکے کے لئے اس کی بیٹی کو قبول کر لے تو مجبوراً یہ باورچی جس کا نام فرض کرو میر ظفر علی یا میر شرف الدین حسین اور اس کے بیٹے کا نام میر حیدر علی ہے، جہیز کا لالچ دے کر اور دو تین آدمیوں کو بیچ میں ڈال کر اس بیٹی کو کسی مجہول النسب کے نجیب زادے کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس کے بعد ہی مالدار باورچی اپنی دوسری بیٹی کو کسی دوسرے باورچی کے لڑکے سے بیاہ دیتا ہے جو چودہ پشتوں سے دیگ اور چولھے کی خدمت کرتا رہا ہے۔ چوں کہ اس مہم کے تکمیل پا جانے کے بعد دونوں بہنوں کی تلافی واجبات سے ہے اور دونوں طرف سے آمد و رفت کا سلسلہ شادی و غمی میں ضروری ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں کچھ زمانہ گذرنے کے بعد اِس بہن کی بیٹی اس بہن کے بیٹے کو اور اس بہن کی بیٹی اس بہن کے بیٹے کو بیاہ دی جاتی ہے۔ اگر چہ اس پیشے کی ملازمت شرفاء سے رشتہ داری کو منقطع کر دیتی ہے لیکن اس قرابت سے یہ نسبت بھی مٹی میں مل جاتی ہے۔ بحیثیت مجموعی رکاب دار، باورچی، کبابی اور نان بائی، یہ سب ایک مرتبے کے اور آپس میں بھائی بھتیجے، ماموں بھانجے، سالے بہنوئی، خسر داماد سب ہی ہوتے ہیں اور فیل بان بھی رذیل الاصل ہیں۔ اِن میں سے بعض کو سیّد کہا جاتا ہے۔ بعض افغان، مغل، اور شیخ بھی خال خال ہیں۔ اِن میں سے جس کے پاس

پیشہ ہو اور اپنے فن میں کامل ہو وہ آقا کی مہربانی کا مورد ہوتا ہے۔ وہ فوجدار صاحب کہلاتا ہے اور دوسرے پیش خدمتوں کو چاکر کہا جاتا ہے۔ چاہے وہ حقیقت میں از روئے شرافت چاکروں سے بھی بدتر ہو۔ سادات کے ذکر میں ہم نے ان کی سیادت کا ذکر اسی لئے نہیں کیا کہ وہ محل صرف شرفاء سے بحث کا تھا۔ اگرچہ ان میں بعض لوگ نسبِ سیادت کے جھوٹے مدعی بھی ہیں لیکن ان میں شرافت جیسی پائی جاتی ہے۔ سقّہ، سائیس، دیگیں مانجھنے والا، کہار، باورچی، پالکی کے کہار یہ سب مسلمان ہیں اور ان سب پیشہ وروں میں رذیل ہیں۔ اور گویے، اگرچہ ان کا فن شرفاء کے برابر نہیں ہوتا لیکن اس فرقے سے رشتہ کرنا محال ہے یہ بات ممکن ہے کہ اگر کوئی قلّاش گویا پھٹے پرانے لباس ہیں، گانے کی محفل کے سوا کسی دن، کسی امیر کے گھر آجائے تو وہ بیٹھ جائے گا۔ اور اس کے دسترخوان پر کھانا بھی کھائے گا۔ اور بعض امیر جو بدطینت ہیں اور کتّوں کی طرح بھونکتے رہتے ہیں اگر کسی مطرب کو دسترخوان پر نہ بٹھائیں اور اس کا مجلس میں بیٹھنا بھی مناسب نہ سمجھیں تو ان کا یہ طرزِ عمل قابلِ تقلید نہیں ہو گا۔ یہ لوگ تو فلک زدہ سادات کا بھی دسترخوان پر بیٹھنا گوارا نہیں کرتے۔ یہ گانے بجانے والے ہمیشہ سے بادشاہوں اور ان کی اولاد کی مجلسوں میں مقرب رہے ہیں۔ چناں چہ گاؤں اور قصبوں کے رہنے والے بیان کرتے ہیں کہ ہم اہل شہر کو شرافت میں اپنے برابر نہیں گردانتے۔ نسب کے اعتبار سے تو ہندوؤں کی طرح وہ حق بجانب ہیں۔ لیکن شہریوں کے نزدیک حسب کی شرافت نسب پر مقدم ہے۔ کیوں کہ نسب تو امتدادِ حسب ہی سے بنتا ہے۔ شہری بھی بے مقدور اہلِ قصبات کی شرافت کے باوجود ان سے قرابت کرنا جائز نہیں سمجھتے کیوں کہ وہ حسب میں شہریوں سے کمتر ہیں۔ جس طرح ہندوؤں میں بالیاقت وہ مانا جاتا ہے جو کھانے پہننے اور بات چیت کرنے میں

دوسروں کی نسبت مسلمانوں سے زیادہ مشابہ ہو۔ اسی طرح دیہاتیوں میں زیادہ معزز وہ آدمی ہوگا جس کی زبان اور چال ڈھال اور لباس، شہریوں کی زبان چال ڈھال اور لباس سے مشابہ ہو اور شہریوں کا سا کھانا کھاتا ہو۔ ورنہ انسان کے لئے اس سے زیادہ عیب کی کوئی بات نہیں ہے کہ اُسے "دہقانی" نہ کہا جائے۔ دہقان وہی ہے جو گاؤں یا قصبے میں رہتا ہو۔ پس ان میں جو شخص فصیح الکلام اور خوش ہیئت وخوش اختلاط ہے وہ اہل شہر کا تتبع کرتا ہے۔ وہ خود بھی دل میں اپنے دوسرے بھائی بندوں کی چال ڈھال اور گفتار پر ہنستا ہے لیکن بظاہر شہریوں کے سامنے ان کی مذمت نہیں کرتا۔ جیسے بعض سنی اگرچہ دل میں حضرت معاویہ کی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہیں لیکن بظاہر انھیں حضرت معاویہ ہی کہتے ہیں تاکہ شیعوں کو زیادہ زبان کھولنے کا حوصلہ نہ ہو جائے۔

خلاصہ یہ کہ قصبات میں شیخ وسید کی رشتہ داریاں عربوں کی تقلید میں اور اصحاب رسول کے اتباع میں ہوتی ہیں۔ اگرچہ ایران میں بھی وہ لوگ جنھیں ہم ہندوستانی آقا ومرزا کہتے ہیں اور ولایت زا ہونے کے باعث مغل سمجھتے ہیں، حالاں کہ دراصل وہ شیخ ہیں۔ لیکن ہندوستان میں شرفاء قصبات کے نزدیک شیخ کو لفظ شیخ سے اور سید کو لفظ میر سے یاد کرتے ہیں۔ یہاں سید کو مرزا نہیں کہتے اور شیخ کو بھی کوئی مرزا نہیں کہتا۔ اور مرزا یا افغان اگر مرتبے میں ساتویں آسمان پر بھی پہنچ جائیں تو ان کی رشتہ داری شیخ یا سید کے گھرانے میں ہونا ممکن نہیں۔ اگرچہ شہر میں مغل اور شیخ کے درمیان قرابت اتفاقی طور پر واقع ہو جاتی ہے لیکن قصبوں میں تو اتفاقاً بھی نہیں ہوتی۔ اور کسان درحقیقت اشراف کی صنف ہی سے باہر ہیں۔ ان کو قصبات کے شرفا بھی لاوارث خدمت گار کی طرح سمجھتے ہیں

اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ شہروں میں عفت محفوظ نہیں رہتی تو اس کا سبب یہ

ہے کہ شہر میں بھانت بھانت کا انسان بستا ہے اور کسی کو کسی سے سروکار نہیں ہوتا بخلاف اس کے قصبات میں ہر جگہ الزام تراشنے والے اور ذلیل کرنے والے موجود ہوتے ہیں۔ اور اگر کوئی چھنال عورت کسی دوسری جگہ سے وہاں آن ٹپکے تو سارے قصبے میں وضیع و شریف کے نزدیک مردود ہو جاتی ہے۔ وہ لوگ اسے اپنے قصبے سے نکال باہر کرنے پر بھی قادر ہیں۔ وہ کسی شریف کے دروازے میں دھنس بھی نہیں سکتی۔ مگر شہر میں نہ کوئی ایسے بدکار مرد یا عورت کے اخراج کی قدرت رکھتا ہے نہ یہ ہے کہ وہ گھروں میں آجانہ سکے اگر اسے زید اپنے گھر میں نہیں گھسنے دیتا تو عمرو، زید کے خلاف ایسا کرتا ہے قصبات کے شرفا میں اکثر و بیشتر باہم صلہ رحمی کا رشتہ ہوتا ہے تو ایک شخص دوسرے کی عورت پر تہمت نہیں لگا سکتا کیوں کہ وہ تہمت ایسی ہی ہو گی جیسے کسی نے اپنی خالہ یا چچی یا بہن پر لگا دی۔ دوسرے یہ کہ لباس اور کھانا اور میل جول جو عورتوں کا شہر میں ہے وہ قصبات میں نہیں ہے۔ شہر کی بیشتر عورتیں اپنے ماں باپ کی دولت مندی کے باعث اور اپنے بھائیوں کی شان و شوکت یا بہادری اور جلادت کی وجہ سے شوہروں کی محکوم نہیں ہوتیں۔ یہ بھی ہے کہ بعض عورتیں، کشمیری عورتوں کے فیض صحبت سے جو امیروں کے گھروں میں آتی جاتی رہتی ہیں، بہت سے فوائد کی امید میں اِن امیروں کے گھر آنا جانا شروع کر دیتی ہیں۔ اور بعض گھروں میں لولیوں (طوائفوں) کے ذریعے آنے جانے کی راہ کھل جاتی ہے۔ بعض امیر زادے اور شرفا، عورتوں کے ساتھ بیٹھ کر شراب بھی پیتے ہیں۔ اور امیروں کے گھروں میں اکثر لونڈیوں کی اولادیں ہوتی ہیں۔ یہ ساری صورتیں بہت سی خرابیوں کے باعث پیدا ہو جاتی ہیں بعض جگہ صاحب عفت عورتیں بھی ہیں مگر جھوٹی تہمت لگانے والے انھیں بدنام کر دیتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی بڑھیا آتی ہے اور صاحب خانہ کو جو حسن و جمال

میں عدیم المثال ہے۔ ابتدا میں اپنے ضعف اور بدحواسی کا اظہار کر کے اپنی طرف مائل کر لیتی ہیں۔ پھر باتوں باتوں میں کسی دولت مند نوجوان یا امیرزادے کی وجاہت کا ذکر، اور اُس عورت سے تعلق خاطر کا تذکرہ کر کے فریب کا جال ڈالتی ہے۔ اگر وہ عورت عفت مآب خاندان سے ہے اور خود بھی پاک دامن ہے تو زیادہ سے زیادہ بوڑھیا کی اِن باتوں سے بھڑک کر اُسے گھر سے نکال دے گی اور دوبارہ نہ آنے دے گی۔ لیکن تصبات میں اگر ایسی کوئی عورت کسی شریف آدمی کے گھر میں آجائے اور صاحب خانہ کو اس کی اطلاع ہو جائے تو اُسے فوراً قتل کر ڈالے گا، اور ساری برادری اسے آفریں کہے گی۔ اوّل تو شرفاء کے گھر میں ایسی عورت کا داخل ہونا ہی ناممکن ہے۔ مگر شہر میں اگر کوئی ایسی کٹنی عورت کا قتل کر ڈالے تو دوسرے لوگ کوتوال کو اس کے گھر کی دور سے نشان دہی کریں گے۔ اور اس کی عورت پر دو تہمتیں اپنی طرف سے گھڑ کر لگا دیں گے۔

لذیذ غذائیں کھانا اور بھڑکیلے لباس پہننا اور دن رات آرائش میں مشغول رہنا۔ عورتوں کی ہم جنس پرستی کا باعث بن جاتا ہے۔ اس سے ترقی کر کے نوبت مردوں کی صحبت تک پہنچ جاتی ہے۔ اور بیوی کے لئے شوہر کا محکوم نہ ہونا بھی اس فساد کی جڑ ہے۔ چوں کہ انسان کسی کا تابع فرمان نہیں ہے، مرد ہو یا عورت پھر تو جو کچھ بھی کرے گا اپنی طبیعت کے اقتضا سے کرے گا، صحبت بھی بڑی مؤثر چیز ہے۔ اور لولیوں کا شریفوں کے گھروں میں آنا بُرے انجام رکھتا ہے۔ کیا تعجب ہے کہ وہ پاک دامن عورتوں کو جھوٹ موٹ ہی مردوں میں بدنام کرنے لگے۔ یا ہر کس و ناکس کے سامنے اس کی خوش بیانی، نفاستِ طبع، انداز و ادا، یا سراپا کا بیان کرے۔ یہ رسوائی اس بدنامی سے بھی زیادہ ہے

بعض خالائیں اپنی بھانجیوں کو اور بعض پھوپھیاں اپنی بھتیجیوں کو طالبوں کے پاس پہنچا کر خوب روپیہ بناتی ہیں اور کبھی مائیں خود اپنی بیٹیوں کو زرِ نقد کے لالچ میں آدھی رات کو کسی بزرگ کی قبر کی زیارت کے بہانے یا کسی اور حیلے سے عشاق کے پہلو میں سلادیتی ہیں۔ لیکن ایسی مائیں زیادہ تر باندیاں یا لولیاں ہوتی ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مشائخ شہر یا ان کے خلیفہ طالب و مطلوب کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں: یعنی دونوں کو اپنا مرید بنالیا اور پھر اس دینی بھائی اور دینی بہن کو اپنے جدامجد کے عرس کے دن اپنے گھر بلا کر حضرت مقرب درگاہ الٰہی کے حجرۂ عبادت کو شاہی "عیش محل" کے لئے بھی باعث بنا دیتے ہیں۔ شاہ جہاں آباد (دہلی) میں تو بزرگوں کے عرس کے موقع پر سیکڑوں کی مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ اور کہیں کہیں افزا پردازوں کا حربہ کارگر بھی ہو جاتا ہے۔ عورتوں کا نوکری کیلئے نکلنا بھی اس کے شوہر، باپ اور بھائیوں کے لئے فضیحت کا سبب بن جاتا ہے۔ ایسی (نوکری پیشہ) عورتیں زیادہ تر کشمیر کی ہوتی ہیں یا آس پاس کے علاقوں کی

مختصر یہ کہ شہر کی مثال ایک دریا کی ہے۔ اور قصبے کی مثال کنوئیں کی۔ دریا میں اگر جھاگ زیادہ ہیں یا خس و خاشاک بہت ہے تو گوہر شاہوار بھی اسکی تہ میں ہوتا ہے۔ اور کنوئیں میں اگر صاف میٹھے پانی کے سوا کوئی شے جا پڑے تو وہ سارے کنوئیں کو گندا کر دیتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک چوہا یا کوئی اور جانور اس میں آکر مر جائے تو سارے کنوئیں کو نجس کر دے گا۔ اس کے برخلاف دریا میں اگر ہزار جانور بھی مر جائیں تو وہ پاک رہے گا۔

خلاصہ یہ کہ شہر کے شرفا کا طریق و آئین دوسروں کے لئے نمونہ ہے۔ اہلِ قصبہ بھی اگر کچھ دن ان کی ہمسائیگی میں گذاریں تو کیا عجب ہے کہ ان کی اہلیت و شرافت اور ان کی عورتوں کی عفت و پاک دامنی کا اقرار قصبے کے مرد عورتوں

کی شرافت وعفت سے بڑھ چڑھ کر کرنے لگیں۔ پھر بھی عام طور سے ان لوگوں کا قول سچائی سے قریب ہے۔ قصبے کے باشندوں کی شہریوں سے قرابت مشکل ہے۔ وہ تو سوائے چند قصبوں کے جہاں کے لوگوں سے ان کی قدیمی رشتہ داریاں ہیں دوسرے قصبات میں بھی رشتہ نہیں کرتے۔ بلکہ اپنے قصبے میں بھی ان کی قرابت چند محلّوں تک محدود ہوتی ہے۔ ان محلوں کے سوا، دوسرے محلہ والوں سے بھی سروکار نہیں رکھتے۔ چاہے اس محلے کے لوگ شرافت وشخصیت میں ان سے ہیٹے نہ ہوں۔

یہ لوگ بھی بیوہ لڑکی کی دوسری شادی نہ کرنے کے معاملے میں ہندوستان کے شریف النسب ہندوؤں کے مقلد ہیں۔

عورتوں کا احترام یہ لوگ خالہ، چچی اور بڑی بھاوج کو ماں کی طرح سمجھتے ہیں۔ یہ ہرگز بھتیجے سے یا بھانجے سے یا دیور سے پردہ نہیں کرتیں۔ اور شوہر کے مرنے کے بعد اِن میں سے کسی سے نکاح ثانی کرلینا بڑی رسوائی وبدنامی کا سبب بن جاتا ہے۔ چھوٹی بھاوج کو بیٹی کی طرح سمجھا جاتا ہے۔ اور بھائی کی وفات کے بعد اس سے نکاح کرنا اپنی شریعت میں حرام سمجھتے ہیں۔

ان کی شرافت سے مراد وہ رسمیں ہیں جن پر یہ لوگ مدت سے عمل کرتے آرہے ہوں۔ ان معاملوں میں شہریوں اور قصباتیوں میں اختلاف نہیں ہے۔ اور جہاں دونوں میں اختلاف ہے وہ چند چیزیں ہیں ان میں سے ایک یہ ہے۔

شہریوں اور قصباتیوں میں اختلاف کہ بعض قصبوں میں چھوٹی بھاوج اپنے جیٹھ سے پردہ کرتی ہے اور بڑی بھاوج اپنے دیور سے پردہ نہیں کرتی۔ یہ ہندوستان کی رسم ہے۔ سوائے کشمیری برہمنوں کے جو اہل اسلام سے قرب کے باعث بعض رسموں میں مسلمانوں کی پیروی کرتے ہیں، شہری مسلمان اس رسم کو پسند نہیں کرتے

نیز ان میں میاں بیوی اپنے ماں باپ کے سامنے یا بڑے بھائی اور دوسرے بزرگوں کے سامنے باتیں کرنا یا کھانا کھانا ہندوؤں کی طرح جائز نہیں سمجھتے۔ عورتوں کی آواز بھی باہر نہیں نکلتی۔ یہ رسم بعض شہریوں اور ہندوؤں کے خلاف ہے۔ بعض قصبوں میں تمام دن کنیزوں سے کام لیتے ہیں مگر رات کو اُن سے کوئی سروکار نہیں رکھا جاتا۔ وہ آقا کے گھریلو کاموں سے فارغ ہو کر جہاں چاہیں چلی جائیں اور جہاں ان کا دل چاہے رات بسر کریں۔ یہ رسم بہت ہی مکروہ اور تمام شہروں میں مفقود ہے۔ کیوں کہ ایسے مفلوک الحال نادار لوگ جن کی مائیں ضرورت کی وجہ سے امیروں کی عورتوں کی ملازمت اختیار کر لیتی ہیں، وہ کنیز کا گھر سے باہر نکلنا بھی جائز نہیں سمجھتے۔ بازار جانا تو بڑی بات ہے۔

ہندوؤں میں پردہ | بعض لوگ جو قصبوں میں اس کا بڑا اہتمام کرتے ہیں، انھوں نے یہ تعلیم شہریوں سے حاصل کی ہے جیسے ہندوؤں نے مسلمان امرا کی ملازمت میں رہ کر اپنی عورتوں کو پردہ کرانا سیکھ لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ہندوؤں میں پردہ کی قدیم رسم ہوتی تو مرہٹے سرداروں کی عورتیں ہزاروں مردوں کے سامنے اور شہر و لشکر میں کیوں گھوڑے کداتی پھرتیں؟ اس فرقے میں چودہ سال کی لڑکی اور ستّر سال کی بڑھیا کا ایک سا حال ہے۔ ایسا کون شخص ہے جس نے مرہٹوں کے لشکر میں ان کے سرداروں کی عورتوں کو نہیں دیکھا۔ اور بازاریوں میں سے کوئی ایسا نہ ہوگا جو کسی نہ کسی بہانے سے ان کے پاس نہ گیا ہو اور ان سے باتیں نہ کی ہوں۔

قصبات میں سنّی لوگ حماقت اور بے خبری کے باعث اماموں کے تعزیہ دار ہیں لیکن سب سنّیوں کا یہ حال نہیں ہے۔ کچھ ایسے ہیں اور کچھ ان کے خلاف بھی ہیں۔

اور ہر قصبے میں کسی صوفی کی قبر بھی ضرور ہوتی ہے جنھیں مخدوم صاحب کہا جاتا ہے۔ اور اس ولایت کا والی سمجھا جاتا ہے۔ یعنی اُس قصبے کی آبادی کو ان کے قدموں کی برکت سمجھتے ہیں۔ اور ان کی کرامتوں کے دفتر کے دفتر محفلوں اور مجلسوں میں بیان کئے جاتے ہیں۔

پیر اشرف سلونی | ساٹھ سال کے لگ بھگ ہونے ہوں گے، ایک بزرگ قصبہ سلون میں پیر اشرف نام کے گذرے ہیں۔ بعض لوگ انہیں سید جانتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ وہ اپنے نانا کے جانشین اور لے پالک تھے۔ اس لئے خود کو شیخ ظاہر کرتے ہیں اور اپنی سیادت کا اقرار نہیں کرتے تھے۔ اس معاملے میں بڑی بحث کرتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ انھیں سیادت سے کچھ تعلق نہ تھا بلکہ شیخ تھے۔ لیکن ان کی سیادت کا ادعا کرنے والے عقل سے معذور رہیں، خواہ مخواہ اس بے چارے مسلمان کو بدنام کرتے ہیں اور اتنا نہیں سمجھتے کہ خارج النسب آدمی طعن و تشنیع کا ہدف بن جاتا ہے۔ بہر کیف وہ شیخ ہوں یا سید ہوں چشتیہ فقیروں میں سے ایک مشہور بزرگ تھے۔ ان کے مرید یہ کرتے ہیں کہ طوطی خرید کر اُسے شیخ کا نام رٹا کر سلون کے جنگلوں میں چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ ہر درخت کی ٹہنی پر بیٹھ کر "پیر اشرف پیر اشرف" کی رٹ لگاتی ہے تاکہ اس جنگل سے گذرنے والے مسافر یا درخت کے نیچے آرام لینے والے ان کے فضل و کمال کے معترف ہوں اور طوطیوں کا ان کے نام کی رٹ لگانا ان کی کرامت سمجھیں۔ اس طرح سننے والوں کے دل میں اعتقاد بیٹھ جاتا ہے کہ یہ جانور اپنی اصل فطرت سے ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ سبحان اللہ کیا ولایت اور کیسی منہ بولتی کرامت ہے، اس پیر کی جس کا نام جانور اور پرندے تک زیب زبان رکھتے ہیں۔ اب بھی بعض چھچھورے مرید انجام کار پر نظر نہ کر کے اس شغل میں مشغول رہتے ہیں اور اپنی ہنسی اڑواتے ہیں

مگر وہ (شیخ) اپنی ذات سے متین و شریف انسان تھا۔ خیال ایسا ہوتا ہے کہ یہ مرید اُن کے ایما سے یہ حرکتیں نہ کرتے ہوں گے۔

تعزیہ داری اور عورتیں بعض قصبات میں رسم ہے کہ عاشورہ کے دن نیچ ذات کی عورتیں نئے لباس میں آراستہ ہو کر تعزیہ داروں کے ساتھ شہر سے باہر جاتی ہیں اور ضریح مبارک اور کاغذ کے تابوت کو دفن کرتے وقت ایک دوسرے کی گردن میں ہاتھ ڈال کر زار زار روتی ہیں۔ یہ بات بعض گاؤں میں رذیلوں کی عورتوں سے خصوصیت رکھتی۔

ہندوؤں میں رسم ماتم بعض قصبوں یا دیہاتوں میں شریفوں میں بھی یہ رواج ہے کہ مرد و زن کپڑے بدلتے ہیں اور سر میں اور ڈاڑھی میں کنگھی کرتے ہیں۔ اور ملک بنگال میں ہندو بھی امام علیہ السلام کا ماتم کرتے ہیں۔ ان کا گمان ہے کہ یہ ملک (بنگال) خدا نے اپنے رسول کو عطا کیا تھا اور انھوں نے اپنی بیٹی حضرت خاتونِ قیامت (جناب فاطمہ) کو جہیز میں دے دیا تھا۔ یہ لوگ اُس زمانے میں سر سے دستار نہیں باندھتے کیوں کہ ہندوؤں میں قاعدہ ہے کہ ماتم کرنے والے چند روز تک سر پہ کلاہ یا دستار نہیں رکھتے، جیسا کہ اس سے قبل لکھا گیا ہے۔ بنگالیوں کی سینہ زنی دوسرے مسلمانوں کی طرح نہیں ہے۔ یہ لوگ سر پیٹنے اور سینہ کوبی کرنے کے معاملے میں ہندو عورتوں کے مقلّد ہیں۔ دکن کے باشندے خواہ ہندو یا مسلمان سب کے سب تعزیہ دار ہیں۔ سنی اس کام میں شیعہ سے زیادہ انہماک رکھتے ہیں۔ عشرہ کی راتوں میں بہروپ بھی بھرتے ہیں۔ یعنی ایک آدمی اپنے آپ کو ریچھ کی صورت بناتا ہے دوسرا اپنا چہرہ کالا کر کے ایک بندر بغل میں اور دوسرا بندر کندھے پہ رکھتا ہے اور راستے میں بیٹھ جاتا ہے۔ بعضے لوگ چہرہ پہ بھبوت مل کر سنیاسیوں کی طرح

کوچہ و بازار میں گھومتے ہیں۔ بعض مداری فقیروں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ اِن نقلوں کو خواص بھی مذموم نہیں سمجھتے۔ سوائے اُس شخص کے جو شاہجہان آباد یا کسی دوسرے شہر کا باشندہ ہو اور اس نواح میں مسافرانہ وارد ہوا ہو۔ اور کوئی تعلق پیدا ہو جانے کی وجہ سے سکونت اختیار کر لی ہو۔ یہاں تو بہت سے جوان بلکہ صاحب اولاد امیر زادے بھی بلکہ وہ بھی جو عمر کے اعتبار سے ادھیڑ ہو گئے ہوں، اِن فقیروں کی نقل کرتے ہیں۔ یعنی ایک رسی کمر میں لپیٹ کر ایک سبز کپڑا جس کا گریبان کھلا ہوتا ہے اور جسے بنڈی کہتے ہیں، پہن لیتے ہیں۔ اس کا دامن گھٹنوں تک پہنچتا ہے۔ پھر منہ پر بھبھوت مل کر اور چند تسبیحیں جس کے ڈورے سبز یا سرخ یا زرد ہوتے ہیں، گلے میں ڈال کر ننگے پیر ننگے سر منبر کی زیارت کو جاتے اور صحن میں ضریح مبارک کے روبرو ایک گڑھا کھود کر اس میں سوکھی لکڑیاں سلگا کر روضہ خوانی کے بعد ماتم کے وقت سب ماتمی اس کے چاروں طرف گھومتے ہیں اور پوری قوت سے سینہ کوبی کرتے ہیں۔

لکڑی پھینکنا اِن احمقوں کے اعتقاد کے مطابق جناب امیرالمومنین علیہ الصلوٰۃ والسلام کا زور اور وہ تمام شجاعت اس وجہ سے تھی کہ وہ حریف پر دھوکے سے وار کرتے تھے۔ یعنی اس طرح ہاتھ اٹھاتے تھے کہ حریف کو گمان ہو اُس کے سر پر وار کریں گے۔ وہ اپنی حفاظت کے لئے اسی طرف سپر بلند کرے تو اس دفعے میں اس کے ہاتھ پر ضرب لگاتے تھے۔ اسی طرح تلوار کو ایک عضو کی طرف لے جانا اور جب حریف اس حصے کو بچانے کی طرف متوجہ ہو تو دوسرے عضو پر وار کر دینا، اس کی نقل پیش کی جاتی ہے۔ اور اِسے ہندوستان میں لکڑی پھینکنا کہتے ہیں۔ اس کا فارسی میں ترجمہ "چوب بازی" ہوگا۔ چوں کہ نقل میں یہ لوگ شمشیر کے بدلے لکڑی استعمال کرتے ہیں اس لئے ڈھال کی جگہ

"پھری" رکھتے ہیں۔ دکن والوں نے اس فن کو درجۂ کمال تک پہونچا دیا ہے۔

پٹہ بازی اس کے سوائے پٹہ بازی، بھی اسی طرح کی ایک چیز ہوتی ہے۔ پٹہ باز، حضرت علیؑ کو اس فن کا کامل جانتے ہیں۔ اس کی تفصیل بعد میں بیان کی جائے گی۔ اسی طرح کشتی لڑنے والے کشتی کے داؤ پیچ حضرت علیؑ سے منسوب کرتے ہیں۔ اس کام کی ابتدا دکن سے ہوئی ہے۔ لیکن اب ہندوستان کے تقریباً تمام بڑے شہروں میں اس کا رواج ہوگیا ہے۔ کوئی شہر اس کی تربیت گاہوں سے خالی نہیں ہے۔ اُستاد کو خلیفہ جی کہتے ہیں اور یہ بے حقیقت لوگ جو ان کاموں میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں ان کا سلسلہ اس فن میں ایک ہندو پر منتہی ہوتا ہے جو تمام عمر فاقے کرتا رہا اور لوگوں کے کہنے کے باوجود سوکھی روٹی اور موٹے کپڑے کے سوا دنیا سے کوئی تمتع اس نے نہیں کیا۔ یا رذیل اور بازاری مسلمان مثلاً سبزی فروش، رنگریز، باورچی، حجام، یا اسی قبیل کے لوگ جو حضرت علیؑ کو اس فن کے استادوں کا استاد اور حضرات حسنین کو استادزادہ تصوّر کرتے ہیں اور اسی نسبت سے اپنا پیر مانتے ہیں اس لئے اس گروہ کے بہت سے لوگ خواہ وہ شیعہ ہوں یا سُنی ننگے پیر ننگے سر تعزیئے کے ساتھ ساتھ اپنے استاد کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ راہ چلتے میں جہاں کہیں دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ چھتوں پر یا چبوتروں پر بیٹھے تماشا کر رہے ہیں تو ماتم داروں کو روک دیتے ہیں۔ سقّہ چھڑکاؤ کرتا ہے اور پھر تماشائیوں کے سامنے لکڑی اور پٹے کے فن کا مظاہرہ شروع کر دیتے ہیں۔ یہ کرتب دکھانے کے بعد پوری آواز سے یاحسین کا نعرہ لگاتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ راہ چلتے میں تابوت کے آگے کود پھاند کرتے ہیں اور "ہے دوست" کے نعرے لگاتے ہیں۔ بعض خام کار لوگ نیام سے تلواریں نکال کر تابوت کے

آگے آگے بھی چلتے ہیں۔

علوم وفنون | خلاصہ یہ کہ قصبات میں علم معقول بہت ہے۔ بعض شہر تو بغداد، بخارا اور شیراز سے بازی لے گئے ہیں۔ شمس بازغہ جو علم طبیعی والٰہی کی کتاب ہے۔ بڑا نے لوگوں کی تصانیف سے پہلو مارتی ہے۔ اسی طرح سلّم منطق میں اور مسلّم الثبوت اصول میں۔ شمس بازغہ، ملّا جونپوری کی تصنیف ہے۔ سُلّم اور مُسلّم دونوں محب اللہ بہاری کی تصانیف ہیں۔ ان لوگوں کے علاوہ بھی اگلے زمانے میں پورب میں بڑے عالم فاضل گذرے ہیں۔ اِن لوگوں کے بعد بھی بہت سے جلیل القدر اور صاحب تصانیف عالم ہوئے ہیں۔ ملّا قطب الدین سہالوی کے لڑکے ملا نظام الدین جو محب اللہ بہاری کے استاد کے استاد تھے، محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں سرآمد علما سمجھے جاتے تھے۔ چناں چہ آج بھی ہندوستان میں فاضلوں اور عالموں کا سلسلہ ان پر منتہی ہوتا ہے۔ ان کے شاگرد ملّا کمال الدین سہالوی نے ایک کتاب "عروۃ الوثقیٰ" لکھی تھی جس کے دقائق اور غوامض حل کرنے سے بڑے بڑے علما عاجز ہیں۔ اگر چہ زمانہ حال کے علماء کے استاد اول ملا نظام الدین مرحوم تھے۔ جن کی ذات سے لکھنؤ میں فرنگی محل کو شرف و عزت حاصل ہے لیکن ان کے پیر طریقت یہی ملّا کمال الدین سہالوی گذرے ہیں۔ جن کے شاگردوں میں ملا برکت اللہ الہ آبادی اور ملک العلما مولوی فضل اللہ اور مولوی حمد اللہ سندیلوی وملا حسن فرنگی محلی اور ملا حسن چڑیا کوٹی، و ملا عالم سندیلوی وغیرہ ہوئے ہیں، ملا حسن ان کے بھانجے تھے اور باقی سب شاگرد تھے۔ ملا حمد اللہ جو آخر میں کچھ دنوں تک ملا مذکور کے مورد عتاب ہو گئے تھے۔ ملا نظام الدین کے پاس بھی جایا کرتے تھے لیکن انھوں نے جو کچھ بھی پایا وہ ملا کمال الدین ہی سے پایا۔ تصدیقات سلم

پر ایک شرح اُن سے یادگار ہے اور مدرسوں میں رائج ہے۔ ان کے دو شاگرد تھے۔ ایک مولوی باب اللہ جونپوری جو اپنے علم اور حسنِ تقریر کی وجہ سے اپنے زمانے کے علماء میں محسود تھے۔ دوسرے قاضی احمد علی جو مولوی صاحب کے بھانجے بھی تھے اور داماد بھی۔ ملا برکت اللہ نے صدرا کا حاشیہ بھی لکھا ہے۔ یہ بھی عالم محقق تھے۔ حسن چڑیا کوٹی جوانی ہی میں مر گئے تھے۔ اگر اُن کی عمر وفا کرتی تو اُن کا ذہن اِن سب لوگوں کے ذہن پر غالب تھا۔ ملا حسن نے بھی صدرا کا حاشیہ اور سُلّم کی شرح لکھی ہے۔ لیکن ملا برکت کا حاشیہ ان کے حاشئے سے بہتر ہے۔ اور مولوی احمد علی کے تصورات سُلّم اس کتاب کے تصورات پر ان کی شرح سے بہتر ہیں۔ ملا حمد اللہ کی شرح تصدیقات سُلّم اِن کی شرح تصدیقات سے اچھی ہے۔ مولوی عالم سندیلوی برق صفت ذہن رکھتے تھے، کم عمری کے باوجود اِن بزرگوں کے نزدیک مسلم الثبوت تھے۔ لیکن چالیس سال کو پہنچنے سے پہلے ہی انتقال کر گئے۔ مگر اس تھوڑی سی فرصت میں بھی علوم متداولہ میں ان سے (۷۲) کتابیں یادگار ہیں۔ ملا نظام الدین کے لڑکے مولوی عبد العلی جن کی وفات کو ابھی دو سال بھی نہیں ہوئے ہیں بڑے متبحر عالم تھے۔ ہر علم کی ہزاروں کتابیں ان کو ازبر تھیں۔ لیکن ذہن کی رسائی اور مرتبہ تحقیق و تدقیق میں دوسروں سے کم تھے۔ وہ اپنے والد بزرگوار کے سوا اس جماعت میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ انھوں نے شرح سُلّم کے سلسلے میں مولوی حمد اللہ پر بہت سے اعتراض کئے ہیں۔ وہ ملا کمال الدین کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ جو تبحّر اِن میں تھا وہ اُن کے باپ میں بھی نہیں تھا۔ یہ بزرگ جن کا تذکرہ کیا گیا سلسلہ علماء کے شیوخ گذرے ہیں۔ ہندوستان میں علم معقول جا بجا انھیں حضرات سے پھیلا ہے۔ کوئی طالب علم اور کوئی فاضل ایسا نہیں ہے جو اِن کی شاگردی

کے حلقے سے باہر ہوا۔ کوئی چھ واسطوں سے اور کوئی سات واسطوں سے اور بعضے اس سے بھی کم واسطوں سے تلمذِ علمی اِن حضرات سے رکھتے ہیں۔ لیکن بعض پنجابی اور دہلوی اور قصبہ گوپامئو کے باشندے اور جونپوری علم بلاغت میں اِن کے حلقے سے باہر ہیں۔ گوپامئو میں ملا قطب اور قاضی مبارک، ملا نظام الدین کے ہم عصر تھے۔ ملا قطب ہمیشہ اس آیت کو ختم اللہ علی قلوبہم ختم کی میم کے پیش اور اللہ کی ہے کے زیر کے ساتھ اور قلوبہم کے بے پر پیش پڑھتے تھے۔ عربی سے مناسبت کے اس فقدان کے باوجود معقولات میں اپنے زمانے کے تمام علما حتیٰ کہ ملا نظام الدین کے لئے بھی باعثِ رشک تھے۔ کہتے ہیں کہ وہ خود یا ان کے والد یا ان کے استاد، میر زاہد ہروی کے شاگرد تھے۔ قاضی مبارک بھی معقول اور منقول دونوں میں بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ اور میر باقر داماد کے معترف تھے۔ ہندوستانیوں میں ملا نظام الدین کے فضل و کمال کو مانتے تھے۔ انھوں نے بھی سُلّم کی ایک مبسوط شرح لکھی ہے اسی شرح سے ان کے تبحرّ علمی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مولوی حقانی، باشندہ امیٹھی، جو ٹانڈہ متصل فیض آباد میں تھے اور نوّے سال کی عمر پاکر اب سے کچھ مدّت پہلے فوت ہوئے ملا قطب الدین گوپاموی کے شاگرد تھے۔ لیکن ضرورت کی وجہ سے کچھ دنوں ملا نظام الدین کے آگے بھی زانوے تلمذ تہہ کیا تھا۔ وہ بھی معلومات اور اپنے ذہن کی برّاقی پر نازاں تھے۔ پہلے ہی دن جو ملا نظام الدین کے مدرسے میں وارد ہوئے تو ملا کمال الدین سے مباحثہ شروع کر دیا لیکن اُن سے بازی نہ لے جا سکے۔ میر کمال الدین نامی ایک بہار کے باشندے بھی ملا نظام الدین کے شاگرد تھے۔ چناں چہ ملا صاحب انھیں اور ملا کمال الدین کو "مد کمالین" کہا کرتے تھے۔ ان کے شاگرد زیادہ تر بنگالہ کے اطراف میں اور جونپور میں ہیں۔ انہوں نے علم بلاغت کی تحصیل خوب کی ہے۔ اس ملک میں

زیادہ تر طالب علموں کا طریقہ یہ تھا کہ بعض تو اس اراضی کی وجہ سے، جو بادشاہوں کی طرف سے اِن کے آبا و اجداد کے نام جنھیں ائمہ کہا جاتا تھا بطور معافی چلی آتی تھی، کسی دوسرے کی روٹیوں کے محتاج نہ تھے۔ جب یہ لکھنؤ آتے تھے تو ان کے والدین تین چار روپے مہینہ یا اس سے زیادہ ان کے خرچ کے لئے ماہ بماہ بھیجتے تھے اور بعض کو مدرسے سے کھانا ملتا تھا۔ اب سے پہلے شاہ پیر محمد کے ٹیلے پر جو لکھنؤ میں دریا کے کنارے مشہور جگہ ہے۔ سات سو طالب علموں کے واسطے کھانے پینے اور پہننے کے اخراجات کے لئے ضروری مشاہرہ بادشاہ ہندوستان کی سرکار سے مقرر تھا۔ اسی طرح امرا بھی حسب حیثیت اس فرقے کی خدمت کرتے تھے۔ چوں کہ امرا کی طرف سے ہر عالم کے لئے ایک یا دو گاؤں مقرر تھے۔ علما میں سے ہر ایک اپنے شاگردوں کو کھانا کھلاتا تھا اور رات کے وقت مطالعہ کے لئے چراغ کا تیل بھی استاد کی طرف سے ملتا تھا۔ اب عالم مر گئے اور سخاوت نے امیروں سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ طلبہ حیران و سرگرداں اور زار زار نالاں ہیں۔ بعض بے چاروں کو تو بے حد پاپڑ بیلنے کے بعد آدھا سیر آٹا میسر آتا ہے اور بعض جو فارسی کی لیاقت رکھتے ہیں، بچوں کو پڑھانے کے لئے کسی ہندو کے گھر نوکری کر لیتے ہیں۔ اور خود اپنے مقررہ وقت پر استاد کی خدمت میں پڑھنے کے لئے حاضر ہو جاتے ہیں جو فارسی کے کوچے سے نابلد ہیں وہ اپنے معاش میں حیران رہتے ہیں۔ اگر ان کی خوش بختی سے کوئی مسلمان یا کوئی ہندو، جسے عربی پڑھنے کا شوق ہو، ہاتھ آ گیا تو واہ واہ ورنہ روتے جھینکتے بغیر تحصیل علم کئے اپنے گھروں کو واپس ہو جاتے ہیں۔ اس تقرر کو، خواہ وہ کسی جگہ ہو، اس فرقے کی اصطلاح میں جاگیر کہتے ہیں۔ جب کوئی شخص کسی طالب کے لئے آدھا سیر آٹا مقرر کر دیتا ہے

تو وہ طالب علم کہاوت کے طور پر بیان کرتا ہے کہ میرے لئے جاگیر مقرر ہوگئی ہے۔ اِن میں سے بعض لوگ دھوبیوں اور نائیوں کے پاس ان کے بچوں کو پڑھانے پہنچ جاتے ہیں۔ بعض دلاک بچّوں کو اپنا شاگرد بنا لیتے ہیں تاکہ وہ ان کی موتراشی مفت کر دیا کرے اور یہ لوگ اپنے کپڑے اپنے ہاتھوں دھوتے ہیں۔

یہاں علم معقول کا رواج علم منقول سے زیادہ ہے۔ اور پنجاب میں اگرچہ اس ملک سے اب علم مفقود ہوگیا ہے، جب کبھی رائج تھا تو اصول اور فقہ کے عالم بہت تھے۔ خلاصہ یہ کہ ہندوستان میں فقہ کے عالم بھی ہوئے ہیں۔ اگرچہ کچھ نہیں ہوا تو مذہب اثنا عشری کے علماء نہیں ہوئے۔ اب خدا کے فضل سے یہ بھی ہونے لگے ہیں۔ ان میں ہندوستان کے بعض ان علماء کی کوششوں کو دخل ہے جو ولایت کے ملکوں میں گئے اور وہاں کے مجتہدوں سے مل کر ہر گتھی کو سلجھایا پھر ہندوستان واپس آکر ان علوم کو یہاں رواج دیا۔ بعض لوگ جو ان بزرگوں کے مقابلے میں کم رتبہ ہیں ان لوگوں سے سو درجے بہتر ہیں جو نواب شجاع الدولہ کے زمانے میں اعلم العلمائی کا دعویٰ علوم دینیہ میں کرتے تھے خدا کا شکر ہے کہ ہمارے زمانے کے علماء کی کوششیں درجۂ کمال کو پہنچ گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے موجودہ زمانے تک شیعوں کے گھروں میں شاہ مدار کی بدھی ہر سال کالے نشان کے ساتھ طول عمر اور سلامتی کے لئے، بچوں کے گلے میں ڈالتے ہیں اور شیخ سدّو کی نیاز کا بکرا ذبح کرتے ہیں۔ یعنی یہ علم دین کا عدم رواج ہے کیوں کہ اگر ان شہروں میں علم دین رائج ہوتا تو یہ سب رسمیں کیوں رواج پاتیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اب مرد اس سلسلے میں سست عقیدہ ہو گئے ہیں۔ یہ بھی غنیمت ہے۔

توہم پرستی واضح رہے کہ عورتوں کے عقیدے کے مطابق یہ سات لوگ (سدّو وغیرہ) اور سات عورتیں خدا کی قدرت سے سب عورتوں کے معاملات بنانے اور بگاڑنے کے مختار ہیں۔ یہ جس پر مہربان ہوں وہ ہمیشہ آرام سے بسر کرتا ہے اور اگر ان کا عتاب نازل ہو تو وہ مدت العمر بیمار رہتا ہے بلکہ شب و روز غشی کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ ان کی مہربانی اور نامہربانی کا انحصار ان کی نذر ادا کرنے پر ہے۔ اگر مدت کے بعد یہ کسی عورت کے سر پر آجائیں یعنی اس عورت میں حلول کر جائیں تو عورتیں شام ہی سے صاف ستھرے مکان میں عمدہ فرش بچھا کر جمع ہوتی ہیں اور تمام رات گاتی بجاتی رہتی ہیں۔ ان سات کے نام یہ ہیں۔ شیخ سدّو، زین خاں، ننھے میاں، صدر جہاں، چہل تن، شاہ دریا، اور شاہ سکندر، اور اُن سات عورتوں کے یہ نام ہیں:- لال پری، سبز پری سیاہ پری، زرد پری، آسمان پری، دریا پری اور نور پری۔ ان میں سے ہر ایک باری باری کسی عورت میں حلول کرتی ہے۔ اس رات بھر کے جلسے کو بیٹھک، کہتے ہیں۔ اس میں یہ بھی شرط ہے کہ جس عورت کے لئے بیٹھک جمع ہو وہ خود کو عمدہ لباس اور زیوروں سے آراستہ کرے۔ بعض نسوانی اطوار رکھنے والے مرد بھی اِن چودہ مرد عورتوں میں سے کسی کو اپنے سر پر سوار کر لیتے ہیں۔ ایسے مرد امیرزادوں ہی میں ملتے ہیں، وہ اس دن کے لئے رنگین لباس اور زیور اور بقچہ رکھتے ہیں۔ مردوں میں شاہ دریا، شاہ سکندر دوسروں سے بلند مرتبہ ہیں۔ انھیں نوری شہزادے کہا جاتا ہے۔ ان کو باہم سگے بھائی بتاتے ہیں اور پریاں ان کی بہنیں ہیں، جو ایک ہی بطن سے ہیں۔ یہ عقیدہ عورتوں کے دل سے نکالنا سخت

۱- ہفت تماشائے مرزا قتیل

مشکل ہے۔ بلکہ بعض جگہ تو محال اور ممتنع ہے۔ مثلاً ایران کی عورتیں پانچ عورتوں کو اپنا مجتہد سمجھتی ہیں۔ جن کے اختیار میں راہوں کی مہم ہوتی ہے۔ اول بی بی شاہ زمینت، دوسری کلثوم ننہ، تیسرے خالہ جان آغا، چوتھے باجی یاسمین، پانچویں دوہ بزم آرا۔ یہ موضوع ختم ہوا۔

بنڈی اور دوسرے الفاظ کی تشریح

اب یہ جاننا چاہیئے کہ بنڈی ایک لباس ہے جو دکن اور اس کے اطراف کے لئے مخصوص ہے۔ دوسری جگہوں پر یہیں سے گیا ہے۔ اور یہ ولایتی اچکن کی طرح زانو ڈھکنے کے لئے ہے۔ ہنڈلی تک نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے دامن کا گھیر بڑا ہوتا ہے۔ پھری، سپر کی طرح ایک چیز ہوتی ہے، جسے باریک رسّی اور لکڑی سے بنایا جاتا ہے۔ پٹہ لوہے کی ایک چیز ہوتی ہے۔ دودھاری سیدھی تلوار کی طرح اُسے چلانے والا ہاتھی کی سونڈ کی طرح ہر طرف ہلاتا ہے۔ بلکہ عجب نہیں اس کا خیال ہاتھی کے سونڈ ہی سے ماخوذ ہو۔ خلیفہ نائب استاد کو کہتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ ان نااہلوں کی اصطلاح میں حضرت علی کا خلیفہ مراد ہو۔ "ہے دوست" ایک نعرہ ہے جسے اراذل اور فرومایہ لوگ عاشورے کے دن لکڑی کے تعزیئے کے آگے اچھلتے کودتے وقت لگاتے ہیں۔ بدھی، ڈورے کی طرح ریشم کی بٹی ہوئی چیز ہوتی ہے۔ یہ بازار میں بکتی ہے۔ اسے لوگ خرید کر شاہ مدار کے عرس کے دن بچوں کے گلے میں ڈالتے ہیں۔ بیٹھک، ایک مقررہ مدت تک بیٹھنے کے معنی ہوتے ہیں۔ اور برادری اور پڑوس کی عورتوں کا تمام رات اس عورت کے ارد گرد بیٹھنا جس میں چودہ عورت و مرد میں سے کوئی حلول کر گیا ہو۔ اصطلاحی معنی ہوتے ہیں۔

باب ہفتم

بعض عجیب وغریب باتوں کا بیان

بعض ہندو فقیروں کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ غسل کر کے کسی امیر کی مجلس میں آتے ہیں اور کوئی (منتر) پڑھ کر چھت کی طرف دیکھتے ہیں تو چھت سے خود بخود فصلی اور غیر فصلی ولایتی اور ہندی خشک اور تر میوے اور قسم قسم کی مٹھائیاں گرنے لگتی ہیں۔ اور کبھی کبھی بعضے روپیہ اور اشرفی اور جواہر بھی خالی فرش کے نیچے سے نکال لیتے ہیں۔ بعضے ایسے ہیں کہ جو کوئی کسی چیز کی فرمائش کرے اپنے دامن کے نیچے سے نکال کر دے دیتے ہیں۔ بالفرض اگر وہ شیر کا بچہ بھی طلب کرے تو وہ بھی نکال دیتے ہیں۔ میں نے ایک ہندو برہمن کو دیکھا کہ اس نے اپنی زنار پر ہاتھ ڈالا اور چند تازہ کھجوریں اور مصری کی ڈلیاں برآمد کر دیں حالانکہ ہزار آدمی دیکھ رہے تھے کہ زنار میں گرہ تک نہ تھی جس میں ان چیزوں کے ہونے کا احتمال ہوتا۔ اور ایسے ہی یہ کیا کہ ایک مٹی کا ڈھیلا اٹھا کر اس کے دو ٹکڑے کئے تو اس میں سے اشرفی برآمد ہوئی۔ یہ تو وہ باتیں ہیں جو آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ یاروں کا کہنا ہے کہ لکھنؤ میں یہ لوگ دریا میں

غوطہ لگاتے ہیں تو کلکتہ میں سر نکالتے ہیں۔ اور اگر کسی دوست کے لئے خط لکھ کر ان کے ہاتھ میں دے دیا جائے، چاہے وہ دوست یہاں سے دو مہینے کے فاصلے پر رہتا ہو، دو گھنٹے کے بعد مکتوب الیہ کی مہر کے ساتھ جواب لکھا ہوا منگوا لیتے ہیں۔ بنارس کے بعض برہمن اگرچہ گدائی سے روٹی پیدا کرتے ہیں لیکن حال اُن کا یہ ہے کہ جب کسی کا ہاتھ لے کر لکیریں دیکھنا شروع کرتے ہیں تو اس شخص کا نام معلوم کر لیتے ہیں۔ ایک دن ایک برہمن میرے گھر میں وارد ہوا اور راقم الحروف کا ہاتھ دیکھ کر نیز دوسرے لوگ جو اس وقت موجود تھے، ان کے ہاتھ دیکھ کر ہر ایک کا نام بتا دیا۔ یاروں نے گمان کیا، اس نے بطور خود کسی سے پوچھ لیا ہوگا اور اب اُسے اپنی کرامت بنا کر پیش کر رہا ہے۔ لیکن یہ گمان بالکل غلط تھا۔ کیوں کہ وہ مجمع میں ہم لوگوں کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ جو اچانک مرزا یوسف بیگ چلچلاتی دھوپ میں آ پہنچے۔ وہ انگریزی، پرتگیزی اور فرانسیسی میں پوری مہارت رکھتے تھے۔ اس برہمن نے یاروں کے کہنے پر پہلے تو مرزا کا ہاتھ دیکھا، پھر خدمتگار اور سائیس کے ہاتھ دیکھے۔ بعد ازاں ہر ایک کا نام اہل جلسہ کو بتا دیا۔ پھر بھی احباب نے یقین نہ کیا اور ایک عورت کو بلوایا جو اس برہمن کے آنے سے دو روز پہلے شاہ جہاں آباد سے اپنی لڑکی دیکھنے آئی تھی۔ یہ لڑکی شہر کے عمائد میں سے کسی کے بچے کو دودھ پلانے پر نوکر تھی۔ اس برہمن نے مذکورہ عورت کا ہاتھ دیکھتے ہی اس کا نام بتا دیا۔

بھوندو شاہ اس کے علاوہ ایک فقیر تھا جس کا نام بھوندو شاہ تھا۔ یہ اپنی عمر ایک سو بانوے سال بتاتا تھا اور اس بڑھاپے کے باوجود چار سیر کھانا کھا لیتا تھا۔ اور بیس کوس چلنا بھی اس کے لئے تھکن کا باعث نہ

ہوتا تھا۔ بدن کی فربہی کا یہ عالم تھا کہ بھینسے کی طرح پلا پڑا اٹھا اور ولایتی مینڈھے کی سی کاٹھی تھی۔ ابتدا میں تو لوگ اس کی اتنی عمر کے منکر رہے۔ ایک روز حکیم سید محمد نے اسے کھانے پر بلایا اور اپنی پالکی کے کہاروں میں سے ایک کو بازار بھیجا تاکہ اس کے لئے کچھ لائے۔ چونکہ حکیم موصوف کی حویلی میں حرم سرا کے سوا اور مردانہ مکان نہ تھا، اس لئے مناسب یہی سمجھا کہ عورتیں چھت پر چلی جائیں اور یہ فقیر نیز جو لوگ اس سے ملنے کے مشتاق ہیں وہ اندر زنان خانے میں بیٹھ کر بات چیت کریں۔ اس لئے جتنی دیر میں مکان خالی ہو وہ دروازے کے باہر ایک "تخنے" پر ٹھہرا رہا۔ جہاں اَبّو نامی دربان سوتا تھا۔ راقم الحروف بھی اس کے ساتھ تھا۔ حکیم صاحب کے دربان اَبّو کی عمر ایک سو تین سال کی تھی۔ ایک دو لوگ اور بھی دروازہ کی حفاظت کے لئے اس تخت پر سوتے تھے۔ مختصر یہ کہ جب وہ فقیر اس تخت پر بیٹھ گیا تو اپنی عادت کے مطابق ہر شخص سے اس کا نام ونسب اور وطن وغیرہ پوچھنے لگا۔ اَبّو سے بھی سوال کیا کہ تم کیا کرتے ہو اور کہاں رہتے ہو۔ وہ ہر چند بوڑھا ہو گیا تھا لیکن اس کے حواس بالکل درست تھے اس نے کہا میں پچاس سال سے حکیم صاحب کے نانا کا نوکر ہوں۔ اب ان کے سائے میں پڑا ہوں۔ خدا ان کی عمر میں برکت دے۔ انھوں نے اس بڑھاپے میں مجھے سہارا دیا ہے۔ روزانہ خشکہ اور شوربا یا دودھ چاول یا گھی شکر اور چاول مجھے کھلاتے ہیں اور کام کچھ نہیں لیتے۔ میں رہنے والا اورنگ آباد دکن کا ہوں۔ مرزا عبد الکریم میرے نانا تھے جو فلاں محلے کے رئیس تھے۔ مرزا عبد الکریم کا نام سنتے ہی فقیر نے کہا کہ تمہاری ماں کا نام عزت تھا۔ اَبّو نے کہا ہاں۔ فقیر نے پوچھا کہ عزت زندہ ہے یا مر گئی۔ اَبّو نے

جواب دیا، اُسے مرے ہوئے پچاس سال یا اس سے کچھ کم ہوئے ہوں گے۔ اس کے بعد فقیر نے میری طرف مخاطب ہو کر کہا کہ عزّت میری گود میں کھیلتی تھی اور عزّت کے باپ کا عجیب ناک نقشہ تھا جو دیکھتا تھا وارفتہ ہو جاتا تھا۔ لیکن اس کا باپ اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ بازار جائے ہاں، میرے ساتھ وہ چلا جاتا تھا۔ میں مسلح ہو کر اسے اپنے ساتھ لے جاتا تھا جب لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ عبدالکریم اپنے چچا کے ساتھ باہر نکلتا ہے تو کسی کی جرأت نہ ہوتی تھی جو اسے ٹیڑھی نگاہ سے دیکھ لے۔ راقم الحروف اور اس فقیر کی یہ گفتگو ختم ہوئی۔ اس کے بعد ہم حرم سرا میں آ گئے۔ یہ بات چیت بھی اس کی اتنی طویل عمر کا ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ بھی ایک کمال اور تھا۔ وہ یہ کہ عالی نسب، بلند حسب یا رذیل اور بازاری لوگوں سے ان کے باپ اور دادی کا نام نیز ان کے آبا و اجداد کا وطن پوچھ کر، ان کا نسب اکیس ملکہ اس سے بھی زیادہ پشتوں تک بتا دیتا تھا اور اس میں کبھی اس سے غلطی نہیں ہوتی بعض بزرگوں کا گمان یہ تھا کہ یہ بات اس کی اتنی طویل عمر کے باعث ہے۔ چوں کہ سیاحی بہت کی ہے اس لئے ہر چھوٹے بڑے کے حال سے واقف ہے۔ لیکن یہ گمان صحیح نہیں۔ کیوں کہ اگر ایک شخص ہزار سال بھی جیئے تب بھی یہ ممکن نہیں کہ نوع انسانی کے تمام افراد سے جدا جدا واقفیت رکھتا ہو۔ اس کے سوا کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ کوئی ایسا علم جانتا تھا جس کے ذریعے لوگوں کا حال دریافت کر لیتا تھا۔ بہر حال خدا ہی جانے کہ یہ کیا اسرار تھا۔ راقم الحروف تو اس کمال کے باوجود جو وہ رکھتا تھا، اس سے اس کے تمام مریدوں سمیت ملعون سمجھتا ہے۔

اور ایک شخص ہندو جوگیوں میں سے دریا کے کنارے رہتا تھا۔ ایک دن

میں سیر کرتا ہوا اس کے تکیے میں پہنچ گیا جسے ہندوؤں کی اصطلاح میں، "دھرم شالا" کہتے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد فقیر نے شکر کے بنے ہوئے پانچ بتاشے مجھے دئے۔ میں نے لینے سے انکار تو نہ کیا۔ لے کر اپنے نوکر کو دے دیے۔ فقیر نے مجھے دو بتاشے اور دیے کہ یہ تمہارے نوکر دں کا حق ہے۔ پہلے والے بتاشے اپنے لئے محفوظ رکھو۔ یہ آج رات کو کام آئیں گے۔ اُس روز اتفاق ایسا ہوا کہ ایک الجھن پیش آجانے کی وجہ سے عصر کے وقت تک مجھے کھانا نصیب نہ ہوا تھا۔ ارادہ یہ تھا کہ آج شام کو ذرا سویرے ہی گھر جاکر کھانے سے فارغ ہو جانا چاہیئے۔ یہ سوچ کر دو گھڑی دن رہے گھر کی طرف چل دیا۔ راستے میں کسی ہندو کا باغ پڑتا تھا۔ جی میں آئی کہ تھوڑی دیر اس باغ ہی کی سیر کی جائے۔ اس میں دن بھی ڈھل جائے گا۔ یہ سوچ کر باغ میں داخل ہوا۔ ابھی پھلواریوں کی سیر ہی کر رہا تھا کہ اچانک سیاہ بادل نمودار ہوا اور اتنی تاریکی پھیل گئی کہ سوجھنا بند ہو گیا۔ بجلی چمکتی تھی تو کچھ نظر آجاتا تھا۔ کچھ دیر کے بعد بادل کی گرج، بجلی کی کڑک اور دھواں دھار بارش کا تار بندھ گیا۔ میں گرتا پڑتا باغ کے دروازے تک آگیا جس پر چھت پڑی ہوئی تھی اور منتظر رہا کہ بارش ذرا کم ہو اور اندھیاری کچھ چھٹے تو گھر کا راستہ لوں۔ لیکن بادل نے تو گویا قسم کھا رکھی تھی کہ آدھی رات تک مردم آزاری سے باز نہ آئے گا۔ ہر لمحہ بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک بڑھتی ہی جاتی تھی۔ ایک گھنٹے تک تو میں جھیلتا رہا۔ اس کے بعد بھوک نے بے قابو کر دیا اور میں بے تاب ہو گیا۔ بھوک اتنی شدید تھی کہ اگر درخت کے پتے بھی مل جاتے تو کھا لیتا۔ چناں چہ مجبوراً میں نے نوکر سے کہا کہ کسی طرح انار کے درخت تک جاکر کچھ کچے انار ہی لے آئے تاکہ پیٹ کی آگ بجھا سکوں۔ نوکر ہنسا اور کہا کہ

آپ تو بالکل بھول گئے، کھانڈ کے بتاشے جو فقیر نے دیے تھے، میری کمر میں بندھے ہوئے ہیں۔ یہ کھا لیجئے۔ بلکہ دو بتاشے جو فقیر نے میرے لئے دئے تھے وہ بھی رکھے ہیں۔ میں نے کہا شاباش! جلدی نکالو۔ بہر حال ان بتاشوں میں سے چار میں نے کھائے اور دو اس لڑکے کو دئے۔ انھیں کھا کر بڑی فرحت ہوئی اور گویا جان میں جان آگئی۔ آدھی رات کے بعد جب بادل چھٹے تو بجلی کی چمک سے راستہ دیکھتا ہوا اپنے گھر تک پہنچا۔ اب نیند غالب تھی اور بھوکا تھا نہیں اس لئے بغیر کچھ کھائے سو گیا۔ صبح کو اٹھا تو اس فقیر کی وہ بات یاد کر کے سخت حیرت میں تھا جو اس نے نوکر کو بتاشے دیتے وقت کہی تھی کہ انھیں تم اپنے لئے محفوظ رکھو، کام آئیں گے۔ بہر حال چوں کہ اس کا تکیہ دریا کے کنارے ہی تھا اور وہاں تک جانا بھی لطف سے خالی نہ تھا، کبھی تنہا، اور کبھی اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں جاتا تھا۔ ایک دن ایک عزیز کے ساتھ دریا کی سیر کرنے گیا۔ جب سورج بلند ہو گیا تو ہم دونوں تکیہ پر وارد ہوئے اور فقیر کے پاس بیٹھے رہے؛ یہاں تک کہ بات چیت چھڑی۔ اسی اثنا میں ایک شخص چھوٹی ڈلیا تازہ کھجوروں سے بھری ہوئی فقیر کے سامنے لایا۔ اسی وقت میرے دل میں یہ وسوسہ گذرا کہ اگر یہ شخص پوری ڈلیا مجھی کو دے دے تو کتنا اچھا ہو، آدھی میں اپنے ساتھی کو دیدوں گا۔ اور آدھی اپنے کام میں لاؤں گا لیکن یہ بات ممکن نہیں ہے کیوں کہ آخر مجھی میں کون سا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے۔ یہاں دس آدمی ہم جیسے بلکہ ہم سے بہتر بیٹھے ہیں۔ وہ سب کو محروم کر کے ساری ڈلیا ہمیں کیوں دینے لگا۔ میں اسی خیال میں تھا۔ جو ٹوکری اس کے سامنے رکھی گئی تو فقیر اس شخص سے جو ہدیہ لایا تھا

کہنے لگا کہ مجھے کیوں دیتے ہو، یہ کھجور شوق سے کھاتے ہیں، انھیں دو، اور میری طرف اشارہ کیا۔ اس شخص نے عرض کیا کہ میں تو جناب والا کے لئے لایا ہوں۔ اب آپ مختار ہیں۔ کہنے لگا تمہیں تکرار کرنے کی کیا ضرورت ہے جو ہم کہتے ہیں، وہ کرو۔ اُس شخص نے ڈلیا فقیر کے سامنے سے اٹھا کر میرے آگے رکھ دی۔ میں نے اپنے گھر آدمی دوڑا کر ایک طباق منگوایا اور اس ڈلیا میں سے کھجوریں طباق میں لوٹ کر اپنے گھر بھجوا دیں۔ تھوڑی دیر کے بعد فقیر کسی کام سے اٹھا اور اپنے خاص حجرے میں گیا ہم بھی رخصت ہو کر چلے آئے اور گھر پہنچ کر اس ہدیے کے دو حصے کیے ایک حصہ تو اسی دوست کو دیا اور دوسرا حصہ خود رکھ لیا۔

ایک اور ہندو تھا جو اپنی چادر زمین پر بچھاتا تھا اور اس کے نیچے سے روپے پیسے اور اس کے علاوہ طرح طرح کے خشک و تر اور فصلی اور غیر فصلی میوے یا چرند پرند، جو کچھ بھی کوئی مطالبہ کرے وہی برآمد کر لیتا تھا میں نے بھی اُسے دیکھا تھا۔ کالا کلوٹا آدمی تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اپنی کایا بدل لیتا تھا۔ صحیح حال تو خدا ہی جانے لیکن تواتر سے سنا گیا ہے کہ ایک دن وہ مردِ عاجز گل نوجوانی کی تلاش میں نکلا جس سے وہ اپنا کوئی مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا اور اس محلے میں پہنچا جہاں پہلے راقم الحروف رہتا تھا۔ لیکن چوں کہ کسی سے جان پہچان نہیں تھی، اور نیاز مند بھی اُسے اکثر نہیں پہچان پاتا تھا، لیکن اس کا نام کان میں پڑا ہوا تھا۔ ایک عزیز نے مجھے بتایا کہ یہ فلاں شخص ہے۔ راقم الحروف نے اپنی تماشا پسند طبیعت کے تقاضے پر اسے اپنے پاس بلایا۔ وہ بھی چونکہ اس محلے میں اجنبیوں کی طرح آتا جاتا تھا، اس نے میری دعوت کو غنیمت

سمجھا اور فقیر کے پاس آیا۔ کچھ دیر بعد جب بات چیت شروع ہوئی تو میں نے اس سے فرمائش کی کہ کچھ شعبدہ دکھائے۔ چوں کہ دن چھپنے لگا تھا اور وہ اپنے آقا کے خوف سے یہ نہیں چاہتا تھا کہ حصول مدعا کے بغیر گھر کو واپس ہو، اس رنج کی وجہ سے جو اُسے مدعا حاصل نہ ہونے کی وجہ سے تھا، اس نے بس اتنا ہی کیا کہ ایک خالی چادر زمین پر پھیلائی اور چار سو روپے کے سکّے چادر کے نیچے سے نکال لئے۔ پھر اسی چادر کے نیچے غائب کر دیے۔ پھر وہ خالی چادر زمین پر سے اٹھالی اور اسے تین بار جھٹکا دیا اور اپنی کمر میں باندھ لیا اور چلا گیا۔

اور ایک بزرگ بیان کرتے تھے کہ میں سفر میں عالی جناب اشرف الوزراء، یمین الدولہ ناظم الملک نواب سعادت علی خاں بہادر مبارز جنگ بہادر کے قصبہ محمدی کے جنگل میں جا رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ مذکورہ ہندو ایک ہاتھی پر چڑھا بیٹھا ہے۔ میں بھی ہاتھی پر سوار تھا جیسے ہی اس نے مجھے دیکھا اپنا ہاتھی میرے ہاتھی کے پاس لایا اور کہا یہ لیجئے قبلہ! اتنا کہہ کر آخ تھو کیا اور منہ سے تھوک نکال کر میرے ہودج پر پھینکا۔ وہ تھوک جب تک اس کے منہ میں تھا، سفید تھا، مگر جب ہودج پر آ کر گرا تو روپیہ بن گیا۔ پھر اُس نے وہ روپیہ اٹھا لیا اور دوبارہ اپنے منہ میں رکھ کر نگل گیا۔ پھر میرے پٹکے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کلہ پوتی میرے کمر سے کھینچ کر اپنے ہاتھ میں چھپالی۔

ایک دن ایک امیر بیان کرتے تھے کہ ایک سفر میں میرا خیمہ دریا کے کنارے تھا۔ عصر کے وقت دریا کا تماشا دیکھنے میں مشغول تھا کہ مذکورہ ہندو وارد ہوا۔ اسی وقت ایک ہندو جوہری بھی آیا اور اس نے سو نے

کی ایک انگوٹھی جس میں زمرد رکھا ہوا تھا مجھے دی ...... کہ اگر پسند آئے تو اس کی قیمت تین سو روپے قرار پائی ہے۔ میں انگوٹھی دیکھ کر بہت خوش ہوا اور مہاجن سے کہا کہ انگوٹھی تو اچھی ہے، لیکن دام ٹھیک بتاؤ۔ اس نے کہا کہ قیمت تو کسی طرح کم نہیں ہوسکتی۔ اسی اثنار میں اس بازی گر ہندو نے نگینہ دیکھنے کے بہانے وہ انگوٹھی میرے ہاتھ سے لے لی اور دریا میں پھینک دی۔ مہاجن بہت جھنجھلایا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا تجھے اس سے کیا مطلب۔ تو مجھ سے اپنی انگوٹھی لے لینا یا اس کی قیمت تجھے مل جائے گی۔ میں نے مہاجن سے تو یہ کہہ دیا لیکن دل میں یہی خیال تھا کہ اس ہندو بازی گر سے جب تک قیمت نہ وصول کرلوں اسے نہیں جانے دوں گا بہرحال جب وہ ایک گھنٹے بعد اپنے گھر جانے کے لئے اٹھنے لگا تو میں نے کہا کہ یا تو انگوٹھی دیتے جاؤ ورنہ تین سو روپے ڈھیلے کرو۔ کہنے لگا انگوٹھی تمہاری تھوڑی تھی۔ میں اور جوہری نپٹ لیں گے۔ میں نے کہا تو نے انگوٹھی مجھ سے لی تھی یا اس مہاجن سے! اب اگر خیریت چاہتے ہو تو انگوٹھی حوالے کردو۔ جب اس نے دیکھا کہ اب ہنسی کی گل پھنسی ہوجائے گی ...تو بولا! خداوند نعمت مجھے ذلیل سمجھ کر چوری کا الزام لگا رہے ہیں، اور کہتے ہیں کہ تو نے انگوٹھی دریا میں پھینک دی؛ اپنی جیب کا جھاڑا نہیں لیتے۔ جب اس نے یہ کہا تو میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ دیکھا تو انگوٹھی موجود تھی۔

چند سال ہوئے کہ مذکورہ شعبدے باز کا انتقال ہوگیا۔ میں ایک دن مخدومی تاج الدین حسین خاں صاحب اور خان صاحب والا مناقب سبحان علی خاں صاحب کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ ایک ہندو ایک سیاہ فام

عورت کے ساتھ وارد ہوا، اس عورت کی حالت مجنونوں کی سی تھی جس پر زین خاں یا شیخ سدّو آگئے ہوں۔ اس نے سر دھننا شروع کر دیا۔ پھر کھڑی ہوگئی اور مٹھیاں بند کر کے ہاتھ اوپر کو اٹھا دئے اور کہنے لگی "لا" یہ کہہ کر مٹھی کھول کر حاضرین کو ایک اشرفی دکھائی، پھر دوبارہ مٹھی بند کر کے ہاتھ ہوا میں ہلایا اور کہا کہ "لا" جب مٹھی کھولی تو اس بار دو اشرفیاں ہمیں دکھائیں۔ اس کے بعد منہ سے زمین پر تھوکنا شروع کیا۔ تمام حاضرین کے سامنے، جو اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے، تھوک اس کے منہ سے جتنا گرتا تھا، روپیہ ہو جاتا تھا، اور جتنا کف منہ سے جدا نہیں ہوتا تھا وہ بدستور کف ہی رہتا تھا۔ پھر اُس نے ایک بچے کے ہاتھ سے کاغذ لے کر پرزے پرزے کر دیا اور دوسرے بچے کی کمر سے اسی خط اور عبارت کا لکھا ہوا سالم کاغذ برآمد کر کے پہلے بچے کے حوالے کر دیا۔ پھر ایک خدمتگار کے ازار بند کی طرف ہاتھ بڑھایا اور وہاں سے ایک کدو کھینچ لیا۔ پھر ایک اور شخص کے پائنچے میں ہاتھ ڈالکر دوسری قسم کی ترکاریاں برآمد کیں اور خود اپنے منہ سے کئی عدد چھری، چاقو، موچنہ، قینچی، نہنّے، وغیرہ زمین پر بکھیرنے شروع کئے۔ راقم الحروف نے بھی ایک عزیز سے چند شعبدے یاد کر لئے تھے۔ اب ان میں سے بعض یاد نہیں رہے اور بعض ابھی تک یاد ہیں۔ انھیں میں سے ایک یہ ہے کہ چند کوئلے شیشۂ آتشی میں ڈال دیتا ہوں، تاکہ جب آگ میسر نہ آئے تو ان کوئلوں میں سے چند لے کر ہوا دیتا ہوں، یقین ہے کہ وہ بھڑک اٹھیں۔ اسی طرح کچھ اور شعبدے ہیں۔ لیکن بعض شعبدے ایسے ہیں کہ اگر عقلمند آدمی ذرا سا غور کرے تو ان کی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے۔ اور بعض ایسے ہیں کہ اگر

انسان ہزار سال تک پتھر سے سر پھوڑے تو ہرگز عقل کام نہیں کرسکتی۔

نٹ | ایک فرقہ ہے جو نٹ کہلاتا ہے۔ یہ سب ہندو مذہب ہوتے ہیں لیکن اب ان میں سے کچھ لوگ مسلمان بھی ہو گئے ہیں۔ یہ لوگ ہندوستان ہی کے رہنے والے ہیں۔ اب دوسری جگہوں پر بھی یہی فن ان لوگوں سے سیکھ کر کچھ لوگ دار باز کے نام سے موسوم ہو گئے ہیں۔ ایک دن فرنگی دوستوں میں سے ایک شخص پالکی میں بیٹھا ہوا جارہا تھا کہ ایک دار باز دائیں طرف سے اور ایک بائیں طرف سے ظاہر ہوا اور زمین سے بلند ہو کر پالکی کے اندر سے اِدھر سے اُدھر اس طرح کود کر نکل گیا کہ اس کا بدن پالکی سے نہیں لگا، اور دوسرے ساتھی کی گردن پر جا بیٹھا۔ اگر پالکی ٹھہری ہوئی ہوتی تو اتنی حیرت اور تعجب کا مقام نہ تھا۔ ہرچند اس صورت میں بھی سوائے دار باز کے اور کوئی شخص اِدھر سے اُدھر نہیں پھلانگ سکتا تھا۔ اور کہاروں کے بھاگنے کی حالت میں تو، جب کہ آہستہ چلنا ان کی موت کے مترادف ہے، ایسا شعبدہ صوفیوں کے خوارقِ عادات سے کم نہیں ہے یا جادوگر ایسا کر سکتے ہیں۔

جرہ باشہ | معلوم ہونا چاہیئے کہ ہندوستان میں ایک جماعت ہے جو جرہ باشہ کہلاتی ہے۔ یہ لوگ پنجاب میں حسن ابدال کے علاقے میں رہتے ہیں۔ یہ رہنے والے تو اسی علاقے کے ہیں لیکن اب ہندوستان کے بڑے شہروں میں، جہاں امیروں اور اربابِ کمال کا مجمع ہو، یہ لوگ بھی مل جاتے ہیں۔ یا یہ کہ دوسری جگہ کم اور حسن ابدال میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ بہرحال ان لوگوں میں سے ایک، کسی امیرزادے یا شریف النسب یا کسی اور کے اشارے پر، انعام لینے کے لالچ میں سڑک پر کھڑا

ہو جاتا ہے اور تماشائی کوٹھوں کے اوپر ہوتے ہیں، در پردہ سب اسی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں لیکن ظاہر میں اپنے آپ کو ایسا بیگانہ بنا لیتے ہیں کہ سوائے چند محرم راز یا آزمودہ کار جن کو جرہ باشہ کی اصطلاح میں داغی کہا جاتا ہے، اور کوئی شخص حقیقت حال سے واقف نہیں ہو پاتا۔ پھر وہ راہگیروں کی طرف غور سے دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر کوئی گانوں والا مسافر یا شہر کے ہندوؤں میں سے کوئی شخص، یا کوئی بازاری شخص خواہ وہ پیادہ ہو یا پالکی نشین، اسے تاک کر ان میں سے ایک آدمی اس کے پاس جاتا ہے اور اس کا بشرہ دیکھ بھال کر اپنا احوال بیان کرنا شروع کرتا ہے جو بالکل بے بنیاد اور من گھڑت ہوتا ہے، مثلاً یہ کہ کسی سے کہے گا۔ میں سال بھر یا دو سال یا چھ ماہ پہلے فلاں شخص کا مصاحب تھا۔ اور فلاں سفر میں، ایک صبح کو دریا کے کنارے جا رہا تھا، اچانک ایک باؤلا گیدڑ میرے پیچھے آیا اور اس نے میرے پیر میں دانت گاڑ دیئے اور بھاگ گیا۔ میں اسی وقت سے دیوانہ ہو گیا۔ اور رنگ برنگے جھاگ میرے منہ سے نکلنے لگے اور باؤلوں کی طرح چاروں طرف دوڑنے لگا اور جو شخص ملتا تھا اس پر حملہ کر بیٹھتا تھا اور کاٹ کھاتا تھا۔ میرے کاٹتے ہی اس کی کھوپڑی تڑخ جاتی تھی اور وہ مر جاتا تھا تین دن تک بھوکا پیاسا اس جنگل کی سیر کرتا رہا آخر چند لوگ میرے آقا کے حکم سے وہاں آئے اور جب انھوں نے میرا یہ حال دیکھا تو بھالوں اور تلواروں کی مدد سے مجھے گرفتار کیا اور رسیاں منگوا کر میرے ہاتھ پیر مضبوطی سے باندھ دیئے اور آقا کے سامنے مجھے پہنچا دیا۔ آقا نے سب کو منع کر دیا کہ نہ میرے پاس پھٹکیں نہ مجھ سے بات کریں۔ لہذا عزیزوں میں سے کوئی میرے پاس نہیں آتا تھا۔

اور مجھے دور ہی سے پانی اور کھانا دے جاتا تھا۔ اور کوچ کے دن میرا منہ رسّی سے باندھ کر مجھے بہلی میں سوار کرتے تھے۔ یہاں تک کہ سفر کا زمانہ ختم ہوا۔ میں اپنے شہر میں آیا۔ یہاں میرا باپ یہ حال دیکھ کر مجھے گھر لایا اور اپنی حیثیت کے مطابق میرے علاج میں صدہا روپیہ صرف کیا۔ رفتہ رفتہ اللہ کی عنایت اور بزرگوں کی توجہِ باطنی سے مجھے صحت نصیب ہوگئی۔ اب وہ پہلی سی حالت تو نہیں لیکن اتنا ہے کہ ہر مہینے کے پہلے دو تین دنوں میں پھر وہی حالت ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ بھی ایسا ہے کہ دن رات میں دو گھڑی دن چڑھے سے لے کر ایک گھڑی رات رہے تک اور پھر اگلے دن چاشت کے وقت تک، اس عرصے میں اس مصیبت سے دوچار رہتا ہوں۔ اگر آپ کے علم میں کوئی مجرّب دوا ہو تو خدا کیلئے بتایئے تاکہ میں اس بلا سے نجات پاؤں اور آپ کو ثواب عظیم ملے۔ اتنا کہہ کر وہ منہ سے رنگ برنگے جھاگ نکالنے لگتا ہے۔ اور آنکھیں پھاڑ کر چند قدم پیچھے ہٹ کر اس کی طرف دوڑتا ہے۔ اگر اس شخص نے پہلے سے یہ ماجرا دیکھا ہوا ہے تو وہ البتہ کھڑا رہے گا اور جرٲت سے داغی کہہ کر دوسری طرف دوڑنا شروع کر دے گا۔ لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ اکثر یہی ہوتا ہے کہ تھرتھراتے ہوئے بدن کے ساتھ وہ بھاگنے لگتا ہے اور اپنی جان بچانے کے لئے کسی شخص کے گھر میں جو سرِ راہ مل جائے، بے کھٹکے حرم سرا میں گھس جاتا ہے، چاہے وہ کسی امیر ہی کا گھر کیوں نہ ہو۔ پردے کی بات سُنے بغیر اندر گھس پڑے گا۔ اگر وہ حاجبوں کے پلّے پڑ گیا تو وہ ہنس کر چھوڑ دیتے ہیں ورنہ وہ بے محابا اندر گھس جاتا ہے اور عورتیں بھاگنے لگتی ہیں۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ خوف کے مارے اپنا سر کسی

پرنالے میں اڑا دیتا ہے یا کسی کنوئیں میں گر پڑتا ہے۔ لیکن جرہ قصداً ایسی تنگ جگہ پر جہاں بھاگنے کا راستہ نہ ہو قدم اٹھانے میں ذرا سستی کرتا ہے یا زمین پر لوٹ جاتا ہے تاکہ خائف کو بھاگنے کا موقع ملے۔ بعض لوگ جو بہادر اور رجبوٹ ہوتے ہیں، اور رستم دستاں سے مقابلہ کرتے ہیں۔ جرے کے سامنے حواس باختہ ہو کر اس طرح بھاگتے ہیں کہ اگر اُن کے پیر کسی مضبوط رسّی سے باندھ دئے جائیں اور وہ رسّی کسی کھونٹے سے باندھ دیں تو اس کا امکان ہے کہ وہ رسی کو مع کھونٹے کے تڑا کر ہوا سے باتیں کرنے لگیں گے۔ پھر یہ ہوتا ہے کہ ایک آدمی کے بھاگنے سے دوسرے راہ گیر بھی بے حواسی میں بھونچکے ہو کر بھاگنے لگتے ہیں۔ بعض رئیس لوگ بھی جو کسی قصبے کے رہنے والے ہوں یا ہندو ہوں، پالکی سے چھلانگ لگا کر بھاگ جاتے ہیں اور یہ تماشا دیکھنے والوں کو جرہ کی ذرا سی حرکت سے نصیب ہو جاتا ہے۔

اس کے سوا اُن کی اور حرکتیں یہ ہیں کہ بعض جرے کسی رہگیر کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اُس کے کان میں کوئی بات کہتے ہیں جسے سن کر وہ کپڑے اتار ڈالتا ہے اور ننگا ہو جاتا ہے۔ پھر اُسے جرہ حکم دیتا ہے کہ گھوڑا بن کر چل۔ پھر اس کی پیٹھ پر زین رکھ دیتا ہے اور جب اِن کاموں سے نمٹ جاتا ہے تو پھر اشارہ کرتا ہے کہ کپڑے پہن لے اور اپنا راستہ لے۔ اور نواب اشرف الوزراء، دام اقبالہ کے بڑے بھائی نواب آصف الدولہ وزیر اعظم کے عہد میں جروں نے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں یعنی پوری پوری پلٹن کو بھگا دیا ہے۔ اِسی گروہ کا ایک آدمی رجب علی نامی تھا۔ وہ راستے میں کھڑا ہو جاتا تھا اور جو شخص سامنے پڑ جاتا تھا اس کے منہ پر نالے

کی کیچڑ مارتا تھا۔ پھر اس شخص کے ساتھ کھڑے ہو کر کسی بام کی طرف دیکھتا تھا اور کسی غیر شخص کو مخاطب کر کے گالیاں دینا شروع کر دیتا تھا۔ بعدازیں اس شخص کی طرف مخاطب ہو کر اس سے اظہارِ ہمدردی کرنے لگتا تھا اور اسی اظہارِ ہمدردی کے درمیان میں اس کے سر پر کس کر ایک جوتا مارتا تھا جس کی آواز تماشائیوں کے کانوں تک پہونچتی تھی اور پھر پہلے سے زیادہ غضبناک ہو کر اسی شخص کو خوب ستھری ہوئی گالیاں دینے لگتا تھا۔ پھر اس کے سر سے پگڑی اتار کر، جوتے کی چوٹ سے پڑے ہوئے گومڑے کو انگلیوں سے دھیرے دھیرے سہلانے لگتا تھا۔ اور اسی حالت میں ایک اور جوتا اس کے سر پر رسید کرتا تھا اور پھر گالیاں دینے لگتا تھا۔ کون ہے بے؟ کیا مطلب ہے؟ یہ کہتا ہوا کسی خیالی شخص کے پیچھے، جس کا کوئی وجود نہیں ہوتا تھا، مصلحتاً چند قدم دوڑتا اور پھر واپس آ کر اس بیچارے کو کسی دیوار کے نیچے لے جا کر پھر تابڑ توڑ اس کے سر پر جوتے جماتا تھا۔ اس شخص کو یہ گمان بھی نہیں ہوتا تھا کہ یہی حرامزادہ اس کے سر پر جوتے مار رہا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو آدمیوں کے کان میں کوئی بات کہہ دی۔ وہ لوگ اپنے کپڑے اتار کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور "جرہ" کے اشارے پر دونوں اپنے ہاتھوں میں جوتے لے لیتے ہیں اور تابڑ توڑ ایک دوسرے کے سر اور منہ پر مارنے لگتے ہیں لیکن یہ سحر و افسوں صرف پیدل چلنے والوں ہی کے ساتھ عمل میں نہیں آتا بلکہ سواروں کو بھی گھوڑے سے نیچے اتار لیتا ہے اور گھوڑے پر بیٹھے ہوئے بھی اس کے منھ پر کیچڑ اور سر پر جوتا مارتا ہے۔ اس فن میں میر رستم علی اپنے معاصرین کی نظر میں محسود تھا اور اپنے عصر کے باشندوں کا جگت گرو بھی تھا۔ اس کا ایک کمترین شاگرد دو ہزار تلنگوں اور پانچ سو سواروں کو مار بھگانے کے لیے کافی تھا۔ اس سے دلچسپ بات تو یہ ہے کہ ایک مجلس میں حاضرین کے سامنے وہ یہ حکایت بیان کر رہا تھا کہ "کل میں نے ایک ہندو کو اس طرح بھگایا"۔ اس مجمع کے برخاست ہونے کے بعد انہیں میں سے ایک شخص کو راستہ میں روک کر دوسرا قصہ بیان کرنا شروع کر دیا۔ اور اس انداز سے تقریر کی کہ قصہ کے نصف تک

پہونچے تک وہ شخص تھر تھر کانپنے لگا۔ اور وہ فریاد کرتا ہوا سر پر پیر رکھ کر ایسا بھاگا کہ ایک دیوار سے اس کا سر ٹکرایا اور پھٹ گیا۔

لیکن اس مرحوم نے اپنی وفات سے کچھ ہی برسوں پہلے یہ کام نہ کرنے کی قسم کھالی تھی کیونکہ ایک دن دو افغان ڈر کے مارے کنوئیں میں گر پڑے تھے۔

"جرہ" اور "باشہ" شکاری جانوروں کے نام ہیں۔ چونکہ یہ لوگ بھی شکاری جانوروں کی طرح نئے شکار یعنی احمق شخص کے پیچھے بھاگتے ہیں اس لیے دربارِ سلطانی سے یہ خطاب عطا کر کے ان کی عزت افزائی کی گئی۔

بہروپیہ یہ بھی ایک فرقہ ہے جو بہروپیہ کہلاتا ہے۔ یہ لوگ حسبِ خواہش ہر روپ میں ظاہر ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جانوروں میں سے کسی جانور کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور تماشہ بینوں میں سے کوئی شخص اس کی تمیز نہیں کر سکتا۔ اسی طرح جاہے جس شخص کے لباس میں ظاہر ہو جاتے ہیں۔ چاہے وہ مرد ہو، چاہے وہ عورت ہو، چاہے بوڑھا، چاہے جوان، چاہے کافر، چاہے مسلمان، چاہے خوبصورت، چاہے بدصورت۔ اکثر ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ اس فرقہ کا کوئی بھی شخص کسی کا روپ اختیار کر کے آجاتا ہے اور رات بھر اس کی بیوی کے ساتھ مباشرت کرتا رہتا ہے۔

محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں، جس کی رحلت کو ساٹھ برس سے کچھ زیادہ ہو چکے ہیں، ایک حکیم تھا اور اسے حکیم الملک کا خطاب ملا ہوا تھا۔ اس کے زمانہ میں عنایت نامی ایک مشہور بہروپیہ تھا۔ ایک دن اس بہروپیہ نے حکیم الملک کا حلیہ اختیار کیا اور بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اپنے چہرے پر رنج و ملال کے آثار پیدا کر لیے۔ بادشاہ نے اس رنج و ملال کا سبب دریافت کیا۔ اس بہروپیہ نے عرض کیا کہ میں پچاس سال سے آپکی اور آپ کے بزرگوں کی خدمت کرتا چلا آرہا ہوں اور اس زمانے میں بڑی عزت سے زندگی بسر کرتا رہا ہوں لیکن اب ایسی صورت پیدا ہو گئی ہے کہ عنایت بہروپیہ میرا حلیہ اختیار

کر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ رکھتا ہے۔ حضور کے کرم اور عنایت سے امید کرتا ہوں کہ اس خادم کو عتبات ائمہ علیہم السلام کی زیارت کے لیے رخصت کر دیں تاکہ آخری عمر میں باعزّت اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔ یہ سن کر بادشاہ کو بڑا ہی تیش آیا۔ اس نے حکیم الملک کو تسلی و تشفی دے کر اس کا غصہ ٹھنڈا کیا اور اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ جب عنایت بہروپیہ حکیم الملک کی صورت میں دربار میں حاضر ہونے کی کوشش کرے تو بلا تامّل اس کی خوب مرمّت کریں اور محل سے باہر نکال دیں۔ بہرحال، حاجبوں اور دیگر خادموں کو شاہی حکم ملنے کے بعد حکیم الملک خود امیروں کے دستور کے مطابق جب دربار میں حاضر ہوا تو یاروں نے چاروں طرف سے اُسے گھیر لیا اور زد و کوب کرتے ہوئے دربار سے باہر نکال دیا۔ ان کے خیال میں یہ حکیم الملک بہروپیہ تھا۔ بیچارہ حکیم الملک اس ذلت و خواری کے ساتھ اپنے گھر واپس آیا اور اس نے بادشاہ کی خدمت میں ایک عرضی بھیج کر کربلائے معلیٰ اور نجفِ اشرف جانے کی اجازت مانگی۔ اس عرضی کو پڑھ کر بادشاہ حیرت میں پڑ گیا۔ اور جانچ اور تفتیش کرنے پر جب یہ معلوم ہوا کہ پہلا حکیم الملک جو بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا وہ خود عنایت تھا اور دوسرا حکیم الملک جسے عنایت سمجھ کر مار بھگایا گیا تھا، وہ اصلی حکیم الملک تھا تو بادشاہ اس بات سے بہت شرمندہ ہوا۔ اور معافی کا خواستگار ہوا حکیم الملک کو مناسب انعامات سے سرفراز کیا اور عنایت کو بھی جاگیر عطا کی۔

جس زمانہ میں امیر خاں، صوبہ دار کابل نے رحلت فرمائی تو یہی عنایت اُس کی (امیر خان) بیوی کے مشورہ سے پٹھانوں کو لے کر باقی ماندہ مال و زر کے لانے کے لیے اس وجہ سے کابل گیا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ افغان لوگ اٹک مال و زر کو غارت کر دیں اور لشکر کے سپاہی اپنی تنخواہوں کے لیے شورش برپا کر دیں۔ اس نے مرحوم (امیر خاں) کی صورت اختیار کی، پالکی پر سوار ہوا اور کابل سے اٹک ندی کے اس پار تک تمام مال و اسباب پہونچا دیا؛ اور اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس سفر میں بیچارے امیر خاں کی نعش کو ایک صندوق میں محفوظ کر دیا گیا تھا۔

راقم الحروف کے زمانہ میں ایک مجرم کسی انگریز کی قید میں مقید تھا۔ تین سال تک قیدیوں کی طرح اس مسکین کی گردن پر طوق اور پیروں پر بیڑیاں پڑی رہیں۔ اس کی رہائی کے وقت سے کچھ پہلے ایک بہروپیہ، جو اس کے دوستوں میں سے تھا، عظیم آباد آیا اور اس نے اپنے دوست کو اس حالت میں دیکھا۔ ایک دن چاشت کے بعد اس نے اس انگریز کی صورت اختیار کی اور بے دھڑک قید خانہ میں جاکر اس قیدی کو مع دوسرے سات قیدیوں کے، اس بلا سے نجات دے دی۔ تلنگے اور جاسوس اُسے پہچان نہ سکے اور نہ یہ جان سکے کہ وہ اُن کا آقا نہیں ہے۔

ایک اور دوست کے ہاں لڑکے کی شادی کے سلسلے میں رقص و سرود کی مجلس تھی۔ دورانِ گفتگو میں صاحبِ خانہ کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے کہ کوئی بہروپیہ مجھے ہرگز دھوکا نہیں دے سکتا۔ اتفاق سے اس مجلس میں ایک نوجوان بیٹھا تھا جو پورے چار مہینے ایک بہروپیہ کی شاگردی کر چکا تھا۔ راقم الحروف اس بات کا شاہد ہے کہ وہ نوجوان صاحبِ خانہ کے ان الفاظ کو سن کر رنجیدہ ہو کر مجلس سے اُٹھ کر چلا گیا۔ اور ایک بار تو نواب آصف الدولہ مرحوم کے چوبدار کی صورت میں آکر ظاہر ہوا اور صاحبِ خانہ سے انعام حاصل کیا اور واپس چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک باغبان کی صورت میں وارد ہوا اور پھولوں کے دستے صاحبِ خانہ کی خدمت میں پیش کیے اور کچھ انعام و اکرام لے کر پھر واپس چلا گیا۔ ابھی زیادہ وقت بھی نہ گذرا تھا کہ وہ پھر ایک سبزی فروش کی بیوی بن کر آیا۔ اس بار بھی لوگ اُسے پہچان نہ سکے۔ اور وہ کبھی اپنے جسم کے بائیں نصف دھڑ کو، چہرہ سے پیروں تک، ایک نوجوان پری طلعت عورت کی صورت میں اور دوسرے نصف کو دائیں جانب ایک لمبی داڑھی والے درویش کے قالب میں بدل لیتا تھا۔ مرد کے لیے بائیں اور عورت کے لیے دائیں جانب کی یہ قید صرف اسی مقام کے لیے مخصوص ہے ورنہ یہ لازم نہیں ہے کہ بائیں جانب سے عورت اور دائیں جانب سے مرد ہی بنے۔ بہروپیہ اس بات پر پوری قدرت رکھتا ہے کہ چاہے دائیں جانب سے مرد کی صورت میں ظاہر ہو اور بائیں جانب سے عورت کی شکل میں اور چاہے تو اس کے برعکس صورت بھی اختیار کرے۔